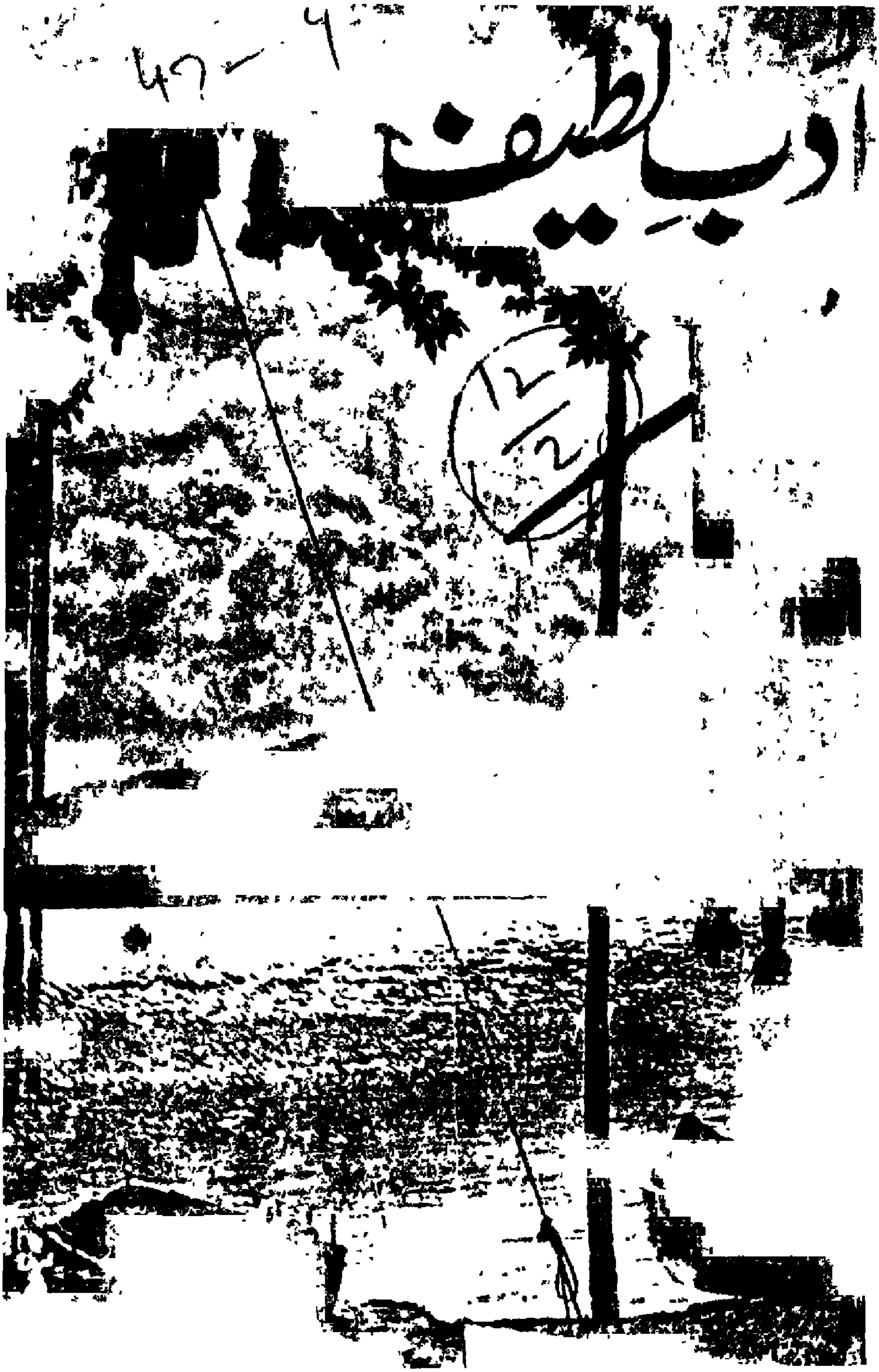

ادب لطیف

جنگ نامۂ اسلام

اسلامی تاریخ منظوم صورت میں

ملک

منظور حسین منظور

کا

ایک عہد آفریں کارنامہ

تین حصوں میں

فی جلد تین روپے پچاس پیسے

☆

پنجاب بک ڈپو ☆ لاہور

جلد ۱۴ شمارہ ۱ فون نمبر [illegible]

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۲۵۰۶/۵ مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء و ۲۷۷۶۷۹ مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۴ء ـــــ بموجب سرکلر نمبر ۱۰ مورخہ ۲۲ اپریل

بانی: چودھری برکت علی مرحوم

ماہنامہ

ادب لطیف

لاہور

اپریل سنہ ۱۹۶۱ء

مینجنگ ایڈیٹر:
افتخار علی چودھری

مرتب:
میرزا ادیب

فی پرچہ
۷۵ پیسے

زرِ سالانہ: ۱۰ روپے

غیر ممالک میں: ۱۲ روپے

مکتبہ ادبِ لطیف لاہور

افتخار علی چودھری ناشر نے اردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ادبِ لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

پیرایۂ آغاز

اس شمارے میں پھر ایک نیا نام نظر آ رہا ہے —— یہ نام ابوالاعجاز صدیقی کا ہے جو ہماری محفل میں ایک مقالے کے ساتھ آئے ہیں! حفیظ صدیقی نے انگریزی کے دو ممتاز شاعروں رابرٹ براؤننگ اور شیلی اور فارسی کے زندہ جاوید شاعر حافظ کی شعری رفاقت میں فیض احمد فیض کا مطالعہ کیا ہے۔ اور اس تقابلی مطالعے کے نتیجے میں اس حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض براؤننگ اور شیلی سے ایک حد تک متاثر ضرور ہیں مگر اصل جس شاعر کا تاثر انہوں نے قبول کیا ہے وہ شیراز کا عندلیب خوش نوا حافظ ہے۔

دو یا دو سے زیادہ شاعروں کا تقابلی مطالعہ ان کی انفرادیت ختم نہیں کر دیتا۔ بلکہ اس نوعیت کے مطالعے سے صراحتہً مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان شاعروں نے کس حد تک ایک دوسرے پر اپنے اثرات ڈالے ہیں اور ان اثرات نے کیا صورت یا صورتیں اختیار کی ہیں۔

فیض کی شاعرانہ عظمت اپنی جگہ مسلم —— مگر ان کا حافظ شیرازی سے متاثر ہونا ایک جداگانہ بات ہے۔

صاحب مقالہ نے اپنے اس مختصر مگر فکر انگیز مضمون میں کافی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے اور ہم ان کا بڑی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں۔

افسانے اچھے چار ہیں۔ ایک ترجمہ ہے اور بڑا خوبصورت ترجمہ ہے۔ پروین سرور اپنے افسانے میں اپنا مخصوص انداز لیے ہوئے آئی ہیں۔ حمید کاشمیری نے حسب معمول زندگی کے ایک عام اور معمولی واقعے کو ایک بھرپور تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے اور اسے ایک بڑا درد ناک المیہ بنا دیا ہے۔ حمید کاشمیری کا پچھلا افسانہ بھی پڑھنے والوں پر گہرا تاثر چھوڑ گیا تھا اور اس افسانے کے بارے میں بھی یہی توقع قائم کی جا سکتی ہے۔ فنی اعتبار سے صاحب افسانہ نے پچھلی کچھ مدت میں کافی ترقی کی ہے اور ان کا افسانوی رنگ روز بروز نکھرتا جا رہا ہے۔

جناب وقار بن الٰہی کا افسانہ ہے اور اس افسانے کے متعلق ہمیں کچھ تفصیل سے عرض کرنا ہے —— افسانے کے فنی پہلو کے بارے میں ہم صرف یہی عرض کریں گے کہ اگر افسانہ نگار ذرا ورزش خراش اور قطع و برید سے کام لیتے تو SUSPENSE قائم کرنے میں بہتر طور پر کامیاب ہو سکتے تھے۔ افسانے کی موجودہ صورت بھی پڑھنے والوں کو متاثر کرنے میں ناکام نہیں رہی —— بہرحال افسانے کا فنی موضوع بحث نہیں ہے موضوع بحث دراصل وہ رویہ ہے جو مصنف نے انسانی زندگی کے ساتھ روا رکھا ہے۔

وقار بن الٰہی اردو کے ان افسانہ نگاروں کی صف میں شامل ہیں جن کے متعلق ہمارے اکثر پڑھنے والوں کی بڑی خوشگوار توقعات قائم ہیں۔ ان میں افسانہ نگاری کی بڑی جاندار اور توانا صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور ان صلاحیتوں سے وہ بہت اچھا کام لے سکتے ہیں اور انہیں لازماً لینا چاہیے!

فنکار کا میلانِ طبع اگر اس دبستانِ ادب کی طرف ہے جسے رومانی سکول کہا جاتا ہے تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے اردو کے اکثر و بیشتر افسانہ نگار طبعاً رومانی ہیں خود کرشن چندر کی مثال بھی اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہے —— ہمیں صرف اعتراض ہے تو اس رومانوی مریضانہ کیفیت پر جو بری طرح افسانے پر چھائی ہے —— ہمیں خدشہ ہے کہ یہ کیفیت کہیں ہمارے نوجوان مصنف کے زندگی کے بارے میں ایک رویے اور رجحان کی صورت میں تشکیل پذیر نہ ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں یہ چند سطریں لکھنے کی ضرورت پیش آئی ہے

انسانی زندگی کے بعض پہلو نہایت دردناک ہیں —— ان پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کا تجزیہ کرتے وقت اس رجحان خاص کو اپنے ذہن پر چھا جانے کی اجازت نہیں دینا چاہیے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے محض مریضانہ ہے۔

افکار و مسائل

چند روز ہوئے لاہور کے سینیٹ ہال میں ایک اہم مذاکرہ منعقد کیا گیا تھا۔ موضوع تھا اردو کے لئے رسم الخط کا مسئلہ۔ مذاکرے میں چند ممتاز دانش وروں نے حصہ لیا تھا اور سب کی متفقہ رائے تھی کہ رومن رسم الخط کسی طرح بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے لئے موجودہ رسم الخط ہی موزوں ترین رسم الخط ہے اور اسے بدلنا نہ صرف غیر دانشمندانہ اور غیر ضروری ہے وار ایسا عمل ہوگا اور کوئی قوم بھی سوجھ بوجھ کی حالت میں اس اقدام پر رضامند نہیں ہو سکتی۔ یہ فیصلہ صرف چند دانشوروں ہی کا نہیں ـــ ان لاکھوں افراد کا ناقابلِ تغیر و ناقابلِ شکست فیصلہ ہے جو اردو سمجھتے ہیں۔ ہم دہرائے لکھتے ہیں، یہ فیصلہ اپنی جگہ بالکل درست بالکل صحیح ہے مگر اس فیصلے کو بہر صورت صحیح مانتے ہوئے بھی ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کرنا ہوگا کہ ہماری املا اگر بہت حد تک نہیں تو ایک حد تک ضرور محتاجِ ترمیم ہے اور جب تک ہماری املا کے یہ نقائص دور نہیں ہو جاتے ہماری لسانی مشکلات کا ایک معتد بہ حصہ دور نہیں ہو سکتا۔ املا کوئی جامد شے نہیں ہے صوتی تغیرات کے ساتھ ساتھ املا کے پرانے طریقوں میں تبدیلی کا وقوع پذیر ہونا ایک فطری امر ہے ہمیں کوشش یہ کرنا ہوگی کہ ہماری املا میں کم سے کم پیچیدگیاں پیدا ہوں ـــ پیچیدگیاں جتنی زیادہ کم ہوں گی سہولتیں اسی قدر سے بڑھیں گی۔ املا کا مسئلہ صرف ہمارا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ انگریزی زبان بھی اس سے دوچار ہے۔ آنجہانی برنارڈ شا نے تو املا کی بہتری کے لئے ایک اچھی خاصی رقم وقف کر دی تھی اور جو کمیٹی اس مقصد کے لئے تشکیل پذیر ہوئی تھی اس نے اپنی تجاویز پیش کر دی ہیں۔ یقیناً ان تجاویز کے مطابق انگریزی املا میں ضرور تبدیلی رونما ہوگی۔ اور یہ تبدیلی لازماً بہتر نتائج اپنے ساتھ لائے گی۔

یہ نہیں کہ اردو املا جیسے اہم مسئلے پر غور کیا ہی نہیں گیا ـــ ضرور کیا گیا ہے۔ [illegible] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس معاملے میں قابلِ قدر کام کیا ہے اور کئی دقتیں دور کر دی ہیں۔ مثلاً ان حضرات کی تجویز یہ ہے کہ ہر لفظ کو حتی الامکان الگ الگ لکھا جائے مثلاً 'اسنے' کی بجائے 'اس نے'، 'لیگئی' کی جگہ 'لے گئی'، 'کیلئے' کی بجائے 'کے لئے'، 'کانوں' کی بجائے 'کانو'، 'پانوں' کی بجائے 'پاؤں' اور اسی قسم کی کئی اور ترمیمیں۔

ہماری سب سے بڑی کوشش یہی ہونا چاہئے کہ ہمارے ہاں جتنی املائی پیچیدگیاں نظر آ رہی ہیں وہ ختم ہو جائیں۔ ایک تو املا میں وحدت ہونی چاہئے۔ لکھنے والے جائزہ کو 'ء' کے ساتھ بھی لکھتے ہیں اور 'ی' کے ساتھ بھی۔ جیسے جائزہ اور جایزہ۔ کچھیے یوں بھی لکھا جاتا ہے اور کہئے بھی۔ یہی معاملہ 'لکھیے' کے ساتھ ہے۔ 'لکھئے' بھی لکھا جاتا ہے۔ بہتر صورت کیا ہونی چاہئے۔ اس کا فیصلہ ہونا چاہئے۔ اسی طرح ایک اور پیچیدگی بھی ہے۔ ک۔ ل زبر کَل کیوں ہوتا ہے۔ کُل کیوں نہیں ہوتا۔ ک اور ل کے درمیان جو شکل رونما ہو گئی ہے اس کی وجہ جواز کیا ہے ـــ اسی انداز کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔

ہمیں ان کی طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہئے اور جلد سے جلد غور کرنا چاہئے۔

ٹائپ کا حل بھی سوچنا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ موجودہ خط 'نستعلیق' ٹائپ کے لئے مناسب نہیں اس کے لئے 'نسخ' موزوں ہے۔ 'نسخ' کا ٹائپ ہمارے ہاں رائج ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ مقبول بنایا جائے۔ ابھی یہ نامانوس معلوم ہوتا ہے لیکن جب باقاعدگی کے ساتھ استعمال ہونے لگے گا تو یہ نامانوسیت اور اجنبیت رفتہ رفتہ دور ہو جائے گی۔

ٹائپ کی مخصوص مقتضیات کے پیشِ نظر بھی املا میں تبدیلی کرنا ہوگی اور یہ تبدیلی ناگزیر ہے۔

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

فیض اور حافظ

ڈاکٹر وزیر آغا نے فیض پر اپنے قابلِ قدر مضمون "اردو نظم میں انجماد کی ایک مثال" میں فیض کے ذہنی ارتقا کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑی حد تک درست ہیں۔ واقعی فیض کے ہاں موضوعات کا تنوع نہیں۔ لیکن اس سے فیض کے انجماد پر استدلال کرنا ایک ناقدانہ زیادتی ہے۔ شاعرانہ ارتقا دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ (۱) موضوعات کا ارتقا (۲) فن کا ارتقا۔ قسم اوّل کی مثال اقبال کے کلام سے دی جا سکتی ہے۔ وہ وطنیت، قومیت اور اشتراکیت سے ہو کر ملّتِ بیضا تک پہنچے ہیں۔ لیکن اس ارتقائے ذہنی کو اقبال کا تضاد بھی کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے۔ اور فن کے ارتقا سے مُراد ہے۔ جذبے کی گہرائی و گیرائی میں تدریجی ترقی۔ فکری تعقید اور الجھاؤ کا فکری تنویر اور صفائی میں درجہ بدرجہ تبدیل ہونا۔ فکر اور جذبے کی ہم آہنگی اور امتزاج میں ترکیب و ترتیب اور اعتدال و توازن کی بتدریج ترقی۔ یہ امر تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں کہ فیض کے ہاں موضوعات کا ارتقا نہیں کیونکہ بہتر نظامِ حیات اور مثالی انسانیت کا خواب بذاتِ خود ایک ایسا موضوع ہے جس کا ذیلی تنوع وافی ہے۔ اگر وزیر آغا صاحب کا خیال یہ ہے کہ جمود اسی کا نام ہے تو ٹھیک ہے۔ واقعی فیض نے نقشِ فریادی میں سرمایہ داری سے نفرت کی۔ دستِ صبا میں اس کے گُن نہیں گائے۔ اور دستِ صبا میں ظلم کی مذمت کر کے زنداں نامہ میں ظلم کا پرچار نہیں ڈھونڈا۔ یعنی اس کے ہاں موضوعات کا ارتقا نہیں ہوا۔ البتہ فیض کے فنی ارتقا میں شبہ کرنا اپنے مذاقِ سلیم کا مضحکہ اُڑانا ہے۔ کیا دستِ صبا نقشِ فریادی پر اپنی فنی پختگی کے اعتبار سے ایک قدم کا پتہ نہیں دیتی۔ کیا دستِ صبا کی پختہ تر حیثیت اور نقشِ فریادی کی تخیلی حیثیت مفرارتقا کی دو منزلیں نہیں ہیں۔ باقی رہا موضوع کا ذیلی تنوع جو ہر تجربے پر فلسفے اور ہر فنکار کے فن کے لئے ضروری ہے۔ تو اس کی فیض کے ہاں بھی کمی نہیں۔ انصاف اور ظلم، آزادی اور غلامی، جبر اور قید، وطن سے دُوری، محبت اور جانثارانِ وطن کے قیدِ مصائب و مشکلات کا بیان، اپنی صبر و جبر بندھانے اور جہد و کوشش کی مشعلیں روشن رکھنے کے لئے امید افزا بیت اور امید پر پہنچانا۔ مار کر مارنے شیشوں کو چکنا چور کر دینے والی نا امیدی اور اس کا مقابلہ۔ فیض کے ایک ہی موضوع کی مختلف شاخیں ہیں۔ میر کی عظمت موضوعات کے تنوع میں نہیں۔ موضوع تو بے چارے کا تھا ہی ایک "غمِ ناکامی" اور باقی سب کچھ تو اس ایک شجر کے برگ و بار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہی جمود ہے تو یہ شاعرانہ عظمت کے منافی نہیں۔ بیشتر غزل گو شعرا کا ایک ہی موضوع ہوتا ہے یعنی عشق۔ اور وہ بھی رسمی۔ کیا جگر اور حسرت کے ہاں یہ جمود نہیں ہے؟ خیام کا موضوع بھی تو ایک ہی تھا "عشرتِ امروز"۔ جس سے وہ عمر بھر چمٹا رہا۔ اس ثبات و استقامت سے تو شاعرانہ عظمت میں جان پڑتی ہے۔ اور کسی محبوب موضوع سے یہ شیفتگی و دلبستگی ہی تو اس موضوع کے امکانات کو شاعر کے لئے نمایاں کرتی ہے۔ اور شاعر اسے طرح طرح سے باندھتا ہے۔ رنگا رنگ گلدستوں میں سجا کر رکھتا ہے۔ میر کی کل کائنات ایک حقائق آنسو تھا۔ جسے میر نے ہزاروں رُوپ دیئے۔ کیا یہ فن کا نقص ہے؟

ذہنی ارتقا کی تقسیم ایک دوسرے طریق پر بھی ہو سکتی ہے یعنی عمودی ارتقا اور افقی ارتقا۔ فن کے لئے مسلسل عمودی ارتقا کوئی خاص ضرورت نہیں۔ اگر فنکار کی رُوح اپنی تخلیقی زندگی سے قبل ہی تجربات، مشاہدات اور مطالعے کے ذریعے عمودی ارتقا کی مناسب بلندیاں طے کر چکی ہے تو اسے بھٹکنے کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ اسی بلندی پر منزل کی طرف پرواز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اور یہ پرواز افقی ہوتی ہے۔ افقی پرواز میں رفتار اور توازن، نفاست اور ہمواری

کا فرق عشق سے پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر پرواز کے دوران کچھ نئے تجربات حاصل ہو جائیں جنہیں ساتھ لے کر وہ کچھ مزید بلندی پر اڑ سکے تو اس کی عظمت میں یقیناً اس سے اضافہ ہوگا۔ یہ امر واقعی قابلِ ذکر ہے کہ فیض کے ہاں ارتقا بیشتر افقی رہا ہے۔ کیونکہ عمودی اڑان کی اسے ضرورت ہی پیش نہیں آئی (یا شاید اس کے لئے مناسب ماحول میسر نہیں آیا) وہ سطحِ زمین سے ایک جیسی بلندی پر اڑا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب اس نے "صبحِ آزادی" لکھی اور ۱۹۵۲ء میں جب اس نے "دروشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں" کہی اور ۱۹۵۵ء میں جب اس نے "بنیاد کچھ تو ہو" لکھی تو وہ ذہنی اعتبار سے ایک ہی سطح پر تھا۔ اور یہی چیز ہے جس کو وزیر آغا نے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ کھوجی کے خط سے کچھ مزید الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔ نظریہ اور نصب العین کلچر اور تہذیب کے مسائل تو فیض شناسی کی فروعات بھی نہیں۔ اس لئے آغا صاحب کے مضمون سے فیض کے ہاں انجماد کا ردّ تو خیر کیا ہوتا۔ بات اور الجھ گئی۔ بقول مجتبیٰ حسین کے شعر میں نظریہ نہیں کہے جاتے نظریے کے ذریعے شعر کہے جاتے ہیں۔ چنانچہ فیض نے اور شاید فقط فیض نے، واقعی نظریے کے ذریعے شعر کہے ہیں۔ نظریے کو لباسِ شعر نہیں پہنایا۔ درحالی اور اقبال دونوں کے ہاں یہ بات ہے کہ وہ نظریے کو شعر بنا کر ہمارے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ نظریہ فیض کے ہاں بھی ہے۔ مگر اسے جذبے کے بعد ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ اگرچہ وہ جذبہ بھی کسی حد تک نظریے کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر فیض کے ہاں نظریے میں بھی حالی اور اقبال دونوں سے زیادہ وسعت ہے اور عمومیت بھی۔ کیونکہ فیض ہمیں مشرف بہ اسلام کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ صرف ہماری انسانیت کو ابھارتا ہے فیض کے کلام سے ہم بلا تفریقِ مذہب و ملت (بلکہ خود اس کے اپنے اساسی نظریے کے بعض اجزا سے انحراف کر کے بھی) لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ بات فیض کی غزل پر بھی اسی طرح صادق آتی ہے جس طرح نظم پر۔ کیا فیض کی غزلیں اور نظمیں دو مختلف نظریات کے تحت کہی گئی ہیں۔ یا نظم اور غزل لکھتے وقت فیض دو مختلف ذہنی سطحوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر فیض کے ہاں انجماد راہ پا گیا ہے تو وہ اس کی غزل میں بھی موجود ہوگا۔ ورنہ نظم میں بھی اس کا وجود فرضی ہے۔ کیونکہ فیض کی نظم غزل سے بہت قریب ہے۔ اور اس کی غزل بھی اسی موضوع پر ہے جو اس کی نظم کا موضوع ہے۔ اور فیض نے کوئی غزل مرصع کے بغیر کبھی کہی ہی نہیں۔ غزل اور نظم کی روایت یا ہیئت فیض جیسے کم گو اور پختہ کار فنکار کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اس امتیاز کا جواب اور عذر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

جب پہلی دفعہ دستِ صبا کو کھولا تھا تو حافظ کے اس شعر پر نظر پڑی تھی:

نفس بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد — عالمِ پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

"تو فیض کو حافظ کی عظمت کا اعتراف ہے" میں نے سوچا اور ساتھ ہی مجھے فیض کی نظم "حسینہ خیال سے" یاد آئی۔ جو "براؤننگ" سے ماخوذ ہے۔

مجھے دیدے رسیلے ہونٹ معصومانہ پیشانی حسیں آنکھیں

پھر ایک دن فیض کی نظم "حبیب عنبر دست" نظر سے گزری جس میں حافظ کا ایک شعر تضمین کیا گیا ہے۔ "تو کیا فیض، حافظ اور براؤننگ دونوں سے متاثر ہے لیکن حافظ اور براؤننگ میں تو مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ آخر گہری نظر سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ براؤننگ اور حافظ میں لاکھ تضاد سہی لیکن ان کے بعض پہلو مشترک بھی ہیں۔ اور یہی مشترک خصوصیات ہیں جن سے فیض کو خصوصی دلچسپی ہے۔ حافظ کا امتیاز فارسی شاعری میں یہ ہے کہ اس کا لہجہ عام فارسی لہجے اور کلاسیکل فارسی کلام کی شعری فضا سے قدرے مختلف ہے۔ یہی چیز اسے عظمت عطا کرتی ہے۔ حافظ کا کیف و سرور اس کی سرشاری و مستی۔ اس کا تبسم کا سا انداز اور مستقبل پر اس کی امیدیں، اور امروز کی تاریکی میں فردا کی امید افزا کرن جسے رجائیت کہا جاتا ہے، حافظ کو دوسرے فارسی شعرا سے ممیز کر دیتا ہے اور براؤننگ کا بھی انگریزی ادب میں یہی امتیاز ہے کہ وہ ہم عصر فلسفے کی پیدا کردہ قنوطیت کے خلاف احتجاج کرتا ہے اس دنیا کی ناکام ارضی محبت اس کے نزدیک دوسری دنیا میں (حیات بعد الموت میں) کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ اسے زندگی کے تسلسل پر بھی ایمان ہے۔ اور تسلسلِ حیات کا یہ عقیدہ اس کی

بڑھی ہوئی رجائیت ہی کی ایک شکل ہے۔ براؤننگ محبِ انسان ہے اور حافظ بھی۔ براؤننگ کا عقیدہ ہے کہ بدترین حالات بھی ہر باہوش شخص کے لئے بہتر اور سود مند حالات ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسے فاتحانہ شکست کا شاعر بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے نزدیک شکست فتح کے راستے میں محض ایک معمولی سا اٹکاؤ ہے جس کے بعد آدمی زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگتا ہے۔ یہ تو قوت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ آئندہ فتوحات ہماری موجودہ شکست کے بطن سے جنم لیں گی۔ حافظ کے ہاں بھی رجائیت ہے۔ مستقبل سے حافظ کو بھی توقع ہے۔ اگرچہ حافظ کے ہاں سعی و کوشش اور جہدِ مسلسل کی بجائے عشرتِ امروز اور گریز و فرار کے عناصر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ابیقوریت کا حامی ہے۔ لیکن حافظ کو قدرت کے قانونِ تغیر پر اس درجہ بھروسہ ہے کہ وہ تاریک ترین لمحوں میں بھی مستقبل کے آفتاب کا انتظار کر سکتا ہے۔ حافظ کی رجائیت وہ رجائیت نہیں جو براؤننگ یا اقبال کے ہاں ہے۔ کیونکہ اس رجائیت میں اپنی کوشش و کاوش کے نتائج کا انتظار رہتا ہے۔ اور حافظ کے ہاں سعی و عمل کے نتائجِ قطعی کا امید افزا انتظار نہیں۔ بلکہ قدرت کے قانونِ تغیر یا بالفاظِ دیگر حالات کی کسی مساعد کروٹ کا انتظار ہے۔ ع۔ چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

؎ ہاں مشو نومید چوں واقف نہ ز اسرارِ غیب — باشد اندر پردہ بازی ہائے پنہاں غم مخور

چنانچہ حافظ براؤننگ سے بہت دور ہوتے ہوئے بھی قریب ہے۔ اور یہ وجہ قربت یا وجہ اشتراک وہی رجائیت ہے جو دونوں کے ہاں دو مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے بلفظِ دیگر ایک ہی چیز معلوم ہوتی ہے۔ فیض کو یہی چیز بھاتی ہے۔ کیونکہ یہ اس کے شعری مزاج اور شعوری نظریات سے قریب تھی۔ چنانچہ فیض کے ہاں وہ کیف و مستی بھی موجود ہے جو حافظ کے ہاں خمریاتی مضامین کی مرہونِ منت ہے۔ اور وہ رجائیت بھی ہے جس سے حافظ اور براؤننگ پہچانے جاتے ہیں۔ بلکہ فیض کے بعض اشعار پر تو شبہ گزرنے لگتا ہے کہ یہ حافظ کے اشعار کا شعوری ترجمہ ہے۔

من اگرچہ در نظرِ یار خاکسار شدم — رقیب نیز چناں محترم نخواہد ماند — حافظ
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا — یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے — یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں — فیض
سلامتِ ہمہ آفاق در سلامتِ تست — بہ ہیچ عارضہ شخصِ تو دردمند مباد
دریں چمن چو درآید خزاں بہ یغمائی — رہش بہ سروِ سہی قامتِ بلند مباد — حافظ
خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو — سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے — تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے — فیض
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
تو عمر خواہ و صبوری کہ چرخِ شعبدہ باز — ہزار بازی ازیں طرفہ تر بر انگیزد — حافظ
ہاں تلخیِ ایام ابھی اور بڑھے گی — ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا — دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے — فیض
روزِ ہجران و شبِ فرقتِ یار آخر شد — زدم ایں فال و گذشت اختر و کار آخر شد
آں پریشانیِ شب ہائے دراز و غمِ دل — ہمہ در سایۂ گیسوئے نگار آخر شد — حافظ
امید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ — لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے — اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر — فیض

فیضؔ کو پہچاننے کے لئے انگریزی ادب سے شیلیؔ کا مطالعہ کرنا بھی خاصا دلچسپ ہے۔ شیلیؔ محبِ فطرت ہے۔ وہ فطرت کو ایک زندہ حقیقت سمجھتا ہے اس کے ہاں فطرت احساس، سوچ اور ادراک کی اہل ہے۔ چنانچہ فیضؔ بھی فطرت کو الم و مسرت، یاس و امید اور رنج و راحت میں اپنا رفیق بناتا ہے۔

ع تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی

ع تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

لیکن شیلیؔ زمین سے بہت اُونچا اُڑتا ہے۔ اس کا اصل وطن کرۂ ہوا سے اُوپر ہے۔ اس کے قدم زمین پر بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ فضاؤں کا شاعر ہے اور فضاؤں سے بھی صرف تغیر پذیر اور متحرک اشیاء و موضوعات اسے بھاتے ہیں اس کے نغمات بادلوں، ہواؤں، طوفانوں اور جھکڑوں میں زمین سے کافی بلندی پر جنم لیتے ہیں۔ جبکہ فیضؔ زمین کا باسی، زمین کی محبت میں گرفتار اور بہتر انسانی ارضی مستقبل کا ترجمان ہے۔ اس موخر الذکر خصوصیت کی شیلیؔ کے ہاں بھی کمی نہیں۔ وہ خواہشِ انقلاب اور بنی نوعِ انسان کی تعمیرِ نو کا مغنی ہے۔ وہ اپنی شمالی جنت اور اپنے خوابوں کے جزیرے کی تلاش میں گاتا ہے۔ بادِ مغرب سے خطاب ODE TO THE WEST WIND شیلیؔ کی ایک معرکہ آرا نظم ہے۔ جو اس جملے پر ختم ہوتی ہے "اگر موسم سرما آگیا ہے (تو کیا غم) بہار بھی زیادہ دور نہیں ہوگی"

فیضؔ نے اسے زیادہ یقینی لہجہ دیا ہے:۔

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار جاتے جاتے یونہی دم بھر کو خزاں ٹھہری ہے

شیلیؔ کو جامد و ساکت اشیاء و مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیٹسؔ ساکن تصاویر پیش کرتا ہے تو شیلیؔ متحرک تصاویر کا دلدادہ ہے۔ "بادل" اور "بادِ مغرب سے خطاب" اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ حرکت فیضؔ کے ہاں بھی ہے مگر یہ حرکت معتدل اور متوازن ہے۔ یہ جھکڑوں کی حرکت نہیں جس سے درخت اکھڑ جاتے ہیں۔ اور خزاں زدہ پتے اپنی جگہیں چھوڑ کر کسی نشیبی جگہ میں جمع ہونے لگتے ہیں۔ بلکہ یہ بادِ صبا یا شب مست موج کی حرکت ہے۔ جو نغماتی فضا کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ ذرا حرکت دیکھئے:۔

جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے

اس حرکت میں پھر کچھ تیزی ہے۔ جو انقلابی جوش کا خاصہ ہے۔ لیکن فیضؔ کا اصل رنگ اس سے ذرا مدھم اور ہلکا ہے۔

ع صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں

ع نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے

ع اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب

ع تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں

فیضؔ کی حرکت میں بھی مستی اور کیف و سرور ہے۔ یہ صبا خرامی ہے۔ سبک عنبر آمیز اور معطر۔ اس میں انقلابی جوش کی اُلجھی ہوئی کیفیت نہیں نعرے نہیں، ڈھول ڈھمکا نہیں، کان پھاڑ دینے والا شور نہیں۔ ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ نہیں (حالانکہ یہ چیزیں ترقی پسند شعرا کے ہاں عام ہیں) یہ جھرنوں کی حرکت ہے۔ شفاف جھیل پر کشتی کی ہموار حرکت .... یہ شعر شاید کلامِ فیضؔ میں حرکت کی بہترین مثال ہے۔ بادلوں کی سی حرکت

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

شیلیؔ کو یقین ہے کہ ارتقائی تبدیلی ہو کر رہے گی۔ ایک تکمیل یافتہ نظام اپنا راستہ بنا رہا ہے۔ تاریکیاں مسلط ہیں مگر روزِ نو کی سحر دور نہیں۔ حافظؔ

کہتا ہے ؎ ای دل صبور باش و مخور غم کہ عاقبت — این شام صبح گردد و این شب سحر شود

فیض بھی ان کا ہمنوا ہے ؎ ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر — کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں

لیکن اس کے بعد ہم اسے کبھی کبھی ان دونوں سے آگے بھی پاتے ہیں:۔

رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو + یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر + صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بے تاب ٹھہر

فیض کا ابھرا ابتدا ہی سے مائل بہ امید اور رجائی رہا ہے۔ وہ رجائی ہے اس لئے حافظ، شیلی اور براؤننگ کے دوش بدوش چل سکتا ہے۔ اگر براؤننگ ہر شکست کے پیچھے تبسم فتح کا جلوہ دیکھ سکتا ہے تو فیض کو بھی اپنے تاریک حال کے پیچھے سے روشن مستقبل پر پورا یقین ہے۔ اور وہ محبوبہ سے پورے وثوق کے ساتھ مخاطب ہوتا ہے:۔

؎ چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں — اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اگر شیلی خزاں میں یقین بہار کے ہتھیار سے مسلح رہتا ہے۔ اور خزاں کی پیلی پتیوں کو آمد بہار کے تصور سے قابل برداشت بناتا ہے تو فیض بھی شام غم کو سپیدۂ سحر کی توقع پر جھیل لیتا ہے۔ وہ کولمبس کی طرح نامساعد حالات اور ناسازگار فضاؤں میں اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ کہیں تو خشکی نظر آئے گی۔ کہیں تو سفینۂ منزل سے ہمکنار ہوگا۔ شب غم اژدہے کی طرح پھنکار رہی ہے۔ تو کیا، کبھی تو سورج طلوع ہوگا۔ کشتی حیات کو کہیں تو ساحل ملے گا۔

؎ کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل — کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

؎ دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے — لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

اور اگر حافظ کو امید ہے کہ "یوسف گم گشتہ" پھر سوئے کنعان لوٹ آئے گا تو فیض کو بھی توقع ہے کہ

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید — اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی

اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب — اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

براؤننگ کی ناکام محبت حیات بعد الموت میں کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ تو فیض کا چمن زار انسانیت اگر اس کی زندگی میں نہیں تو اس کے بعد ضرور پھل لائے گا۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے — فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

یہی کنار فلک کا سیہ تریں گوشہ — یہی ہے مطلع ماہ تمام کہتے ہیں

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں — سحر کا روشن افق یہیں ہے

شیلی، براؤننگ اور حافظ میں موخر الذکر اردو سے قریب تر ہے۔ اور اردو کے مزاج شعری سے مناسبت بھی رکھتا ہے۔ اس لئے فیض کے ہاں زیادہ اثر حافظ ہی کا ملتا ہے اور تراکیب تراشی میں غالب کا۔ نسیم صبح کا سا دھیما لہجہ جو فیض کے ہاں بھی اپنی پوری ملائمت، کیف و سرور اور دردمندانہ اہتزاز کے ساتھ موجود ہے اپنی ابتدائی حالت کے اعتبار سے حافظ کی تخلیق ہے۔

ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبحگاہی — بہ پیام آشنائے بنوازد آشنا را

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را | کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادہ ما را
غرورِ حسن اجازت مگر نداد اے گل | کہ پرسشے نہ کنی عندلیبِ شیدا را — حافظ

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں | نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے | مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی — فیض

حافظ خنا یار اور معطر فضاؤں کا دلدادہ ہے۔ خوشبو اس کے لئے شراب کی سی سرمستی کا پیغام لاتی ہے بہار کا تصور اس کے ہاں پھولوں اور نکہت بدوش ہواؤں کا تصور ہے۔

از عراں جام حقیقی بہ کسی خواہد داد | چشم نرگس بہ شقائق نگراں خواہد بود
صبا گر گذرے افتدت بکشورِ دوست | بیار نفحۂ از گیسوئے معنبرِ دوست

حافظ کا کلام فردوسِ گوش اور جنتِ مشام ہے۔

در مجلس ما عطر میامیز کہ جاں را | ہر لحظہ ز گیسوئے تو خوشبوئے مشام است
گوشم ہمہ بر قول نے و نغمہ و چنگ است | چشم ہمہ بر لعلِ لب و گردشِ جام است

فیض بھی شامہ کی لذت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ان کی سامعہ کی حس بھی بہت تیز ہے۔ انہیں سقراط کی طرح غیبی اشارے نہیں سنائی دیتے بلکہ وہ ارضی آوازوں کے لئے گوش بر آواز رہا ہے " حبیبِ عنبر دوست " کے عنوان سے جو نظم فیض نے کسی اجنبی خاتون کے تحفۂ عطر پر لکھی ہے۔ ایک لاجواب چیز ہے۔ " حبیبِ عنبر دوست " کی ترکیب بھی وہی شخص وضع کر سکتا ہے جو اپنی قوتِ شامہ کو تربیت دے کر اس نقطے پر لے آئے جہاں خوشبو یادوں کی مہمیز کا کام دینے لگے۔ اور عنبر کو قوتِ گویائی حاصل ہو جائے۔ سابق میجر محمد اسحٰق نے زنداں نامہ کے شروع میں " روداد قفس " کے عنوان سے مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں فیض صاحب سے شکایت کی ہے کہ وہ سمن و گلاب کی نزاکتوں اور عطر بیزیوں کو تو بڑی چاہت سے یاد کرتے ہیں مگر مزدور کے پسینے کا ذکر ان کے ہاں نہیں ہے۔ اس اعتراض میں سجاد ظہیر بھی اسحاق صاحب کے ہمنوا ہیں :۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام | موسم گل ہے تمہارے بام پہ آنے کا نام
پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں | پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

فیض کی انتہائی حد تک تربیت یافتہ قوتِ شامہ کا ثبوت، دستِ صبا کی آخری نظم ہے۔ " زنداں کی ایک صبح " جس میں پابندِ قفس بلبل گوش بر آواز ہے اور نغمہ ریز بھی :۔

دُور قربت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم | دُور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دُور مچلی کوئی زنجیر، مچل کر روئی | دُور اُترا کسی تالے کے جگر میں خنجر
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی

حافظ کا گریز و فرار، حافظ کی عزلت نشینی، حافظ کا تصوف، حافظ کا گریہ ماتمِ عجز، حافظ کا عشقِ حقیقی، حافظ کی سرمستی اور ذکرِ شراب، حافظ کی رعائتِ لفظی حافظ کا ہیچ مقداریٔ سلطنت اور بے بضاعتیٔ زیست کا احساس واقعی فیض کے ہاں نایاب ہے۔ لیکن حافظ کا معطر لہجہ، حافظ کی غنائیت، حافظ کی آزادہ روی، حافظ کی مترنم فضا، حافظ کے بولتے ہوئے مصرعے اور گنگناتی ہوئی تراکیب اور ان سب سے بڑھ کر حافظ کی رجائیت فیض کے ہاں بھی ہے۔ لیکن

فیض کو حافظ کی صدائے بازگشت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فیض حافظ نہیں۔ حافظ کی وہ شکل ہے جو بیسویں صدی میں جنم لے سکتی تھی۔ آج حافظ زندہ ہوتے تو فیض ہوتے اور فیض عہدِ تیموری کا شاعر ہوتا تو حافظ ہوتا۔ حافظ گریز و فرار کا مرتکب ہوا کیونکہ زمانہ مجبوری اقدارِ حیات سے آشنا تھا۔ اس نے غزل کو یہ ترجیح دی جو اس کی آزادہ روی اور استغنا کا ثبوت ہے۔ اس نے تصوف کا راستہ اختیار کیا کیونکہ وہ زمانہ "خسرواں" کا تھا۔ جو اپنی مملکت کے رموز حافظ جیسے گدائے گوشہ نشین سے آزادہ کر سمجھ لیتے تھے۔ اس نے عشقِ حقیقی اختیار کیا کیونکہ عشق لیلائے وطن ان دنوں شیراز سے باہر قدم نہ نکالنے اور رخاکِ مصلیٰ میں مقیم ہونے کا نام تھا۔ باقی رہی حافظ کی رندی، اس کا احساسی رجحان، اور رخش کی یادوں سے تنہائی کو معطر رکھنے کا عمل۔ تو یہ چیزیں فیض کے ہاں بہتر اور نکھری ہوئی صورت میں موجود ہیں۔ حافظ کی یادِ محض، فیض کے ہاں "یادِ غزال چشماں اور ذکرِ سمن عذاراں" میں بدل گئی ہے۔ حافظ کی رندی فیض کے ہاں آکر استعارہ کی وسعت اور مجاز و ایمائیت کی بہت سی منزلیں طے کر چکی ہے۔ فیض کے ہاں شیخ، محتسب، رقیب، قاتل، گل، بہار، مے، ساغر، ہجر و وصل اور شام و سحر کا مفہوم، حافظ کے مفہوم سے زیادہ وسیع اور گرانقدر ہے۔ فیض نے رندی کے پیمانوں میں وسعت پیدا کی اگرچہ مقدار کے اعتبار سے حافظ کا امتیاز اب بھی قائم ہے۔

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح — گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد — کوچۂ یار سے بے نیلِ مرام آتا ہے

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھیں تری انجمن سے پہلے — سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی — جب ترا غم جگا لیا رات مچل مچل گئی

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم — کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

فیض کا کلام اس ذہنی پس منظر سے جنم لیتا ہے۔ جس میں حقائقِ زیست کے علاوہ انگریزی، فارسی اور شاید عربی شاعری کے اثرات بڑے توازن و اعتدال سے ترکیب پا چکے ہیں۔ اور فیض اس ذخیرے کو اس طرح استعمال کرتا ہے کہ جدتِ ادا، حسنِ ترکیب، روایت سے لگاؤ اور روایت سے بغاوت مل کر ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ لیکن فیض کہیں ہو کسی حال میں ہو کسی کے قسم سے بحث کر رہا ہو اپنے پیشرو حافظ کو نہیں بھولتا۔

گدائے کوئے تو از ہشت خلد مستغنی است — اسیرِ بندِ تو از ہر دو عالم آزاد است — حافظ

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے ان کو تشویشِ روزگار کہاں — درد بیچیں گے گیت گائیں گے اس سے خوش وقت کاروبار کہاں — فیض

جاں دادمش بہ مژدہ و خجلت ہمی برم — زیں نقدِ کم عیار کہ کردم نثارِ دوست — حافظ

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے — تری رہ میں کرتے تھے سر طلب سرِ رہگزار چلے گئے — فیض

سوادِ زلفِ تو کفر است دینِ ما — کہ روشن تر ازاں ایماں نباشد — حافظ

صبحِ گل ہو کہ شامِ مے خانہ — مدح اس روئے نازنیں کی ہے — فیض

با محتسبم عیب مگوئید کہ او نیز — پیوستہ چو ما در طلبِ عیشِ مدام است — حافظ

تمہیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا — یہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے — فیض

ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی

راتیں

پھر صدا دیتی ہیں آکر مرے در پہ راتیں
اجنبی راتیں، حسیں راتیں، ستم گر راتیں
جھومتی جھامتی، مدھ ماتی، عجب متوالی
سانولی سانولی، بل کھائی، معطر راتیں
پہلے آئی تھیں مگر یوں تو نہ آئی تھیں کبھی
رنگ میں کرشن کنھیّا کے نہا کر راتیں
آج تنہائی میں پا کر یہ مجھے لوٹ نہ لیں
مجھ کو رکھ دیں نہ کہیں اور مٹا کر راتیں
پھر نہ روٹھیں مری روٹھی ہوئی راتوں کی طرح
پھر مرا ہاتھ نہ چھوڑیں مری ہو کر راتیں
پھر مجھے بھول نہ جائیں تری آنکھوں کی طرح
غیر ہو جائیں نہ کچھ تجھ سے بھی بڑھ کر راتیں
پھر کہیں آ کے اُڑا دیں نہ یہ نیندیں میری
پھر نہ ہو جائیں مری سیج پہ پتھر راتیں
پھر کہیں چھین نہ لیں مجھ سے یہ میری صبحیں
ہو کے رہ جائیں نہ پھر میرا مقدر راتیں
آ کے پھر اور بڑھا دیں نہ کہیں دن کا عذاب
کھو نہ جائیں کہیں پھر خواب دکھا کر راتیں
پھر ہر اک در کا بھکاری نہ بنا دیں مجھ کو
مجھ کو بدنام نہ کر دیں کہیں گھر گھر راتیں

احمد ریاض (مرحوم)

طوائف اور شاعر

جہاں کا ذوقِ طوائفیت ہر اک حسیں شے خریدتا ہے
تو کیفِ نغماتِ بیچتی ہے میں حسنِ افکار بیچتا ہوں
تجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے تو زلف و رخسار بیچتی ہے
مجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے میں اپنے اشعار بیچتا ہوں
ترا تقدس مری شرافت، نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں
تو روحِ مغرور بیچتی ہے میں ذہنِ خوددار بیچتا ہوں
تری حمیت کا مول چشمِ ہوس کا اک آتشیں تبسم
میں اپنی حرمت کے موتیوں کو درونِ بازار بیچتا ہوں
نہ تیرے وعدوں کی کوئی قیمت، نہ میری قسموں کی کوئی اجرت
تو عہد و پیمان بیچتی ہے، میں قول و اقرار بیچتا ہوں
تری جوانی لٹی لٹی سی، مری جوانی گھٹی گھٹی سی
تو حسن اور جسم بیچتی ہے میں عشق اور پیار بیچتا ہوں
تو نیشِ تہذیب سے ہے چھلنی میں جورِ آداب سے ہوں زخمی
تو لذتِ درد بیچتی ہے، میں لطفِ آزار بیچتا ہوں
تری دکاں میں ہیں تیرے اجداد کی وراثت کے تیز نشتر
میں اپنے ماضی کی سازشوں کے کئی نمونہ دار بیچتا ہوں
تو اپنے ماحول کی جھکار ہیں اپنے حالات کا بھکانا
تو اپنا کردار بیچتی ہے، میں اپنا کردار بیچتا ہوں

شادؔ امرتسری

اے پیڑو کی زرّو

تیرا نام زرّو ہے تو پھر ایک برس بعد آئی ہے
ایک برس تک تو نے پورا جتن کیا ہے جینے کا
ایک برس اِک تیز ہوا کے جھونکے کی مانند گیا
تیز ہوا کا جھونکا تیرے مَن کا سونا لُوٹ گیا
تو ڈرتی ہے تجھ سے لوگ کہیں گے تو ہرجائی ہے

سوچ کہ تو نے ایک برس میں کیا کھویا کیا پایا ہے
جس نے تجھ کو چھوڑ دیا اب اس کا نام زباں پہ نہ لا
تو نے مَن کا سونا لُٹا کر جگ کو جیت لیا ہے، آ
لوگوں کی باتوں پہ نہ جا جانی واکر کا جام اُٹھا
تیرے مَن کا سونا آخر کوئی رنگ تو لایا ہے

؎ سابق صوبہ سرحد کا ایک گاؤں۔

قاضی عبدالستار

نیند

دشتِ شب دور تلک، دُور تلک پھیلا ہوا
میرے ماضی پہ ترے وعدۂ فردا کی طرح
رکھ لیے ابر نے چُن چُن کے فلک بھر کے نجوم
چاند دیتا رہا بیٹھا ہوا سورج کو حساب
اور خموشی کی چلاکی سے یونہی بادِ سموم
چل کے دو چار قدم ساتھ کہیں چھوٹ گئی
مرے زخموں نے مرے پاؤں کو پاپوش جو دی
جانے کس مانگ میں سب بھر گئے جگنو جا کر
جانے کس ہار میں گوندھے گئے پلکوں کے گہر
اس اندھیرے سے نصیبوں کی سیاہی روشن
میرا سایہ...... وہ مرے باغ کا اکلوتا گلاب
زلف میں ٹانک لیا اس کو بھی تنہائی نے
کتنی ہی بار بگولوں کا پکڑ کر دامن
اپنی کھوئی ہوئی منزل کا پتہ پوچھا ہے
نیند کی لیلیٰ کا، محمل کا پتہ پوچھا ہے
کیسۂ چشم میں باقی ہی نہیں توشۂ خواب

رضی اختر شوق

اے دردِ فراق کے مسیحا

مہتاب نے روشنی کے شہپر
پھیلا دیئے گرچہ بام و در پر
لیکن غمِ ہجر کا اندھیرا
رقصاں ہے دلوں کی رہ گزر پر

کرنیں ہیں کہ خنجروں کی صورت
پیوست سی دل میں ہو رہی ہیں
آفاق کی سرمئی فضا میں
اشکوں کے گہر پرو رہی ہیں

ماضی کے اداس بت کدہ کا
ایک ایک چراغ بجھ رہا ہے
کچھ غم دلِ بے قرار میں ہے
کچھ نوکِ مژہ تک آگیا ہے

اس عالمِ درد سے گریزاں
کس شہرِ سکوں کو چل دیا تو
اب کس کے نفس کی تازگی ہیں
وہ حلقہ بدوش نرم گیسو
اب کس کی نظر پہ مہرباں ہے
رنگینیٔ پیرہن کا جادو
کس شہر کی شام کو چراغاں
رکھتے ہیں تری مژہ کے آنسو

اے دردِ فراق کے مسیحا
میں راہ روِ رہِ تمنّا
محروم ہوں دولتِ طرب سے
ہر دکھ کے ہیں بے شمار مرہم
ہیں دور مگر مری طلب سے
راحت کے چراغ بجھ گئے ہیں
بے نور مرا افق ہے کب سے
لیکن مرے درد کا مداوا
تو چاہے تو آج بھی ہے ممکن
صرف ایک نگاہِ مہرباں سے
صرف ایک شعاعِ زیرِ لب سے
اے دردِ فراق کے مسیحا

بشیر منذر

مشعل

تیرے رخسار کی مشعل جو مرے پاس نہیں
چاند تاروں کے اجالے بھی مجھے راس نہیں

جل گئے میری تمناؤں کے سب رنگ محل
بجھ گئے میری امیدوں کے ضیا بار کنول
کوئی ارمان نہیں دل میں کوئی آس نہیں
تیرے رخسار کی مشعل جو مرے پاس نہیں

پھیکا پھیکا ہے یہ شاداب نظاروں کا سماں
اجڑا اجڑا ہے یہ بدمست بہاروں کا سماں
پھول کلیوں میں وہ اب رنگ نہیں، باس نہیں
تیرے رخسار کی مشعل جو مرے پاس نہیں

مہرباں ہو کے مری دنیا میں تم آ جاؤ
روشنی بن کے دل و جاں پہ تم چھا جاؤ
دنیا والوں کو مرے درد کا احساس نہیں
تیرے رخسار کی مشعل جو مرے پاس نہیں

سید مراتب اختر

اجنبی آواز

یوں تو پہلے بھی سُنی ہے مگر اب یاد نہیں
کس کی آواز ہے یہ
ڈوب جاتی ہے کبھی
اور اُبھرتی ہے کبھی
جس طرح بہتے ہوئے پانی پہ تنکوں کی قطار
ڈوب جاتی ہے کبھی
اور اُبھرتی ہے کبھی

تیری بھیگی ہوئی زُلفوں سے برستی بوندیں
دل کے تاروں کو ہلا جاتی ہیں
دیپ جلا جاتی ہیں

جب اماوس کی سیہ گونجتی رات
کانپتے پھولوں کو آکاش کے ملبوس میں چُن دیتی ہے
بوڑھے پیپل کی گھنی شاخوں پہ ٹھہری ہوئی تاریکی میں
گنگناتی ہے
اشاروں سے بلاتی ہے مجھے
کس کی آواز ہے یہ

ریاض انور

آخرِ شب

تجھے ہے شکوہ کہ شہرِ نگار چھوڑ کے میں
نشاطِ شامِ طرب کی بہار چھوڑ کے میں
نہ جانے کون سی بستی میں جا بسا ہوں آج
نئی حیات کے بیرنگ دائروں کی قسم
نہ کوئی دوست نہ کوئی رفیقِ منزلِ غم
عجیب مرحلۂ زیست پر کھڑا ہوں آج

مری حیات ہے خود ایک بیکراں صحرا
نہ جس میں سایۂ گل ہے، نہ جس میں رقصِ صبا
نہ تیرے جسم کی خوشبو، نہ پیرہن کی دمک
نہ چوڑیوں کے چھناکے، نہ قہقہوں کی کھنک
نہ آنچلوں کی بہاریں، نہ عارضوں کے شرار
نہ تیرے سینۂ نورس کے زیر و بم کا خمار
نہ تیری شوخ ادائیں، نہ تیرے شوخ پیام
نہ کیف و رنگ میں ڈوبے ہوئے حسیں الزام
نہ ذکرِ سرخئ لب اور نہ تیری چشم کی بات
تری جبیں کا اجالا، نہ تیری زلف کی رات

قدم قدم پہ بگولے، روش روش پہ ببول
نظر نظر سے الجھتے ہوئے یہ ویرانے
ہزار صدیوں کی افسردگی سمیٹے ہوئے
ہر ایک ذرے میں پنہاں ہیں لاکھ افسانے

نہ جانے کتنی پُر ارمان دُلہنوں کے خواب
لہو میں رو لئے گئے خاک میں ملائے گئے
نہ جانے عظمتِ آدم کے کس قدر مہتاب
قفس کی ظلمتِ شب تاب میں چھپائے گئے

نہ جانے کتنے شہوں نے بنامِ لطف و کرم
مہکتی کلیوں سے اپنے حرم سجائے ہیں
نہ جانے کتنے شہوں نے بہ فیضِ جبر و ستم
گداز جسم، جواں لب بہاں چرائے ہیں
نہ جانے کتنی نگاہوں سے نور چھینا گیا
دیارِ درد کے محلوں کی روشنی کے لئے
نہ جانے کتنے دلوں سے لہو نچوڑا گیا
نئے خداؤں کے چہروں کی تازگی کے لئے
نہ جانے کتنے گھروں کے دیئے بجھائے گئے
شہوں کے راج دلاروں کی زندگی کے لئے

حضور تیرے شبستاں سے دور صحرا میں
میں چن رہا ہوں وہ انمول آنسوؤں کے پھول
جنہیں بہار نے ٹھکرا دیا حقارت سے
جنہیں خزاؤں کا دامن بھی کر سکا نہ قبول
ٹپک کے آنکھ سے جو کھو گئے اندھیروں میں
ان آنسوؤں سے جلائیں گے زندگی کے چراغ
اُبل پڑیں گی جبینوں سے نور کی کرنیں
سُلگ اُٹھیں گی امنگیں، دہک اٹھیں گے دماغ

نئی حیات کے بیرنگ دائروں کی قسم
نہ کوئی دوست نہ کوئی رفیقِ منزلِ غم
مقامِ آخرِ شب سے گزر رہا ہوں آج

حمید کاشمیری

"آپ کو کہاں جانا ہے؟"

فیشن سینٹر کے سامنے رکشہ ٹھہرا کر جب وہ نیچے اُتری تو یکے بعد دیگرے قریب قریب تمام راہگیروں کی نگاہیں اُس پر اُٹھ گئیں۔ اور چند ایک اپنی چال ہی بھول گئے۔ اور اس کے اُوپر کے ہونٹ پر ننھے ننھے موتیوں کے سے کئی قطرے سے پھوٹ پڑے۔ اس نے راہگیروں کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی نگاہوں کی وسعت کو سمیٹا۔ اور رکشہ میں رکھا ہوا اسکا تھیلا اُٹھانے لگی۔ تھیلا اُٹھاتے ہوئے اس کا ایک کندھا تھوڑا سا نیچے کی طرف جُھکا اور تھیلے کے وزن کا ہلکا سا تاثر اس کے چہرے پر پیدا ہو گیا۔ اور ابھی وہ تھیلے کو رکشہ سے بمشکل باہر ہی نکال پائی تھی کہ اس کے کان کے قریب سے ایک دھیمی سی آواز گزری۔

"میں اُٹھا دوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس نے نظروں کو بدستور سمیٹے رکھا اور کسی قسم کے احساس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ لیکن اس کے ہونٹ پر موتیوں کے سے ننھے ننھے قطرے دبیز ہوتے چلے گئے۔ اور وہ اپنے آپ کو ان تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرنے لگی جو اُسے آج دن بھر پیش آنے والی تھیں۔ کبھی کبھار مہینے دو مہینے بعد ہی شہر کی طرف آتی تھی مگر جب بھی آتی اسے ایک جیسی مشکلات ہی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک ایک قدم پر اُسے آوارہ مزاج راہگیروں کے جملوں کے وار سہنے پڑتے۔ اور شریفوں کی آڑھی ترچھی نگاہوں کا مرکز بننا پڑتا۔ اس کے چہرے کے خدوخال اتنے جاذبِ نظر نہیں تھے۔ لیکن اس کا جسم غیر معمولی طور پر دلکش اور گداز تھا۔

جسم کی یہی دلکشی اور جاذبیت جہاں اوروں کے لئے بے بسی کا باعث تھی وہاں اس کے لئے بھی عذابِ جان بنی ہوئی تھی۔ وہ جب کبھی اپنے جسم کا موازنہ کرتی تو رزہ براندام ہو جاتی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کئی رقاصاؤں کے جسموں کو ملا کر اس کا ایک جسم بنا دیا گیا ہو۔ اور اگر کوئی رقاصہ ہوتی تو اسی جسم کی ایک ایک حرکت سے ہزار ہزار وصول کرتی لیکن جسم سے ایک کوڑی وصول کرنے کا خیال بھی کبھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنی تمام ضروریات کا بوجھ دل و دماغ اور آنکھوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ دن رات انتھک محنت کر کے نئے نئے فیشن کے مطابق جدید وضع کے زنانہ کپڑے تیار کرتی ان کپڑوں میں قمیص، شلوار، بلاؤز، ساری وغیرہ شامل تھی۔ اور جب اُسے اچھی خاصی رقم ملنے کی اُمید ہو جاتی تو وہ انہیں جمع کر کے سلی تھیلے میں ڈالتی اور فروخت کرنے کی خاطر شہر کی طرف روانہ ہو جاتی۔ اور بس میسّر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پانچ دس روپے رکشہ کے کرایہ میں صرف ہو جاتے۔ اور اگر ایک ہی دن میں اس کا مال فروخت نہ ہوتا تو اُسے سخت مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا اور رکشہ کی واپسی کا کرایہ اتنی بے دلی سے ادا کرتی جیسے اپنے جسم سے گوشت کاٹ کر دے رہی ہو۔ پھر دوسرے دن دوبارہ شہر آنے کے لئے بڑی مشکل ہی سے اس کے پاس رکشہ کا کرایہ ہوتا۔

کھڑے کھڑے اُس نے ایک سرسری سی نظر سے فیشن سینٹر کے سائن بورڈ کو دیکھا۔ تھیلے کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا اور چال میں ایک دم یہ

وقار اور اعتماد سا پیدا کر کے اندر سجی سجائی دکان میں داخل ہو گئی۔ ایک سیلز مین منہ کھولے مجروح نظروں سے اس کے سینے کو گھورتا ہوا آگے بڑھا اور رال ٹپکانے کے سے لہجے میں بولا " فرمایئے "۔

" بیگم صاحبہ کہاں ہیں ؟" اس نے دھیرے سے دکان کی مالکن کے متعلق پوچھا۔

" جی ابھی بلاتا ہوں " سیلز مین نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ اور تھوڑی دیر بعد بیگم صاحبہ پچھلے کمرے سے نمودار ہوئیں۔ ان کے چہرے پر ایک مصنوعی تبسم بکھرا ہوا تھا اور تبسم نے غازے کے نیچے سے چہرے کی بہت ساری جھریوں کو نمایاں کر رکھا تھا۔

" فرمایئے " وہ قریب آ کر ٹھوڑی لٹکا کر خوشامدانہ لہجے میں بولیں۔

" جی میرے پاس کچھ ریڈی میڈ کپڑے ہیں انہیں فروخت کرنے کے لئے لائی ہوں " وہ نہایت انکساری سے حرفِ مدعا پر آ گئی۔ بیگم صاحبہ کے چہرے سے اچانک مسکراہٹ غائب ہو گئی اور جھریاں پھر غازے کی تہہ کے نیچے چھپ گئیں۔ اور چہرے پر سنجیدگی کے اثرات پیدا کرتے ہوئے انہوں نے اپنے کسی سیلز مین یا منیجر قسم کے آدمی کو آواز دی۔ " محمد عمر ذرا آپ سے بات کرنا " اور خود بیگم صاحبہ طمطراق کے ساتھ واپس کمرے میں چلی گئیں۔ محمد عمر کیا بات کرتا اس نے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے پھر کپڑوں کو کم اور اسے زیادہ دیکھا پھر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا " یہ ہمارے ہاں نہیں چلیں گے "۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح دکان سے باہر نکلی اور کسی دوسری دکان کے متعلق سوچنے لگی۔ کوئی نصف گھنٹے کے بعد وہ تیسری دکان کے متعلق سوچ رہی تھی اور کچھ دیر بعد چوتھی کے متعلق۔ اور جیسے سورج نصف النہار پر تھا تو وہ صدر کے ایک چوراہے پر کھڑی تھی اور اس نے دکانوں کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا سکی تھیلا بدستور کپڑوں سے بھرا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا اور قریباً قریباً سب دکانداروں نے کاروباری بدحالی کا شکوہ کر کے اسے ٹال دیا تھا۔ اور اب وہ بس گھر جانے کے لئے رکشہ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ بھوک کے مارے اس کی انتڑیاں جواب دے چکی تھیں۔ اس کا سارا جسم پسینے میں تر تھا اور بغلوں کے نیچے کے حصے میں قمیص پر پسینے نے بھونڈی سے نقوش ابھر آئے تھے۔ جو آنے جانے والوں کو اپنی طرف مزید مائل کر رہے تھے اس نے کتنی بار سوچا کہ کسی ریستوراں میں جا کر ایک گلاس برف پانی یا سوڈا لیمن وغیرہ پی لے مگر ایسا کرنے کی اس میں ہمت نہ ہو سکی وہ اس سے پیشتر کبھی کسی ہوٹل میں نہیں گئی تھی۔ اس نے جلد سے جلد واپس گھر چلے جانا ہی مناسب سمجھا اور آخر کار انتظار کرنے لگی اس وقت دفتر کے اوقات ختم ہو چکے تھے اور صدر سے رکشہ کا مل جانا ایسے ہی تھا جیسے خالص دودھ یا گھی کا مل جانا وہ گھنٹہ بھر تک وہاں کھڑی رہی اور انتظار کرتے کرتے نڈھال سی ہو گئی۔ سینکڑوں رکشے اس کے سامنے سے گزر گئے لیکن ایک بھی خالی نہیں تھا اسے بہت دیر بعد احساس ہوا کہ کسی خاص تقریب پر بسوں کی مصروفیت کی وجہ سے رکشاؤں کی مصروفیت بڑھ گئی ہے مگر اب وہ کیا کر سکتی تھی اسے واپس گھر تو بہر طور جانا تھا۔ اس کے قریب ہی پان والے کی دکان پر تین چار آدمی کتنی دیر سے اس کی تاک میں کھڑے تھے اور بیسیوں قسم کے جملے اس پر چست کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ راہگیروں نے اسے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ مگر راہگیر تو ہر راہ پر ہوتے ہیں البتہ اس نے پان والے کی دکان سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہاں سے ہٹنا چاہا تو اسے خیال آیا کہ رکشہ حاصل کرنے کے لئے اس چوک سے مناسب جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی وہ مایوس ہو کر پھر وہاں ٹھہری رہی اور نگاہیں سڑک پر لگا رکھیں۔

" ارے باپ رے ! ! " اس کے پیچھے سے آواز بلند ہوئی جیسے کوئی توبہ استغفار پڑھ رہا ہو چند لمحوں بعد راہگیروں کے ہجوم میں سے ایک شخص اپنا پورا جسم اس کے جسم کے ساتھ مس کر کے یوں تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے کسی دم توڑتے مریض کے لئے ایمبولنس لینے کے لئے جا رہا ہو۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی لیکن نظم و ضبط کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور ایک قدم آگے کنارے کی طرف بڑھ کر بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ مگر مسلسل پسینے میں ڈوبتی چلی گئی۔

" کیا خیال ہے "

خیال تو ٹھیک ہے ۔

" اصل میں یہ لڑکی ۔" وہ تین آوازیں بیک وقت اس کے قریب سے اُسے گولی کی طرح گھستی ہوئی گذریں اس کے قدم ڈگمگا سے گئے لیکن اس نے استقلال کا دامن نہیں چھوڑا ۔ رکشہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا اور اب گرد و نواح کے لوگ اسے اتنی دیر سے یوں کھڑی دیکھ کر اس کے چال چلن پر شبہ کرنے لگے ۔ ایک آدمی سڑک پر بالکل اُسے مدِ مقابل کھڑا نہایت بیہودگی کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اُس کی پشت پر سے ایک آواز ابھری ۔

" بھئی واہ منٹگمری بھی کیا شہر ہے "

" لیکن اس قطعے کا بھی جواب نہیں پیارے " اس کے سامنے والے نے رال ٹپکاتے ہوئے جواب دیا ۔ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی اس کا جی چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے یا پھر دوڑ کر کسی چلتی کار کے نیچے آجائے ۔ وہ کار کے نیچے آنے کے متعلق سوچ ہی رہی تھی کہ ایک کار اس کے قریب آ کر رک گئی ۔

" آپ کو کہاں جانا ہے میں پہنچا دوں " کار چلانے والے نے نہایت مہذب طریقے سے پوچھا ۔

" میں پارکنگ کے سلسلے میں کتنی بار یہاں سے گذرا ہوں اور ہر بار آپ کو یہیں کھڑے دیکھا " اس نے مزید کہا ۔

وہ کچھ جز بز ہوئی ۔ انکار کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں بن پایا ۔ اب اس میں مزید وہاں ٹھہرنے کی تاب بھی نہیں تھی اس کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں وہ بحالتِ ذلت ہوئی آگے بڑھی اور منظر ماند سے لہجے میں کہنے لگی " مجھے غریب کالونی جانا ہے "

" بیٹھئے میں چھوڑ آتا ہوں " کار والے نے از راہِ ہمدردی کہا اور دروازہ کھول دیا ۔ وہ یوں بغیر تامل کے بیٹھ گئی جیسے زندگی سے تنگ آ کر کنوئیں میں کود گئی ہو ۔ پان والے کی دکان پر کھڑے ہوئے لوگوں نے ایکدم آوازے کسنے شروع کئے اور ایک نے بہ آوازِ بلند کہا ۔

" بھئی ہو گیا سودا " . . . . اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر کانوں کو نہ بند کر سکی ۔

" بدتمیز کہیں کے " کار والے نے زیرِ لب کہا اور تیزی سے کار آگے بڑھا لی ۔ وہ چپ چاپ سہمی سہمی سمٹی سمٹائی اس کے برابر میں بیٹھی رہی ۔ کار اُسے ترچھے موڑ کاٹ کر صبا ناما سے باہر نکل گئی اور کھلی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی . . . . . . وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی اجنبی کے ساتھ یوں کار میں بیٹھ گئی تھی مگر اس کا یہ اقدام ایسا ہی تھا جیسے خودکشی کا عمل ۔ تاہم اُسے اُمید کی ایک کرن سی نظر آئی تھی ۔ اور اُسے احساس ہو رہا تھا . . . کہ اس نے ایسا کر کے غلطی نہیں کی ہے بلکہ اپنے آپ کو ناقابلِ برداشت توہین اور ذلت سے بچا لیا ہے وہ الجھے الجھے خیالات میں کھوئی رہی اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی ۔

کار جب ایک طویل تنہا سڑک عبور کر کے کسی ریلوے پل کے نیچے سے گذری تو وہ بدک سی گئی اُسے اچانک احساس ہوا کہ وہ کسی غلط راستے پر جا رہی ہے ۔ اس نے ایک خائف نظر سے کار والے کو دیکھا اور جھجکتے ہوئے کہنے لگی ۔

" میرا خیال ہے آپ غلط راستے پر جا رہے ہیں "

وہ دور سڑک پر نگاہ قائم رکھتے ہوئے مسکرایا اور کندھے کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا ۔

" ہم دونوں غلط راستے پر جا رہے ہیں " وہ سٹیرنگ کو ہلکی سی جنبش دے کر لمحہ بھر کے لئے اس کی جانب مڑا ۔ اور پھر نگاہ سامنے سڑک پر قائم رکھتے ہوئے کہنے لگا ۔ " لیکن ہم دونوں مجبور ہیں اور اپنی اپنی صحیح منزل کی تلاش میں بھٹکے ہوئے ہیں ۔ مجھے مسرت کی تلاش ہے اور آپ کو دولت کی ۔ میں دولت سے

کر جنہیں میں مسرت کے حاصل کرتا ہوں اور آپ مسرت لٹا کر دولت پیدا کرتی ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ یا دوسرے معنوں میں ہمدرد" وہ گاڑی کو ہلکا سا موڑ دیتے ہوئے چپ ہو گیا اس وقت کار چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان ایک ویران سی سڑک پر کافی تیز رفتار سے دھول اڑاتی ہوئی جا رہی تھی۔

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھتے ہیں" وہ خوفزدہ لہجے میں بولی۔

"حالانکہ آپ نے اندرونی طور پر میری صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا ہو گا کہ میں آپ کو کتنا صحیح سمجھا ہوں" اس نے اس کی طرف دیکھ کر بغیر مسکرائے بے نیازی سے جواب دیا۔

"اُف میرے اللہ" اس کے منہ سے فریاد سی نکلی۔

"اللہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہم اپنے دھندوں میں ایسے گم گئے ہیں کہ اس کو بھلا ہی دیا ہے" وہ فلسفیانہ انداز سے کہنے لگا۔ اور وہ قطعی بے بس ہو کر پیچھے کی طرف سیٹ پر گر سی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ خود اپنی مرضی سے کار میں بیٹھی تھی۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر کئی لوگوں نے آوازے کسے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ اُسے اغوا کیا گیا ہے۔ اس نے چاہا کہ شور و غل مچائے لیکن ایسا کرنے سے بھی کچھ حاصل نہیں تھا۔ دور دور تک کسی راہگیر یا بستی کا کوئی نشان نہیں تھا اس نے ایک مرتبہ پھر اس کی منت سماجت کرتے ہوئے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھئے میں ایک شریف عورت ہوں" وہ رقت بھرے لہجے میں بولی

"مجھے یقین ہے" اس نے کار کی رفتار کو تھوڑا سا سست کر کے پھر تیز کر دیا۔

"یہ میرا تھیلا دیکھئے۔ اس میں ریڈی میڈ کپڑے ہیں جنہیں فروخت کرنے کے سلسلے میں بازار لائی تھی"

"یہ تھیلا میں نے اس چوک میں ہی آپ کے پاس دیکھ لیا تھا" وہ نہایت اعتماد سے بولا "ویسے یہ بہت محفوظ طریقہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں، کتابیں وغیرہ بغل میں رکھنے سے بہتر ہے کہ اس قسم کے تھیلے رکھے جائیں۔ یہ زیادہ ماڈرن ہے"

"میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ آپ مجھ پر رحم کیجئے میں بہت پریشان ہوں" اس نے گڑگڑا کر التجا کی۔ وہ جواباً اس کے کچھ اور قریب ہو گیا اور اسٹیرنگ سے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھے پر رکھ کر آہستہ سے دبا دیا۔ اور ہمدردانہ لہجے میں کہنے لگا۔

"یقین کیجئے میں آپ پر کوئی ظلم نہیں کروں گا میں کوئی درندہ نہیں ہوں انسان ہوں۔ اور انسان کے دکھ درد کو سمجھتا ہوں" اس نے ہاتھ اس کے کندھے سے ہٹا کر پھر اسٹیرنگ پر رکھ دیا۔ اور پھر کہنے لگا "آپ بہت گھبرائی ہوئی ہیں اور اس میدان میں بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کو یہ پیشہ نہایت عجیب اور ذلیل سا معلوم ہوتا ہو گا حالانکہ پیشہ کوئی ذلیل نہیں ہوتا بلکہ وہ حالات ذلیل ہوتے ہیں جو آدمی کو ایسا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کریں"

وہ اس کا جواب سن کر حواس باختہ سی ہو گئی اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اور ابھی اس نے رونا ہی شروع کیا تھا کہ کار دو ٹیلوں کے درمیان رک گئی۔

"بات کیا ہے؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ کچھ نہ بولی بدستور روتی رہی اور آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر ابھرے ابھرے سینے پر گرتے رہے۔

"دیکھئے میں جبر کا سخت مخالف ہوں" وہ پُر رعب آواز میں کہنے لگا "میں نے کبھی کسی پر سختی نہیں کی ہے اور نہ ہی اپنے اُوپر سختیوں کو برداشت کیا ہے۔ اگر آپ اتنی خائف ہو گئی ہیں تو آپ جا سکتی ہیں۔ لیجئے دروازہ کھلا ہے" اس نے ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ اس کی ہچکیاں تھم گئیں

وہ خاموشی سے کھلے ہوئے دروازے سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر حدِ نگاہ تک ٹیلے ہی ٹیلے نظر آ رہے تھے اور ان ٹیلوں کے پیچھے کیا تھا اُسے کچھ معلوم نہیں تھا پکی سڑک کو کار نے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اور کچی سڑک کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں اور کس طرف جا رہی ہے۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک خطرے سے بچ کر وہ ہزار خطروں کے مُنہ میں گھسنے کی کوشش کر رہی ہو لہٰذا وہ بے بس ہو کر ایک ہی خطرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اور دردمندانہ لہجے میں بولی۔

" آپ مجھے یہاں نہ اتاریئے۔ اگر آپ رحم کرنا چاہتے ہیں تو مجھے غریب کالونی چھوڑ آئیے "

اس نے ہاتھ بڑھا کر کار کا دروازہ پھر بند کر دیا اور کار اسٹارٹ کر دی " ناممکن ہے " وہ کہنے لگا " یہاں سے شکست خوردہ اور نامراد واپس جانا، ناممکن ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم آگے ہی آگے چلتے رہیں حتیٰ کہ ہماری گاڑی کا پٹرول ختم ہو جائے پھر کوئی عذر تو ہوگا ہمارے پاس " کار بڑی تیزی سے ٹیلوں کے درمیان کچے راستے پر دھول اڑاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ وہ تڑپ کے رہ گئی اُسے ہر لمحہ کسی آنے والی تباہی کا پیش خیمہ معلوم ہونے لگا وہ اپنے آپ کو کسی مکڑی کے جالے کے درمیان محسوس کرنے لگی۔ کتنی دیر تک اسی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ایک ہلکا سا مصالحانہ خیال اس کے دل کے کسی کونے سے ابھرا اور ہونٹوں سے پھسل گیا۔

" آپ کیا چاہتے ہیں؟"

" آپ جانتی ہیں " وہ زیرِ لب مسکرا کر بولا۔ " وضاحت کرنا ضروری نہیں آپ فقط رضامندی کا اظہار کر دیجئے ہم دونوں کے مسائل حل ہو جائیں گے " وہ خاموشی سے سنتی رہی گم سم جیسے کسی گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو۔

" بولیے ..... " وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر اپنے دل کی دھڑکن کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی پھر جیسے اچانک ہتھیار ڈال دیئے۔ پرنم آنکھوں سے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور صبر و استقلال عزت و آبرو اور نسوانی غرور کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

" مجھے جلدی گھر پہنچا دیجئے گا " وہ رقت بھرے لہجے میں اقرار کرتے ہوئے بولی اور نظریں جھکا دیں۔

" گڈ گرل " اس نے اپنی فتحیابی پر مسرت کا نعرہ لگایا۔ اور کار کو چند قدم آگے بڑھا کر بائیں طرف سڑک سے نیچے ڈھلوان پر اتار دیا اور تھوڑے سے نشیب و فراز طے کرنے کے بعد کار ایک ٹیلے کے پیچھے چھپ گئی اور دھول اڑاتی کچی سڑک کے سناٹے اور ویرانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

دن کا پچھلا پہر تھا جو کار ٹیلے کے پیچھے سے پھر نمودار ہوئی اور مختلف سے نشیب و فراز طے کر کے کچی سڑک پر آ گئی اور پہلے کی طرح دھول اڑاتی ہوئی واپس شہر کی طرف روانہ ہو گئی وہ حسبِ معمول اس کے برابر میں بیٹھی تھی مگر اب اس پر خوف و دہشت کی بجائے ندامت کا احساس طاری تھا۔ اس کے بال جو کچھ دیر پہلے سلیقے سے سنورے ہوئے تھے اب بے ترتیبی سے اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے اور وہ آنکھیں بند کئے سیٹ سے ٹیک لگائے مردہ جاں سی پڑی تھی۔ وہ راستے بھر بدستور بے سدھ پڑی رہی اور کتنی ہی طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب اس کے کان میں ریل کے انجن کی سیٹی گونجی تو اس نے تھکان سے بوجھل آنکھیں کھول کر باہر کی طرف دیکھا۔ کار ریلوے پُل کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں سے بھرا ہوا اپنا تھیلا درست کیا بالوں کو سنوار کر باندھا اور گردن جھکائے آگے کی طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد کار صدر کے گنجان علاقے سے الٹے سیدھے موڑ طے کرتی ہوئی گزر رہی تھی اور وہ چھپ چھپا کر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ کوئی اُسے کار میں دیکھ نہ لے مگر کار اچانک اس چوک پر آ کر رک گئی جہاں سے وہ سوار ہوئی تھی۔ چوک اسی طرح راہگیروں سے پٹا مصروف کار تھا اور پان والے کی دکان پر اب بھی کچھ نوجوان اوباشوں کا مجمع لگا ہوا تھا اور سب کی نگاہیں کار میں اس کی طرف اُٹھ گئیں تھیں۔ کار والے نے ہاتھ آگے بڑھا کر کار کا دروازہ کھول دیا اور دبے دبے لہجے میں بولا۔

"اُتر یئے"

"نہیں نہیں" اس نے روندھی ہوئی کھوکھلی آواز میں کہا۔ "مجھے یہاں نہ اتاریئے آپ نے غریب کالونی لے جانے کا وعدہ کیا تھا"

"ایک بات بتاؤں" وہ معنی خیز انداز سے اُس کے چہرے کے قریب لے جاتے ہوئے بولا۔ "میں نے اپنے چند اصول وضع کر رکھے ہیں اور ان میں ایک یہ بھی ہے کہ میں اڈے پر کبھی نہیں جاتا۔ اب آپ تشریف لیجائیے اور پھر کسی رکشہ کا انتظار کیجئے۔ ابھی وقت بہت ہے ہو سکتا ہے کوئی سواری مِل جائے"

اس نے ڈھٹائی سے مُسکراتے ہوئے دروازہ مزید کھول دیا۔ اور وہ یوں نیچے اُتر آئی جیسے کسی نے دھکیل کر گرا دیا ہو۔ اس کے اُترتے ہی ایک ساتھ کئی راہگیروں کی نگاہیں اس پر اُٹھ گئیں اور کئی ایک اپنی چال ہی بھول گئے۔ اور پان والے کی دکان سے ایک شخص نے احمقانہ طریقے سے بڑے زور کی سیٹی بجائی۔ اس نے بڑی مشکل سے لڑکھڑاتے قدموں کو سنبھالا ضبط کے دامن کو ایک بار پھر اپنی گرفت میں لیا اور بجلی کے کھمبے کا سہارا لے کر پھر کسی رکشہ کا انتظار کرنے لگی۔ خالی رکشہ کا تو بدستور کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ البتہ یکطرفہ کاریں قطار اندر قطار دوڑ رہی تھیں اچانک ایک بہت خوبصورت آسمانی رنگ کی کار اپنی قطار سے الگ ہو کر عین اس کے قریب آ کر رک گئی۔ کار چلانے والے نے تھوڑا سا کھڑکی کے قریب کیا۔ اور چہرے پہ سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے نہایت مہذب طریقے سے پوچھا۔

"آپ کافی دیر سے یہاں کھڑی ہیں آپ کو کہاں جانا ہے"

○ میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے فرانسیسی خوشبوئیات کی بیس ہزار بوتلوں میں ایک ایسی لڑکی کو غسل کرایا تھا جس کے لئے اس کے دل میں محبت نہیں تھی بلکہ صرف ہوس تھی۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ اگر اس نے اس کی نصف رقم "گلڈ" پر خرچ کی ہوتی تو پورا ملک شعر و نثر کی خوشبوؤں سے اور بھی مہکتا ہوتا" ——— قدرت اللہ شہاب

وقار بن الٰہی

جنازے

آنگن سے بالکل پرے بڑے کمرے کے ساتھ چھوٹی سی کوٹھڑی کے بوسیدہ دروازے پر جب بھی میری نگاہیں جا گڑی ہیں اور میں نے اُس دروازے کو بند پایا ہے تو ویدی تم مجھے شدت سے یاد آئی ہو۔ یوں تو ہر وقت یاد آتی ہو۔ کیا ایسا کون سا لمحہ ہے جو ایسی دھب میں تمہیں یاد نہیں کرتی لیکن اس دروازے کو دیکھ کے اور تمہیں یاد کر کے جب میرے اندر ایک سناٹا سا چھا جاتا ہے۔ تو میں بالکل پاگل ہو جاتی ہوں اور انسان اُسی وقت پاگل ہوتا ہے نا جب ایک شدید طوفان کے بعد اُس کے ذہن اور دل پر سناٹا طاری ہو جائے۔ وہ بہت کچھ سوچ رہا ہو اور جیسے کچھ بھی نہ سوچ رہا ہو۔ میری بھی ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے لیکن میں سوچتی ہوں تم صرف اس قدر ہو کہ — میری ماں نے مجھے گود میں لے کے اپنی ہاتھوں سے زندگی کا امرت پلانے کی بجائے میرا گلا گھونٹ دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ لیکن ماں گلا گھونٹ دیتی تو ویدی! یہ ہنستی مسکراتی زندگی ہمیں کیسے ملتے، وہ سامنے کا ننھا سا کمرہ کیوں کر آباد ہوتا۔ تمہاری مسرت تمہیں کہاں ملتی اور بڑی بات یہ کہ اتنے بڑے اور قہقہوں سے گونجتے گھر میں یہ ویرانی کیوں کر پھیل سکتی ——؛

تم اِن بندھنوں کو توڑ کے اِن حدوں کو پھلانگ کے بہت دور چلی گئی ہو۔ اتنی دُور کہ ایڑیاں اٹھا کے منڈیر پر سے جب میں نے جھانک کے دیکھا تو مجھے آسمان اور زمین ہی ایک دوسرے سے بغل گیر ہوتے دکھائی دیئے لیکن تم کہیں نظر نہیں آئی ہو تم نے اچھا ہی کیا جو چلی گئیں، لیکن میری ویدی! تم نے مجھے نہیں بتایا کہ آخر کس جرم کی پاداش میں تم مجھے یہاں چھوڑ گئی ہو۔ جہاں میں جینا چاہتی ہوں تو زندگی منہ چڑاتی ہے اور مرنا چاہتی ہوں تو بزدلی ہاتھ تھام لیتی ہے۔ اور جب میں اس زندگی اور موت دونوں سے مایوس ہو کے، تھک کے، آنکھیں بند کر لیتی ہوں تو لگتا ہے جیسے آنگن کے درمیان کھڑی ہوں اور کسی نے میرا آنچل میرے سر سے اُتار لیا ہے۔

سچ اُن دنوں یہ گھر اتنا ویران تو نہیں ہوا تھا۔ اُن دنوں بھی سے ہی سہی پھر بھی کبھی نہ کبھی کوئی قہقہہ، کوئی ہنسی یا بوڑھے باپ کی کھانسی کی آواز ہی سنائی دے جاتی تھی۔ اُن دنوں تو ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں صوفے اور قالین بچھے رہتے تھے۔ جن پر سارا دن شطرنج کے مہرے بکھرے رہتے اور کہیں کہیں باپ کی داڑھی کے سفید اور لمبے بال بھی مل جاتے تھے۔ اُن دنوں تو گول کمرے کے ساتھ چھوٹے کمرے میں جاوید رہا کرتا تھا جس کے کپڑے کتابوں کی الماری میں اور کتابیں چارپائی اور صندوق میں بکھری رہتی تھیں۔ پھر رسوئی سے پرے بڑے کمرے میں بوڑھی ماں کی رعب دار آواز ابھرتی رہتی تھی۔ وہ آواز جو بیٹی کے زیوروں، کپڑوں اور جہیز کا حساب کرتے کرتے اچانک بند ہو گئی ہے۔ اور جہاں باپ رات بھر کھانستا رہتا تھا اور کھانسی اُسے سونے نہ دیتی تھی۔ لیکن ویدی! نیند تو اُس کی آنکھوں سے یوں چھن گئی تھی کہ گھر میں اُس نے دو جنازے جو سنبھال رکھے تھے اور یہ جنازے جب تک اُس کے آنگن سے نہ اُٹھ جاتے اُس کی کھانسی کیوں کر ختم ہو سکتی تھی۔ اُس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھیں کیوں کر بند ہو سکتی تھیں۔ پھر چھوٹا سا ایک کمرہ اِدھر تھا جس میں تمہاری سرتو رہا کرتی تھی۔ میرے

کمرے میں مہدی! تمہیں پھول دیکھنے کی آرزو ہوتی تھی۔ کاش! تم آج آ کے دیکھ سکتیں کہ اب تو وہاں خزاں میں باغ کی روشوں پر بھاگتی ہوئی پاگل دھول بھی نہیں ہے۔ مکان کے سارے کمرے اسی طرح ہیں۔ ان میں سامان کچھ بڑھ گیا ہے، کمی نہیں ہوئی۔ ہر چیز یہاں اسی طرح رکھی ہے۔ سرتو بھی یہیں ہے، جاوید جا بھی کہاں سکتا ہے۔ لیکن آخر یہ کس طرح ہو گیا کہ جاوید اور سرتو کے کمرے ہل کے ایک کمرے میں سما گئے ہیں اور تم بوڑھی ماں، بوڑھا باپ جنازے اٹھاتے ہی یہاں سے رخصت ہو گئی ہو ـــ یہ کیوں ہوا! کس طرح ہوا دیدی ـــ!

ہمارے لئے تو سبھی دن برابر تھے۔ صبح سویرے اُٹھ کے سکول جاتیں اور شام واپس آجاتی تھیں لیکن ـــ بعض دن ایسے بھی ہوتے ہیں نا کہ جو خود تو گذر جاتے ہیں مگر دلوں پہ اتنے گہرے زخم چھوڑ جاتے ہیں کہ وہ کسی طور مندمل ہونے میں نہیں آتے۔ تمہیں وہ شام ضرور یاد ہو گی دیدی! جب ہم سکول سے آرہی تھیں اور تم نے اپنی کتابیں مجھے دے رکھی تھیں۔ تم نے سکول کا کام نہ کیا تھا اور چوتھے گھنٹے میں مس بٹ نے اتنے بید مارے تھے کہ تمہاری ہتھیلیوں پر نیل پڑ گئے تھے۔ تم سے کتابیں نہ سنبھالی جاتی تھیں۔ شاید تم بعد میں روئی بھی تھیں، جبھی تو تمہاری آنکھیں بھی سوج گئی تھیں۔ ہم دونوں فٹ پاتھ پر ایک ساتھ چل رہی تھیں۔ تم نے مار کھا کے اپنا غصہ اُتارنے کا بہانہ باتوں میں تلاش کر لیا تھا۔ تمہاری باتوں میں کوسنے اور گالیوں کے سوا تھا ہی کیا! وہ پہلا دن تھا نا دیدی! جب ابا کے خلاف تمہارے دل میں بغاوت نے جنم لیا تھا۔ تمہارا خیال تھا کہ پڑھائی میں رکھا ہی کیا ہے۔ پھر تم یکسوئی سے پڑھائی کرو یا گھر کے کام ـــ چلتے چلتے تم نے کس قدر تیز لہجے اور کانپتی آواز میں کہا تھا۔

"سرتو میرا بس چلے تو کل سے ہی سکول آنا چھوڑ دوں۔ کون ہر روز مار کھائے۔ اور پھر دوسری لڑکیاں بھی تو اتنی بُری باتیں کرتی ہیں۔ کہ سُن کے کان بھی شرما جاتے ہیں۔ دیکھو نا سرتو۔ مجھے پڑھ کے لینا بھی کیا ہے۔ زندگی بھر چولہا ہی تو جھونکنا ہے۔ یہ الف، ب اور الف، جیم، ب کی دو ہمارے کس کام آئے گی۔ پر ابا کو کون سمجھائے۔ وہ تو مجھے جیسے بڑھاپے کی لاٹھی سمجھ بیٹھے ہیں ـــ"

تمہیں دیدی انہوں نے لاٹھی سمجھا تھا یا نہیں، بڑا بیٹا ضرور مان لیا تھا۔ اُن کی کتنی بڑی حسرت تھی کہ ہمارا بھی کوئی بھائی ہوتا۔ جو اُن کا نام زندہ رکھتا، اُن کی مکانوں کا وارث بنتا۔ جو اُن کے ساتھ شہر جاتا تو وہ دوستوں سے اُس کا تعارف کرا کے خوشی سے سینہ پھلا لیتے۔ لیکن بھائی نہیں تھا تو انہوں نے اپنی ساری اُمیدیں تمہیں سے وابستہ کر لی تھیں۔ جس کا مطلب تم نے لاٹھی لے لیا۔ تم یہاں ہوتیں تو تمہیں پتہ چلتا کہ لاٹھی کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ وہ تو لاٹھی کا سہارا لینے سے پہلے ہی چل بسے تھے۔ جب اُن کی کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ تو پھر وہ کسی کا سہارا کیوں کر لیتے۔

گھر سے تھوڑی دُور تم نے مس بٹ کو دو چار اور گالیاں دی تھیں اور یوں اپنے دل کی بھڑاس نکال لی تھی۔ ہم دونوں دروازے کا بھاری ٹاٹ اُٹھا کے ڈیوڑھی کی اونچی نیچی اینٹوں پر ٹپ ٹاپ کا شور مچاتی اندر چلی گئیں۔ آنگن میں کوئی نہ تھا، البتہ بڑے کمرے میں سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ تم نے اپنا برقع اتار کر میرے کندھوں پہ پھینک دیا اور خود سیدھی رسوئی میں چلی گئیں۔ پھر جب کتابیں اور بستہ کمرے میں پھینک کے میں بھی تمہارے پاس آ بیٹھی اور ہم نے دوپہر کی باسی روٹی کے دو چار لقمے توڑے تو اچانک ماں کی آواز ہوئی کی دہلیز پھلانگ کے چلی آئی۔

"یہ کہاں کی شرافت ہے سرتو۔ سکول سے آ کے منہ تو دھلایا کرو۔ یہاں آؤ تو، تمہارا بھائی آیا ہے۔" ہم دونوں کے جبڑے اپنی جگہ رُک سے گئے۔ دونوں نے ایک ساتھ نگاہیں اُٹھا کے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ ہمارا بھائی کہاں سے ٹپک پڑا؟ اس بھائی کی صورت میں

ان سے پہلے تو کبھی دکھائی نہ دی۔ پھر لو ـــ ہمارے جیجے پھر چلنے لگے اور منہ صاف کر کے ہاتھ پونچھتی ہوئیں ہم دونوں آگے پیچھے بڑے کمرے میں چلی گئیں۔ ابا بڑے پلنگ پہ نیم دراز تھے لگ ان کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی بے نور تھیں۔ اُن کے چہرے کی جھریوں میں جیسے اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ حقے کی نے منہ میں دبائے لبوں کو سختی سے بند کئے وہ خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ ماں دوسری چارپائی پہ بیٹھی تھیں۔ البتہ ان کے چہرے پر پہلے سے کہیں زیادہ شگفتگی تھی۔ ان کے پاس ہی پائنتی پر جاوید بوکھلایا ہوا بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کے وہ اور بھی بوکھلا گیا۔ اُسے کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کہ ہمارے سلام کا جواب ہاتھ سے دے۔ بغل گیر ہو جائے یا معانقہ کرے۔ تم دیدی صرف مسکرا دی تھیں۔ جاوید بھی بڑی شرمیلی سی مسکراہٹ ہی دکھا سکا۔ البتہ میں کھلکھلا کے ہنس دی تھی۔ یہ جاوید تو خالہ کا لڑکا ہے۔ ہمارا بھائی کس طرح ہو گیا۔ مانا کہ خالہ کے بیٹے بھی بھائی ہوتے ہیں لیکن اپنے تو نہیں ـــ ہم بیٹھ گئیں تو ماں نے ابا کی طرف دیکھتے ہوئے آدھی ہنسی اور آدھی متانت سے کہا۔

"میں نہ کہتی تھی، میری بہن کا دل سمندر سے بھی بڑا ہے۔ دیکھو تو اپنی اولاد کو کوئی یوں جدا کرتا ہے لیکن اُس کی محبت کو اس نے بھی سہہ لیا۔ میرے کہنے کی دیر تھی کہ اس نے جاوید کو بھیج دیا۔" ابا منہ سے نہیں بولے حقے کی نے منہ سے نکال کر ذرا سا مسکرائے اور پھر سے ڈوب گئے۔

واقعی دیدی! خالہ نے ہمارے لئے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ کہ اپنی فوج سے ایک سپاہی کو ہمارے پاس بھیج دیا تاکہ ماں جب اسے پوتا دیکھیں تو ان کے دل میں جو انگارے دہک رہے ہیں، وہ بجھ جائیں اور ابا کو یہ احساس دیمک کی طرح نہ چاٹ جائے کہ ان کے بیٹا نہیں ہے۔ حالانکہ دیدی! جانتی تو تم بھی تھیں کہ ماں کے کہنے کے باوجود خالہ نے پہلے کتنی ہی مرتبہ اس بات کو ٹھکرا دیا تھا۔ لیکن اب جاوید آ گیا تھا تو اس لئے کہ خالو ایک دفتر میں کلرک ہی تو تھے۔ وہ بیٹے کی تعلیم کا بار نہ اٹھا سکتے تھے۔ اور ادھر ابا کے پاس اتنا ضرور تھا کہ اُسے اچھی تعلیم ضرور دلا سکتے تھے۔ میں نے چند دن بعد تم سے کہا تھا کہ یہ انسان اتنا لالچی کیوں ہے کہ اندھا ہو کے اپنوں کو بھی دھوکا دے جاتا ہے۔ پر آج دیدی! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے مکر و فریب کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ ہماری زندگیوں کا مقصد ہی یہی ہے کہ ایک دوسرے کو دھوکا دیں۔ جہاں تک ہو سکے اپنی غرض کے لئے اور سب کو الو بناتے چلے جائیں اور پھر جب وقت آئے تو اس دنیا سے سب کچھ پیچھے چھوڑ کے چپ چاپ چل دیں۔

ہم نے وہی ڈرائنگ روم کے ساتھ والا چھوٹا سا کمرہ جاوید کو دے دیا تھا۔ جہاں وہ اُس شام سے ہی بند ہو گیا تھا۔ جہاں اُس نے چارپائی ڈال کے ٹین کا بکس پائنتی کی طرف رکھ لیا تھا۔ اور سرہانے سلور کی وہ دیگچی جس میں وہ گاؤں سے خالص گھی لایا۔ سچ دیدی! یہ خالص گھی کھانے والوں کے دلوں میں کھوٹ آخر کہاں سے آ جاتا ہے۔ ابا دو چار دن اس خیال سے نڈھال رہے تھے کہ ان کا اپنا بیٹا کیوں نہیں ہے لیکن پھر جیسے انہوں نے حالات کو سینے سے لگایا اور جاوید کے ساتھ ایسے گھل مل گئے۔ اس کی معمولی سی معمولی خواہش کا بھی اس قدر خیال رکھنے لگے۔ جیسے ان کا اپنا ہی بیٹا ہو ـــ جاوید شروع شروع میں کس قدر گھٹا گھٹا سا شرمایا شرمایا سا رہتا تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کے ڈیوڑھی تک آنگن کو پار کرنا اس کے لئے قیامت سے کم نہ ہوتا تھا۔ اس خیال سے اُس کا چہرہ تمتما اٹھتا تھا کہ جب وہ آنگن میں سے گذرے گا تو سامنے چار بڑی بڑی آنکھیں اُس کا تعاقب کر رہی ہوں گی۔

لیکن دیدی مجھے تو اس سے پہلے ہی نفرت تھی پتہ نہیں کیوں، وہ مجھے بدھو دکھائی دیتا تھا۔ اس سے پہلے بھی تو ہم نے اسے دیکھا تھا۔ شاید اُس کی بڑی بہن کی شادی تھی اور سارے گھر میں وہ اس طرح گھوما کرتا تھا جیسے گائے کا بچھڑا اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہو ـــ لیکن یہاں آ کے تو ری

نفرت اور بھی شدید ہو گئی تھی۔ اُس کے گنگنانے یا اونچی آواز میں پڑھنے کا دبا دبا سا شور باہر آتا تو میرا بس نہ چلتا تھا کہ اُسے کچا کھا جاؤں۔ ایک دن کہا تھا میں نے ـــ "دیدی۔ یہ جاوید بھائی کو کسی نے اتنا بھی نہیں بتایا کہ پرائے گھر میں کس طرح رہا جاتا ہے۔" اور تم نے جواب دیا تھا۔

"ایسا نہیں کہا کرتے سرتو۔ یہ گھر اُس کا اپنا ہی تو ہے ہم کوئی غیر تو نہیں۔ ہمارا تو وہ بھائی ہے۔" اور میں بوکھلا گئی تھی۔ غصے سے پاگل ہوئی تھی۔

"یہ ہمارا بھائی کیسے ہوا دیدی۔ تم بھی حد کرتی ہو۔ ہمارا بھائی اتنا بدتمیز ہوتا تو چانٹے مار مار کے اُس کا چہرہ لال کر دیتی ـــ"

یہ نفرت میرے دل سے کبھی نہ گئی۔ لیکن وقت کتنا ظالم ہے کہ پل میں بدل جاتا ہے۔ کبھی وہ مجھے اُسے چانٹے مارنے پہ اکساتا تھا آج اس بات کا سبق دیتا ہے کہ میں اُس کی عبادت کروں۔ اُس کے پاؤں کی خاک اپنی مانگ میں بھر لوں ـــ لیکن کتنا بے بس ہے وقت کہ میرے دل سے وہ نفرت نہیں دھو سکا ـــ

ابتدا میں پتہ نہیں کیوں دیدی! تمہیں اُس سے کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی۔ تم نے مجھے جھڑک دیا تھا لیکن پھر اکثر تم خود اُس کی احمقوں جیسی حرکتوں پہ ہنسی دکھلا دیں۔ ہم دونوں مل کے اُس کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ اُس کی کتابوں کی جلدیں پھاڑ دیتی تھیں۔ تم ترکاری میں سہاگہ ڈال دیتیں۔ اور میں کپڑے میں ریت۔ لیکن وہ عجیب شخص تھا کہ ریت کھا جاتا لیکن منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالتا۔ یوں بھی ایک برس تک تو وہ اس قدر خاموش اور اجنبی رہا تھا جیسے اس گھر سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سچ دیدی! وہ اس طرح بھولا اور معصوم بن کے رہتا۔ تو میں آج اُسے اپنا خدا مان کے اُس کی عبادت کرتی۔ اُسے اپنا دیوتا سمجھ کے اُس کی پوجا کرتی۔ لیکن وہ بدل گیا تھا اور شاید اس لئے میں دعا کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاتی ہوں تو بددعا نکل جاتی ہے۔ اُسے دیوتا ماننا چاہتی ہوں تو جانے کیوں جی چاہتا ہے جھٹ اُس کے منہ پر تھوک دوں۔

چھٹیاں گزار کے جب وہ پھر واپس آیا تو ـــ سر سے پاؤں تک بدل گیا تھا وسٹرڈ کی نئی پتلون تھی اور اس پہ سبز رنگ کا بلیزر جس پہ اُس کے کالج کا کلر بنا ہوا تھا۔ لال رنگ کی ٹائی۔ کچھ کپڑے اور بھی تھے۔ بستر کی چادریں بھی تھیں۔ تھوڑا سا گھی بھی تھا جو اُس نے آتے ہی ماں کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک پوٹلی میں تمباکو تھا جو ابا کے لئے لایا تھا۔ اور کچھ چنوں کے بھننے دانے اور گڑ ـــ جو وہ جانے کس کے لئے لایا تھا۔ لیکن وہ رات ہوتے ہی ہمیں اپنے کمرے میں لے گیا اور صندوق کھول کے سب کچھ ہمارے سامنے ڈھیر کر دیا۔

اُس کے کمرے سے نکل کے ہم نے اُس کا کتنا مذاق اڑایا تھا۔ اُسے ہم نے نئے نئے خطاب دیئے تھے۔ نئے سے نئے نام رکھے تھے لیکن اُس دن ہمیں کیا ہو گیا تھا دیدی! جب وہ پہلی بار وسٹرڈ کی پتلون اور بلیزر پہن کے ٹائی کی ناٹ سختی سے باندھے کالج جانے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ تو ہم دونوں گنگ رہ گئی تھیں۔ دونوں بہنیں اس طرح ڈوب گئی تھیں۔ جیسے کوئی ایسا منظر دیکھ لیا ہو جو ـــ انسان خواب ہی میں دیکھ سکتا ہے۔ میرے لہجے میں ذرا ذرا سی طنز تھی۔

"ارے دیدی ـــ یہ جاوید ہے ـــ" اور تم نے کہا تھا "ہاں سرتو۔ آج تو ـــ" تمہاری حیرت مجھ سے زیادہ تھی دیدی۔ اُس دن ہم سکول جانے کے لئے گھر سے نکلیں تو ہمیں یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ گھر سے سکول جا رہی ہیں۔ ہمیں تو جاوید یاد تھا۔ میں اُس پر طنز یہ جملے کس رہی تھی اور تم دیدی ـــ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ ہوں ہاں کے سوا جواب ملتا ہی نہ تھا۔

لیکن کتنی اچھی بات تھی۔ جو وہ باہر سے بدل کے اندر سے نہ بدلتا۔ اب تو لگتا تھا۔ جیسے وہ ایک برس ایک خول میں چھپا رہا ہو اور اب یہ خول وہ گھر ہی میں چھوڑ آیا ہو۔ اُس کی عادتوں، اس کی بات چیت اور اس کی نگاہوں میں بے باکی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ گھر میں ہوتا تو کیا مجال جو نچلا بیٹھ جائے۔ چیزوں کو الٹنا پلٹنا اُس کی عادت بن گئی تھی۔ تم دیدی ـــ صبح سکول جانے سے پیشتر اُس کے کمرے کو صاف

ترتیں اُس کے کپڑے اور کتابیں ترتیب سے رکھتیں اور جب تم واپس آتیں تو وہ کالج سے آکے اپنے کمرے کا حلیہ پھر سے بگاڑ چکا ہوتا۔ اپنی چمکتی آنکھوں اور جھکا یا چہرہ لئے ماں سے شکایت کر رہا ہوتا۔ تم ویدی! جانے کس طرح ماں کی باتیں سن لیا کرتی تھیں۔ تم نے کبھی بھولے سے بھی تو جواب نہیں دیا۔ وہ دبی دبی سی مسکراہٹ لئے چلا جاتا تو میں تم سے کتنا لڑتی تھی۔ پر تمہارا تو ہر روز ایک ہی جواب ہوا کرتا تھا۔

"وہ گھر سے دور آیا ہوا ہے نا سرتو۔ یوں مذاق نہ کہے تو پھر اُن کے دن کیوں کر گذریں۔ پگلی تو ہمیشہ اس کے خلاف ہی بولتی ہے۔ کبھی تو اُس کی حمایت میں بولا کر۔" تمہاری باتوں سے تنگ آ کے جب میں نے ایک روز ماں سے شکایت کی تھی اُس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا اور ہنس کے کہا۔ "واہ۔ اس میں برائی کیا ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہی تو ہے۔ تم سے مذاق نہ کرے تو پھر ——" ماں بھی پاگل ہو گئی تھی۔ اُسے دن بتاتا کہ بہی بھلائی جب سانپ بن کے ڈس لیتے ہیں اور اُن کا زہر شریانوں میں دوڑنے لگتا ہے تو پھر —— تو پھر زندگی ملتی ہے نہ موت میں نے اُس رات سوتے ہوئے تمہیں بہت کوسا تھا ویدی! ایسی بھی کیا بہن ہوئی جو اپنی سرتو کا ساتھ چھوڑ کے ایک اُلّو کا ساتھ دینے لگ جائے۔

اُس ایک برس میں مجھے آج بھی یاد ہے کہ جاوید اتنا ضرور گھل مل گیا تھا کہ بلا جھجک بات اُسے کہنی ہوتی وہ ماں اور ابّا سے کہہ دیا کرتا تھا۔ گو اُس کی یہ باتیں زیادہ تر ایسی ہوتی تھیں کہ جن کو سن کے ہماری شامت آجاتی۔ لیکن جانے اُس کے لہجے میں کون سا جادو تھا۔ کہ ماں یا ابا فوراً ہی مان جاتے تھے۔ پھر وہ بلا جھجک ہمارے کمروں میں گھس آتا تھا اور جو چیز اُس کا جی چاہتا' پوچھے بغیر اُٹھا لے جاتا تھا تمہیں وہ کتنا تنگ کیا کرتا تھا۔ حالانکہ تم اُس سے ایک برس بڑی بھی تھیں اور پھر تم نے اُسے کبھی اتنی اہمیت بھی نہ دی تھی۔ لیکن پھر بھی ہم سے مذاق اور اُس کی شرارتوں کا نشانہ تو تم ہی بنا کرتی تھیں نا۔ اُس ایک برس میں ابا کو جب بھی وقت ملتا' وہ ہمیں اپنے پاس بُلا کے نصیحتیں کرنے لگتے۔ کہ جاوید تمہارا بھائی ہے۔ اُس کا خیال رکھا کرو۔ اُسے کوئی تکلیف ہوئی تو تمہاری خالہ زندہ نہ چھوڑے گی —— ماں دن بھر میں پوچھتی کہ آج جاوید کے لئے کیا پکا ہے اور اُسے کھانے کو کیا دیا ہے۔ اُس نے کتنا کھایا ہے۔ صبح وہ جب کالج گیا گیا تھا یا جب لوٹ کے آیا تھا تو اُس کا چہرہ بشاش تھا۔ یا اُس کی طبیعت علیل تھی —— اور تم باجی کتنی ہمت۔ کتنے اطمینان سے یہ ساری باتیں سنتی تھیں' یہ سب کچھ کرتی تھیں —— اور میں تو جاوید کو ایسا بھوت سمجھے ہوئی تھی کہ جس سے کسی صورت پیچھا نہ چھوٹ رہا ہو ——

امتحان دینے کے بعد ویدی! تم ہی نہیں' مجھے بھی پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ جاوید چلا جاتا ہے تو ہمارے گھر میں خاموشی کتنی گہری ہو جاتی ہے۔ اُس کے ہوتے ہوئے گھر کی یہ دیواریں کس قدر بھلی لگتی ہیں۔ لیکن وہ چلا جاتا ہے۔ تو کتنی وحشت ٹپکتی ہے ان دیواروں اور اس تنہا اُجڑے اجڑے کمرے سے۔ تم نے ہی کہا تھا نا ویدی "اس بار جیدی واپس آئے تو اُس سے پہلے نہ جانے کی قسم لیں گے اور پھر گھر میں رہنے دیں گے ——" وہ شاید پہلا موقع تھا ویدی۔ جب میں تمہاری بات سن کے خاموش رہ گئی تھی۔ حالانکہ اگر تم نے پہلے کہا ہوتا تو میں شاید تم سے الجھ بھی پڑتی —— پھر اس ویرانی میں اضافہ یوں ہو گیا تھا کہ جیدی ہی نہیں ہم دونوں نے بھی امتحان دے رکھے تھے۔ وہ سکول جا کے تھوڑی دیر گھوم پھر لیتے' اِدھر اُدھر کی ہانک لینے کا بہانہ بھی تو نہ رہا تھا۔ ابا الگ چپ رہتے تھے اور کبھی کبھی وہ اس بُری طرح کھو جاتے کہ ماں سے دنوں بات نہ کرتے۔ ایسی صورت میں ہم دونوں بھی جیسے ایک دوسرے سے خائف رہا کرتی تھیں۔ چلتے ہوئے اپنے سائے سے

بھی ڈر لگ جاتا تھا اور منہ پھیرے سوئی اور اپنے کمرے کے چکر کاٹتی رہتیں پر جانے کیوں تمہاری نگاہیں جب بھی جاوید کے کمرے کی طرف اُٹھ جاتی تھیں تو مجھے لگتا تھا تم ابھی بے ہوش ہو کے اینٹوں کے اونچے نیچے فرش پر گر جاؤ گی اور ـــــ

ہم نے اپنی بھابی کی صورت نہیں دیکھی تھی ناں۔ اس لئے ہم اُن دنوں اتنی اداس رہا کرتی تھیں۔ میں تو خیر پھر نئی نئی شرارتیں سوچا کرتی تھی کہ اس بار جاوید لوٹ کے آیا تو اُسے کیوں کر اُلو بناؤں گی۔ میرا رات بھر یہی مشغلہ ہوتا تھا۔ لیکن ویدی تم ـــــ تمہیں کیا ہو گیا تھا ویدی۔ تمہاری نگاہوں میں یہ اداسی سرد لاشیں بن کے کیوں لیٹ گئی تھی، تمہارے رخسار کیوں مرجھا جاتے تھے۔ اور رات جب ابا، ماں اور میں چھت پر سونے چلے جاتے تو تم دیر تک اپنے کمرے میں کیا کرتی رہتی تھیں۔ ایک بار میں نے پوچھا تو تم نے کتنی گھبراہٹ سے جواب دیا تھا۔

"پڑھتی رہتی ہوں۔ تم پتہ نہیں ان دنوں ...... بکواس کیوں سوچنے لگی ہو۔!"

لیکن ویدی۔ میں بکواس اس لئے سوچتی تھی کہ تمہارا امتحان تو ہو چکا تھا اور خدا خدا کر کے تمہیں جیومیٹری اور انگریزی سے نجات ملی تھی۔ پھر تم کیا پڑھتی رہتی تھیں۔ اس کے بعد بھی کئی راتیں میں نے یہی دیکھا تھا کہ سب سو گئے ہیں، رات آدھی جا چکی ہے۔ لیکن تم اپنے کمرے میں روشنی کئے جانے کیا کر رہی ہو۔

چھٹیوں کے ختم ہونے سے چند ہی دن پہلے کتنی عجیب بات ہوئی کہ آنگن کے سامنے اور تمہارے کمرے کے بالکل ساتھ میرے کمرے میں بھی بتی جل رہی تھی۔ ماں، ابا اوپر سو رہے تھے اور تم ویدی، بہت پہلے آ کے بتی جلائے کچھ پڑھنے لگی تھیں۔ پر اُس روز دوپہر میں تمہارے کمرے سے ایک کتاب چرا لائی تھی۔ یہ کتابیں تم اپنی انجم کے ہاتھ منگوایا کرتی تھیں اور پھر جس انہماک کے ساتھ تم انہیں پڑھتیں، میرے دل میں بھی کھُد بُد سی ہوئی کہ دیکھوں تو سہی، ویدی کیا پڑھتی ہے۔ کتاب میں نے دوپہر ہی اُڑا لی تھی اور رات دبے پاؤں آ کے اُسے کھول کے پڑھنا شروع کر دیا۔ اب مجھے یاد نہیں وہ کتاب کون سی تھی، اب تو اپنی زندگی بھی ایک کتاب سے کسی طرح کم نہیں۔ ایسی جو اُس کتاب سے بھی بھیانک ہے اتنا یاد ہے کہ پڑھتے ہوئے میرے سانس تیز تیز چلنے شروع ہو جاتے تھے۔ دل اس بری طرح دھڑکتا تھا کہ جیسے کوئی کواڑ پیٹ رہا ہو۔ میں بار بار دروازے کی طرف دیکھ لیتی تھی کہ کوئی آ نہ جائے۔ کتاب پڑھ کے میرے ذہن نے ایک عجیب سا تاثر لیا تھا۔ پھر چھت پر جاتے ہوئے سیڑھیاں گنتے ہوئے میں نے رُک کے سوچا۔ اُس کتاب کا نوجوان کہیں جاوید ہی تو نہیں اور لڑکی کہیں میری ویدی ـــــ لیکن فوراً جیسے میں نے اپنے منہ پر آپ چانٹے مارنے شروع کر دیئے۔ سوچا میں بھی کتنی ذلیل ہو گئی ہوں جو اپنی ویدی کے بارے میں ایسا سوچتی ہوں۔ کتابیں تو جھوٹ لکھا ہے۔ کاش! جھوٹ ہی لکھا ہوتا، اُس میں رتی بھر صداقت نہ ہوتی تو میں یوں اپنی ویدی سے تو نہ بچھڑتی ـــــ!

تھوڑے دنوں بعد جاوید گھر سے لوٹ آیا تو اُس کی بے باکی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا اور تمہاری طرف ہی کیا ویدی، میری طرف بھی جب وہ دیکھتا تو اُس کی نگاہیں بڑی خوفناک ہوتی تھیں جب وہ آیا تھا تو جانے کیوں میں نے بھی اُسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھا تھا جیسے میرے من میں پہلے سے کچھ ہو۔ اُسے دیکھ کے میرا جسم سنسنا اُٹھا تھا اور رگیں جیسے اکڑ کے رہ گئی تھیں۔ لیکن پھر فوراً دل میں سویا ہوا نفرت کا جذبہ بیدار ہو اُٹھا۔ میں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ لیکن ویدی! تم اُس دن اتنی زیادہ خوش کیوں تھیں۔ میں نے جس وقت بھی دیکھا، مجھے یوں محسوس ہوا تمہاری پلکوں کے کناروں پر چراغ روشن ہو گئے ہیں اور آنکھوں کے گوشوں میں جیسے صبح طلوع ہو رہی ہے ـــــ اماں اور ابا کی تو بات ہی الگ تھی۔ اب وہ ہر وقت جاوید کے متعلق ہدایات دیتے رہتے تھے۔ اماں کہتی، اگر انہوں نے اپنی کوکھ میں سے بھی کسی کو جنم دیا ہوتا تو بھی وہ جاوید جیسا سندر اور با اخلاق بیٹا نہ ہوتا اور ابا نے تو جانے اُس میں کیا دیکھ لیا تھا کہ وہ پل بھر کالج میں زیادہ ٹھہر جاتا تو سیسیوں مرتبہ دروازے

بک جاتے اور پھر اداس ہو کے آنگن میں چکر کاٹنے لگ جاتے ——

اب سوچتی ہوں اور ماں کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں تو میرے ذہن میں سنسناتی ہوئی گویاں تیر جاتی ہیں۔ "جاوید کتنا با اخلاق اور سمجھدار تھا کاش! ماں سب کچھ دیکھنے کے لئے زندہ رہتیں۔ میں ان سے یہ تو پوچھ سکتی کہ ماں! تمہاری کوکھ سے آیا ہوا بھائی کیا ہماری خوشیاں یوں چھین لیتا' جس طرح جاوید نے کیا ہے۔ پر ماں ہے بھی کہاں؟ وہ تو اس کھیل کا انجام دیکھنے کے بعد چند دن بھی زندہ نہ رہی تھی۔ اور ابا —— انہیں تو جنازے اٹھانے کی جلدی تھی نا —— ایک بیچ کا جنازہ جلدی جلدی اٹھایا اور دوسرا آنگن ہی میں چھوڑ کے خود چل دیئے ——

جاوید کا وہ آخری برس تھا۔ ابا چاہتے تھے وہ محنت کرے اور اچھے نمبر لے تو اسے کسی اچھے عہدے پر وہ دیکھ لے۔ لیکن اسے تو کتابوں سے کچھ سروکار ہی نہ تھا۔ وہ تو اب اتنا چھیل گیا تھا کہ وہ جاوید دکھائی ہی نہ دیتا تھا جو پہلی بار گاؤں سے آیا تھا تو خالص گھی کی دیگچی ساتھ لایا تھا —— یہ جاوید تو ہر شام بلاناغہ بیڈمنٹن کھیلنے جاتا تھا اور رات گئے جانے کہاں کہاں بھٹک کے لوٹتا تھا۔ پھر سوتا تو صبح دس بجے سے پہلے جاگتا ہی نہ تھا۔ میں تو اس وقت تک سکول بھی جا چکی ہوتی۔ البتہ تم دسویں پاس کر کے اب گھر پر ہی رہتی تھیں۔ تم ہی اس کا کمرہ' اس کے کپڑے' اس کی کتابیں' اس کے جوتے صاف کیا کرتی تھیں۔ بلکہ اتنی لگن اور محویت سے کہ اکثر دفعہ وہ کتاب والا نوجوان میری نگاہوں کے آگے پھر جاتا تھا —— ایک روز جب میں سکول سے آئی تو جاوید گھر پر نہیں تھا اور تم —— تم دیدی اس کے کمرے میں بیٹھی اس کی قمیض میں بٹن ٹانک رہی تھیں۔ جانے مجھے کیا سوجھی میں دبے پاؤں سے اندر چلی گئی۔

"کیا ہو رہا ہے دیدی ——؟" تم —— اُف کس بری طرح گھبرا گئی تھیں۔ خوف سے تمہارا جسم لرز گیا تھا اور سوئی دور تک تمہاری انگل میں اتر گئی تھی۔ پھر بڑی مشکل سے لرزتے ہوئے تم نے اپنے حواس پر قابو پایا اور لرزتی آواز میں جواب دیا تھا "سکول سے آ گئی ہو سرتو۔ یہ بس یونہی بٹن ٹانک رہی تھی ——" وہ کتاب والا نوجوان مجھے پھر یاد آ گیا تھا اور میں نے تم سے کہا تھا "اچھا ہے دیدی۔ یہ کام بعد میں فائدہ ہی دے گا ——" اور غصے سے تمہاری آنکھیں لال سرخ ہو گئیں تا دیدی۔

"کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتی رہتی ہو سرتو۔ ایسی بے شرم باتیں پھر کیں تو ابا سے کہہ کے تمہیں سکول سے اٹھا لوں گی ——"

میرے کمرے میں تو وہ دو یا تین مرتبہ ہی آیا تھا۔ میں اسے یوں تنہائی میں دیکھ کے سہم جاتی۔ وہ اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرتا۔ میرے کپڑوں' میرے چہرے پر تنقید ہوتی اور پھر قہقہے لگاتا ہوا باہر نکل جاتا۔ لیکن دیدی! تمہارے کمرے میں تو وہ پہروں بیٹھا کرتا تھا۔ دوپہر اکثر تمہارے ہی کمرے میں وہ ٹانگیں پھیلا کے سو جاتا تھا اور تم کھوئی کھوئی سی باہر آنگن میں اونچی نیچی اینٹیں گنا کرتی تھیں۔ شام وہ سو کے اٹھتا اور اگر اس کا کوئی دوست آ جاتا۔ تو تم دیدی! کتنی جلدی سے' کتنی تیزی سے چائے تیار کرتیں اور برتن ٹرے میں رکھ کے اسے بلا لاتی —— میں ان دنوں ٹھیک نہیں سمجھ پائی تھی۔ کہ دیدی آخر جاوید کا اتنا خیال کیوں رکھتی ہے۔ یہ اس کی خوشی اور دکھ میں برابر کی شریک کیوں ہو جاتی ہے۔ ذرا ذرا سا خاکہ میرے ذہن میں آتا ضرور تھا۔ چائے کی بھاپ کی طرح کہ پل بھر کے لئے دکھائی دیتی ہے اور پھر روپوش ہو جاتی ہے۔ میری سوچ تو یہیں تک محدود تھی کہ جاوید گھر آتا ہے تو دیدی کی پلکوں پر چراغ جل اٹھتے ہیں اور اس کے رخساروں پر پھول کھل اٹھتے ہیں۔ اور جب وہ کالج یا باہر گھومنے چلا جاتا ہے تو میری اداس ہو جاتی ہے۔ مجھے اس بات کا پتہ ہوتا کہ یہی جاوید میری دیدی کو اتنا نڈھال کر دے گا —— تو میں وہ چراغ بجھا دیتی' تمہارے رخساروں سے ان پھولوں کو نوچ لیتی دیدی ——!

اور پھر اچانک ہی سب کچھ مجھ پر واضح ہوگیا۔ میں اس جذبے کو جان تو بہت دیر سے رہی تھی لیکن جان بوجھ کے اُس سے آنکھیں چُرا رہی تھی۔ میں نے ڈھیر ساری کتابیں پڑھی تھیں۔ سکول کی سینیئر ساتھیوں سے پہروں باتیں کی تھیں اور — میں سمجھ گئی تھی کہ میری ویدی کو کیا ہو گیا ہے۔ تم جو جاوید کا نام کرنے لگتی ہو تو تمہارے چہرے پر نور سا کیوں برسنے لگ جاتا ہے اور تم عبادت کرتی دکھائی پڑتی ہو — پر ویدی مجھے اُس رات بالکل نیند نہ آئی تھی۔ جب جاوید کوئی پکچر دیکھنے گیا تھا۔ اور راتیں ذرا خنک ہو گئی تھیں اور سب نیچے ہی سویا کرتے تھے۔ ماں اور ابا تو برآمدے میں سوتے تھے۔ لیکن آنگن میں میری اور تمہاری چارپائیوں سے پرے اُس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ تم نے دن بھر کام کیا تھا اور تمہارے اعضاء بتا رہے تھے کہ تم سخت تھکی ہوئی ہو لیکن نیند پھر بھی نہیں آرہی تھی۔ تم گلی میں ذرا سی بھی آہٹ ہوتی تو اپنا سر ذرا سا اٹھا لیتی تھیں اور جب وہ جاپ گلی میں ڈوب جاتی تو تمہارا سر پھر سے نرم نرم تکیے پر آن گرتا۔ تمہیں اور تمہاری اس کیفیت کو دیکھ کے ویدی! مجھے فوراً کتاب: د یاد آگئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہیں میری ویدی بھی اُسی کی طرح سپنے تو نہیں دیکھنے لگ گئی۔ مجھے پتہ تھا نا' سپنے بڑے مدھر بڑے رنگین ہوتے ہیں انسان ایک بار گم ہو جائے تو پھر وہ اپنے آپ سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ لیکن میں تو صرف یہ سوچ کے پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ یہی سپنے جب ٹوٹ جاتے ہیں' ان سپنوں کا جادو ختم ہو جاتا ہے اور آسمان کی رفعتوں میں اُڑتے اُڑتے انسان زمین کی پستیوں میں گر جاتا ہے تو پھر وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اُٹھ بھی سکے۔ خواب سے چونک کے اس حقیقت کا سامنا ہی کر سکے۔ کہیں میری ویدی کے سپنے بھی تو نہیں ٹوٹ جائیں گے، کہیں وہ بھی بلندیوں سے نیچے تو نہیں گر جائے گی۔ اگر گر گئی تو پھر کیا ہو گا میری ویدی کا —؟ مجھے یاد ہے، بہت دیر بعد چاند ہمارے آنگن پر سے گزر کے منڈیر کے پیچھے چھپ گیا تھا اور جاوید آیا تھا اور تم اُسے کھانا دے کے سو گئی تھیں۔ لیکن مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ ویدی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کہ بات ہونے سے پہلے ہی دل مارے خوف کے دھڑکنے لگ جاتا ہے۔

ہمارے گھر کی خوشیوں میں اب اور اضافہ ہو گیا ہے۔ وہی گھر جس میں چند برس پہلے خاموشی ہوتی تھی۔ اب جاوید کے قہقہوں سے گونجتا رہتا تھا۔ لیکن آج — آج تو ویدی وہ ایک شمشان سے کسی طرح کم نہیں۔ آج تو وہ ایک ایسا مقبرہ ہے کہ جس کے پجاری اُسے مدتوں سے چھوڑ کے بھاگ گئے ہوں۔ میں نہیں مجھی ویدی! لیکن یہ خوشیاں اتنی عارضی کیوں ہوتی ہیں۔ جب انہوں نے ہمارے دامن میں کانٹے ہی بھرنے ہوتے ہیں تو پھر یہ ہمارے گھروں میں آتی ہی کیوں ہیں — میں دسویں میں سے پاس ہو گئی تھی۔ جاوید نے بی۔ ایس۔ سی کر لی تھی۔ اور ابا نے دیکھتے دیکھتے اُسے اچھی خاصی نوکری دلا دی تھی اور گھر جیسے پھر قہقہوں سے گونج اٹھا تھا۔ فرق ہوا تو صرف اتنا کہ میں ویدی کے بارے میں سوچتے سوچتے میں نے خود سپنے دیکھنے شروع کر دیئے اور خود اُن کے جال میں اُلجھ کے رہ گئی۔ تمہاری عبادت میں اب شدت آگئی تھی ویدی! جیسے تم دیوانہ وار اپنے آپ کو بھی کسی اور جسم میں تحلیل کر دینا چاہتی ہو — اور جاوید — وہ تو پہلے سے بھی زیادہ لاپروا ہو گیا تھا۔ اُس کے مذاق اور اُس کی شرارتیں تو اور بھی بڑھ گئی تھیں۔

پھر ویدی — تمہیں یاد ہے نا' تمہارے سامنے ہی خالہ اور خالو دونوں ایک شام اچانک ہی آن نکلے تھے۔ تم نے ماں کے کہنے پر کتنے اہتمام سے اور کیسے کیسے کھانے پکائے تھے اور پھر بقیہ کام میرے سپرد کر کے تم کتنے خوبصورت کپڑے پہنے تھے۔ میں نے تمہیں دیکھا تھا تو مارے خوشی کے میرے منہ سے چیخ نکل گئی تھی اور میں توے سے کالک لے کے تمہارے ماتھے پر لگانے دوڑی تھی۔ کہیں میری ویدی کو نظر نہ لگ جائے۔ پر ویدی! جس نظر نے کھانا ہوتا ہے' وہ تو کھا ہی جاتی ہے۔ کالک کے کہنے سے بھی کہیں رُکی ہے۔ اُس رات فخر سے میرا سینہ تن گیا ہو گیا تھا' میری ویدی کتنی خوبصورت ہے اُس کی یہ موٹی آنکھیں' سرخ گال اور پتہ نہیں کیوں مسلسل کانپتے ہونٹ — ویدی! آج تمہاری تصویر میرے

ہاتھوں سے سپنے گر گئی ہے اور تمھاری آنکھوں، تمھارے ہونٹوں اور گالوں پر گرد جم گئی ہے۔ کھانے بیٹھے تو جاوید نے کتنی گہری اور کیسی تیز نظروں سے تمھیں دیکھا تھا۔ تمھارا بس نہ چلتا تھا، ورنہ تم فوراً بھاگ جائیں۔ خالہ نے بھی پل بھر کے لیے تمھیں دیکھا تھا اور پھر اُن کی نگاہیں میرے چہرے پہ جم گئی تھیں۔

اُس رات اماں، ابا، خالہ اور خالو سبھی اُس بڑے کمرے میں بند ہو گئے تھے اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ کبھی کبھی ابا آواز دیتے تو میں جا کے انھیں تمباکو دے آتی تھی۔ میں جاتی تو وہ لوگ شہر کی باتیں کرنے لگتے۔ حالانکہ اُن کا اصلی موضوع تو کچھ اور ہی تھا۔ اس رات ہم دونوں بہنیں پہلے کی طرح ایک ہی کمرے میں بیٹھی تھیں۔ پہلے بھی ہم بیٹھ کے مختلف کتابوں، کپڑوں کی باتیں کیا کرتی تھیں اور آج بھی یہی باتیں کرنے کا ارادہ تھا، لیکن جانے کیوں، دیدی تم مجھ سے باتیں نہ کر رہی تھیں۔ تم نگاہیں اٹھا کے مجھے دیکھتیں تو تمھاری پلکیں فوراً ہی جھک جاتیں اور تمھارے چہرے کے نور میں سرخی بڑھ جاتی ۔۔۔ پھر تم سے صبر نہ ہو سکا اور تم نے مجھے بھیج دیا کہ دروازے سے کان لگا کے سنوں تو سہی، وہ لوگ باتیں کون سی کر رہے ہیں۔

میں نے وہ باتیں سنیں تو میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے ابا بات نہیں کر رہے، انھوں نے اپنا حقہ اٹھا کے میرے سر میں دے مارا ہے۔ وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ لیکن بحث و تکرار کے بعد انھوں نے اپنی ہار مان لی تھی ۔۔۔ یہ کیسی بات تھی دیدی! کہ میں تمھیں پورے دو دن منہ نہ دکھا سکی۔ مجھے یہی خیال تھا کہ تمھارے سپنے توڑنے والی میں ہی ہوں۔ تمھارے سینے میں ایک جلتی شمع بجھانے والی میں ہی ہوں۔ تمھاری عبادت کو جیسے میں نے ہی برباد کر دیا ہے۔ ابا یہ کسی طور نہ مانتے تھے کہ سرتو کا رشتہ جاوید کے لیے دیا جائے۔ وہ کہتے تھے "یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ بڑی بیٹی بیٹھی رہے اور وہ چھوٹی کا بیاہ رچا دیں۔" لیکن خالو کی ضد تھی کہ سرتو کی دیدی تو جاوید سے بڑی ہے۔ وہ کبھی اس کا رشتہ نہیں لیں گے۔ پھر بڑی اور چھوٹی کا کیا سوال ہے۔ بڑی کی بھی شادی ہو جائے گی اور ابا نے ہار اُس وقت مانی تھی جب خالو نے یہ دھمکی دی کہ وہ جاوید کو کسی اور جگہ بیاہ لیں گے ۔۔۔

ابا نے شکست تسلیم کر لی۔ انھوں نے خالو کی جھولی میں سرتو کو ڈال دیا لیکن دیدی! یہ کیسی شکست تھی جو تم سے تمھارا سب کچھ چھین لے گئی۔ میں نے دو دن تمھیں اپنی صورت نہیں دکھائی تھی ۔۔۔ دو دن تنہا کمرے میں لیٹی جیسے اپنے آپ پہ بھی لعنت بھیجتی کہ یہ وجود نہ ہوتا تو میری دیدی ۔۔۔ یہ مرد بھی کبھی کبھی کتنا حیوان ہو جاتا ہے۔ بڑی بہن نہ سہی، چھوٹی سہی۔ ایک عورت نہیں تو دوسری سہی۔ اُسے کیا فرق پڑتا ہے ۔۔۔ پھر میں نے جانے کس طرح اپنے آپ کو تیار کیا تھا کہ تم سے پوچھ کے میں انکار کر دوں گی ۔۔۔ ابا مجھے جان سے کیوں نہ مار ڈالیں لیکن میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گی کہ میری دیدی کے خون کی لالی میری ہتھیلیوں پہ پھیل جائے۔ دوسرے دن رات گئے میں کمرے سے نکل کے منہ ہاتھ دھو کے تمھارے پاس آ گئی تھی۔

لیکن کمرے میں آتے ہی تم نے کتنی عجیب بات کی تھی دیدی ۔۔۔ اُس وقت سے لے کے میں آج تک سوچ رہی ہوں لیکن سوچ ہمیشہ سوچ ہی رہی ہے اور میں کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ تمھارے چہرے پر کتنی تازگی تھی۔ مسکراہٹ تمھارے ہونٹوں سے ہی نہیں، آنکھوں میں سے بھی جھانک رہی تھی۔ تم نے تو دو دن پہلے سے بھی زیادہ اچھے کپڑے پہن رکھے تھے اور تم نے دوڑ کے کسی شرارت کے ساتھ مجھے لپٹا لیا اور سرگوشی میں کہا تھا ۔۔۔

"مبارک ہو سرتو۔ بڑی خوش قسمت ہو جو جیدی جیسا تمھیں شوہر مل رہا ہے۔"

سچ دیدی۔ پل کے لیے تو میں سب بھول گئی تھی۔ یاد رہا تھا تو صرف سرگوشی ـــ لیکن پھر اچانک ایک سانحہ وہ کتاب کی عارفہ ـــ وہ پچھلے تین چار برس سب کے سب میرے ذہن میں گھوم گئے۔ میں نے کتنی جلدی اپنے آپ کو علیحدہ کیا تھا اور پھر روتے ہوئے تم سے کہا تھا۔

تب مجھے سچ بتا دو دیدی۔ کہیں تمہارے ساتھ ظلم تو نہیں ہو رہا۔ میں نے تو خیر۔ اس رشتے کو پہلے کبھی سوچا ہی نہیں لیکن تم نے ـــ تم نے تو جاوید کو چاہا ہے، اُس سے ٹوٹ کے محبت کی ہے۔ مجھے پوچھتی رہی ہو۔ یہ زیادتی ہے دیدی! کنوئیں میں کُود جاؤں گی۔ لیکن ایسا نہ ہونے دوں گی۔ میں نے تمہارے بازو تھام لیے تھے۔ تمہاری آنکھوں میں نگاہیں ڈال لی تھیں۔ گو آنسوؤں کا پردہ حائل ہو گیا تھا۔ لیکن تم نے کتنی محبت سے میری آنکھیں صاف کی تھیں۔ انھیں چوما تھا اور پھر چارپائی پر بیٹھ کے میرا سر گود میں لے کے تم نے کتنے بشاش لہجے میں کہا تھا ــ "سر تو۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ سوچو تو ابا سُن لیں تو کیا کہیں ـــ پاگل ـــ میں نے جاوید کی خدمت کی ہے صرف خدمت ـــ وہ بھی اس لیے کہ وہ کتنی دور سے ہمارے گھر آیا تھا۔ مہمان ہی تو تھا وہ۔ میں نے کبھی اُس سے محبت نہیں کی۔ سر تو! میں محبت تو اُس شہزادے سے کروں گی جو چاند کے راستے ایک دن اچانک زمین پر اُتر آئے گا اور پھر مجھے لے کے ایسی دنیا میں چلا جائے گا جہاں ـــ جہاں تم ایسا نہ سوچو، جاوید تمہارا ہے۔ اُس سے جس قدر کر سکو، پیار کرو ـــ"

شہزادے کا انتظار کرنے والی میری دیدی! انتظار کرنے والے تو طویل مدتوں تک انتظار کیا کرتے ہیں۔ تم سے تو چند دن بھی نہ ہو سکا اور تم یہ سارے بندھن توڑ کے خود ہی اس کی تلاش میں نکل گئی ہو ـــ وہ کونسا دیس ہے جہاں تم چلی گئیں ـــ میرے آنسو جو آپی آپ بہہ نکلے تھے خشک ہو گئے۔ تمہاری باتیں سُن کے مجھے لگا، میری دیدی عارفہ نہیں، کوئی اور ہی ہستی ہے۔ جس کے دل میں عورت کا جذبہ ہے جو پیار بھی کرتی ہے اور جو ممتا کی بھی رکھتی ہے۔ میں نے ایک ہی بار نظر اٹھا کے دیکھا تھا اور تمہارے چہرے پر اطمینان دیکھ کے شرما کے تمہارے کمرے سے فوراً ہی بھاگ آئی تھی ــــ

جاوید تو ماں باپ کے ساتھ ہی چلا گیا تھا کہ برات نے گاؤں سے آنا تھا۔ پر تم نے کتنے انہماک سے میرا جہیز تیار کرنا شروع کیا تھا۔ سارا دن کبھی بازار اور کبھی گھر کے چکر کاٹتی رہتیں۔ دن بھر تم اپنے گھٹنوں پر کپڑے پھیلا کے اُنھیں سجاتی رہتیں۔ کبھی بیٹھے بیٹھے تمہاری آنکھوں سے آنسو ڈھلک آتے اور تمہارے چھپانے کے باوجود میں انھیں پکڑ لیتی اور ان کے بہہ نکلنے کی وجہ پوچھنے لگتی تو تم کتنے افسردہ سے لہجے میں کہا کرتی تھیں "سر تو۔ میں سوچتی ہوں۔ آج تو میرے پاس ہے۔ کل تو کہیں اور چلی جائے گی نا۔ روؤں نہیں تو اور کیا کروں؟" اور میں جھینپ کے کہا کرتی "مجھے کہاں جانا ہے دیدی! جاوید تو یہیں رہے گا اور میں بھی تو تمہارے پاس رہوں گی" تم بات ٹال جاتیں۔ "نہیں سر تو! آج تو اپنی ہے کل تم پر ہمارا کون ساحق رہ جائے گا ـــ"

پھر اسی طرح دن میں چوکی پہ بیٹھے بیٹھے، کپڑوں میں ستارے ٹانکتے ہوئے تم ذرا سی آہٹ پر چونک جاتیں اور فوراً ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتیں تو میرے دل میں شک ہونے لگتا۔ دیدی! کس کی منتظر ہے تو ـــ اور پھر جوں جوں گھر میں گہما گہمی بڑھ رہی تھی، لوگ آنے لگ گئے تھے اور میری رخصتی کے دن کم ہوتے جا رہے تھے۔ تمہارا جسم نڈھال اور مضمحل ہوتا جا رہا تھا۔ تمہارے چہرے سے نور رخصت ہو چکا تھا اور وہاں زردی پھیل گئی تھی۔ کسی وقت تم اتنی وحشت سے سارے گھر کو دیکھتیں کہ میں لرز جاتی تھی۔ یہ دیدی کو کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری نگاہوں سے وحشت رخصت ہوتی تو پھر پیشانی پر سے پسینہ بہنے لگ جاتا ـــ

اب سوچتی ہوں دیدی۔ اُس دن گلی میں شہنائیوں کی بجائے ماتم اور نوحے کیوں نہیں گونجے تھے۔ لوگوں نے جنازہ ہی اٹھانا تھا تو

اتنا اہتمام کبھی کر کے آتے تھے۔ لیکن مجھ نہیں پاتی کہ کیا ہو گیا تھا۔ کاش! براتی آتے تھے۔ ان کے درمیان جاوید کس اکڑے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ تم مجھے گھسیٹ کے کھڑکی میں لے گئی تھیں "دیدی! سرتو دیکھ لو۔ آج اس پر بہار کیسے ٹوٹ پڑی ہے" پھر شام گھِر آئی، سورج ہولے ہولے ڈوبا، سایہ لگا اور براتی —— دیدی! تیری سرتو کو اٹھائے اُس کے نئے گھر چل دیئے۔ کہتے ہیں ناں عورت کے لیے نیا اور اپنا گھر ہی سب کچھ ہے لیکن وہ کچھ نہیں ہوگا جو مجھے ملا یا میرے لیے ہو گیا ——

جاوید کے ساتھ میں سات دن وہاں رہی تھی اور ان سات دنوں میں خالہ اور خالو کو چھوڑ کے جاوید کے پیار میں گہرائی کچھ اتنی زیادہ تھی کہ میں چپ چاپ اترتی چلی گئی —— اور نیچے —— اور نیچے —— اور پھر سات دنوں بعد اپنے گھر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا۔ میری زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ پہلی زندگی تو بس سراسر بکواس تھی۔ اس میں کیا نشہ ہے کہ جو انگ انگ میں اتر گیا ہے۔ گھر آئی تو ماں نے کتنی حسرت سے کہا تھا "تم کیا گئی ہو سرتو۔ تمہاری دیدی نے تو کمرے سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ تمہیں گئے سات دن ہوئے ہیں ناں —— وہ ان سات دنوں میں ایک بار بھی باہر نہیں نکلی" وہ سات دن ہی کیا۔ تم نے تو اگلے تین ماہ میں بھی صورت نہیں دکھائی دیدی! جانے تم کیوں اتنی نڈھال اور زرد ہو گئی تھیں اور —— لیکن ٹھہرو دیدی —— مجھے اُس آخری رات کا ذکر کر لینے دو کہ دوسری باتیں اُس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ دوسری باتیں تو میں یوں ہی ہانک رہی ہوں ——

اُس رات جاوید گھر پر نہیں تھا۔ وہ دورے پر باہر گیا ہوا تھا۔ دو دن ہو گئے تھے کہ تم نے اپنی صورت کسی کو نہیں دکھائی تھی۔ تم نے ان دو دنوں میں کچھ کھایا بھی تو نہیں تھا۔ چٹخنی چڑھائے اندر ہی گم رہیں۔ میں نے ماں نے کتنی بار دروازہ کھٹکھٹایا تھا، کتنی منتیں کی تھیں لیکن تم نے تو نہ بولنے کی جیسے قسم کھالی تھی۔ دوپہر میں جب انجم آئی تو تم نے پل بھر کے لیے دروازہ کھولا تھا اور اُس کے بعد پھر سے ڈوب گئی تھیں۔ ماں تمہارے ہی غم میں پریشان بڑی دیر سے بڑے کمرے میں جا کے لیٹ گئی تھیں۔ ابا پہلے سے ہی سو رہے تھے اور میں —— اپنے کمرے میں لیٹی لیٹی سوچ رہی تھی کہ کتنا پاگل ہے یہ جاوید بھی جو ہر دوسرے روز ہفتے ہفتے کے لیے دورے پر چلا جاتا ہے اور مجھے یہاں تنہائیوں میں اُلجھنے کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ میں کروٹ بدل کے سونے ہی لگی تھی کہ اچانک تمہارے دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز آئی اور میں ہڑبڑا کے اپنے بستر پر اٹھ بیٹھی تم نے کتنی کمزور نحیف سی آواز میں مجھے پکارا تھا۔ میں ننگے پاؤں ہی تمہاری طرف بھاگی ——

تمہارے کمرے کی روشنی گُل تھی دیدی —— میں نے قدم اندر رکھے تو جانے کہاں سے تازہ تازہ خون کی بُو میرے نتھنوں میں آ گھسی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اندھیرے میں ٹٹول کے میں نے چٹخنی چڑھائی اور پھر روشنی کر دی —— اُف دیدی! وہ منظر دیکھنے سے پہلے میری بینائی چھن جاتی تو کتنا اچھا تھا۔ تم اپنے بستر کے قریب ٹھنڈے فرش پر اوندھے منہ گری ہوئی تھیں اور تمہارا بستر اور تمہارے کپڑے سُرخ خون میں ڈوبے ہوئے تھے اور فرش پر دور دور تک یہ خون پھیل کے جم گیا تھا۔ میرے منہ سے ایک دبی سی چیخ نکلی تو تم نے بڑی مشکل سے سر اٹھایا اور رُک رُک کے کہا۔

"میں تمہارے —— ہاتھ جوڑتی ہوں مسرت۔ پہلے میری سُن لو، پھر کسی کو بلا لینا"

"لیکن دیدی ——"

"خدا کے لیے مسرت" میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سینے میں جیسے کتنی ہی برچھیاں اُتر گئی تھیں۔ میں نے آگے بڑھ کے انہیں سنبھالا، اٹھایا اور بستر پر لٹا دیا اور خود پہلو میں بیٹھ گئی تو تم نے ڈوبتی نگاہوں سے التجا کی تھی ——

"سرتو۔ خدا کے لیے کہیں جانا نہیں۔ اب یہ سفر تھوڑا سا ہی تو رہ گیا ہے۔ میرا شہزادہ بس آنے ہی والا ہے۔ تم اتنی دیر میرے پاس رہی

بیٹھو اور — مجھے وہ باتیں سناؤ جب ہم ایک ساتھ سکول جاتی تھیں — ایک ساتھ مار کھاتی تھیں اور — ایک ساتھ — ہائے سرتو — اُن دنوں کی کوئی بات سنا نا سرتو —" لیکن سرتو تو تمھارے چہرے کو دیکھ رہی تھی دیدی! جو چادر کی طرح سفید ہو گیا تھا — وہ ہانپتے ہوئے سانس سُن رہی تھی جو اُکھڑ چکے تھے — وہ تو تمھاری نگاہوں میں جھانک رہی تھی جو ڈوبتی چلی جا رہی تھیں۔ دو موٹے گرم گرم آنسو تمھاری آنکھوں کے گوشوں سے بہ نکلے — وہی گوشے جہاں کبھی سورج طلوع ہوا کرتا تھا اور جہاں اب شدید تاریکی پھیل رہی تھی۔ میں نے آنسو پونچھ لیے۔ سوچا، فوراً جا کے ماں کو بلا لاؤں، لیکن پھر پوچھ ہی لیا۔

"لیکن دیدی۔ تمھیں ہوا کیا ہے، اتنا سارا خون —" میری اپنی آواز میں کتنا خوف تھا۔ تمھاری آنکھوں کی چمک تو دیدی شمع کے اُس شعلے کی طرح تھی کہ جو آخری بار بھڑکے اور پھر ہمیشہ کے لیے بجھ جائے۔ تم نے کہا تھا۔

"سرتو — میں اس گناہ کو — چھپانا چاہتی تھی — میرا خیال تھا — دوا کھا لینے سے — لیکن — اچھا ہوا جو میری زندگی بھی ختم ہو گئی —" پھر دیدی تمھاری آواز ڈوبتی چلی گئی۔ لیکن تمھاری بڑبڑاہٹ تو اب بھی جاری تھی۔ میں نے اپنے کان تمھارے لبوں سے لگا لیے۔ تم کہہ رہی تھیں۔

"اور سرتو — سرتو۔ جیدی آئے تو کہنا — تو کہنا — میں اس کی امانت کی حفاظت نہ کر سکی۔ اُسے سنبھال نہ سکی"

میری دیدی! تم اپنے ننھے سے کے پاس چلی گئی ہو۔ ابا تمھارا جنازہ آنگن میں سے اٹھا کے خود بھی چلے گئے ہیں لیکن میری دیدی! مجھے کسی نے نہیں بتایا کہ میں کیا کروں — میرا جنازہ کب اُٹھے گا۔ کب — جاوید — اُس سے میں پیار بھی کرتی ہوں اور نفرت بھی — اُس کا منہ چومتی بھی ہوں اور اُس پہ تھوک بھی دیتی ہوں — میری دیدی! مجھے بتاؤ نا، میرا جنازہ اٹھانے کوئی کب آئے گا — کوئی کب آئے گا میری دیدی —

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا!

(اقبال)

پروین سرور

ٹرانسفر

ایک سہانی شام کو وہ سفید ساڑھی میں ملبوس ہوا کے ایک لطیف اور گدازجھونکے کی مانند یوریپین کلب کے ہال میں سے گزرتی ہوئی اس کے ذہن پر چھا گئی تھی۔

بوڑھا ڈاکٹر ہاشمی اس کے ساتھ تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سفید گلاب کا پھول تھا جسے وہ مسکرا مسکرا کر اپنے رخساروں پر لگاتی اور کبھی اس کی شاخ کو لہراتی اور باتیں کرتی کرتی ادھر ادھر لچک جاتی تھی۔ اس شام کو محسن نے یوں محسوس کیا تھا جیسے آسمان پر کھلے ہوئے ستاروں میں ہلچل سی ہوئی ہے اور رات کی ملکہ اپنی تابانیوں سمیت زمین پر اتر آئی ہے۔

ان دنوں وہ اپنی انجینئرنگ کی ڈگری اور تقرری کے آرڈر سنبھال کر اس علاقے میں بڑے زور شور سے بہنے والی نہر کے سرکاری پل کی تعمیر کے سلسلے میں وارد ہوا تھا۔

اپنے نئے بنگلے میں قدم رکھتے ہی وہ اتنا خوش ہوا تھا جیسے اُس کو ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہو۔ اس کے پاس پڑوس میں شہتوت کے درختوں اور کیلے کے سبز جھرمٹوں میں ڈھکی چھپی سرکاری افسروں کی لال پیلی کوٹھیاں تھیں۔ چند پرائیویٹ بنگلے تھے۔ جہاں دن بھر رنگ برنگ چڑیاں رسیلے گیت گاتی تھیں اور نرم نرم گلہریاں پتھریلی سڑکوں پر پھلانگتی رہتی تھیں۔

یہاں آتے ہی اس کا دل ایک درخشاں مستقبل کی خوشبوؤں سے لبریز ہو گیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد جب وہ اس خوبصورت علاقے کی فضا سے تھوڑا تھوڑا مانوس ہو چلا تو دن بھر مزدوروں میں گھرا ہوا پل کی تعمیر کا معائنہ کرتا۔ شام کو کوٹھیوں سے گزر کر کھلے میدانوں میں ہوا خوری کے لئے اور رات کو اپنے پلنگ پر لیٹ کر پلک رسیلی آنچل کے سائے —— گلاب کے پھول جیسے نازک رخساروں کی گرمی اور گھنی زلفوں کی چھاؤں کے سہانے خواب دیکھتے دیکھتے نیند کی وادیوں میں اُتر جاتا۔ ان دنوں اس کی زندگی ایک حسین خواب تھی جہاں سونے جیسے سنہری دن تھے اور چاندی جیسی اجلی اجلی راتیں تھیں۔

کلب میں ثروت کو دیکھ لینے کے بعد اس نے اپنے خوابوں کی تشکیل کے لئے بہت کچھ سوچا لیکن پھر اپنے آپ کو اس دیار میں ایک اجنبی سمجھتے ہوئے اس نے اس بات کو زیادہ اہمیت دینا مناسب نہ سمجھا اور زیادہ تر شام کا وقت صرف سیر میں گزارنا شروع کر دیا۔ ہرے بھرے کھیتوں اور نازک پگڈنڈیوں پر سے صبح شام گزرنے اور خود کو خوش رکھنے کی کوشش میں وہ ثروت کے خیال سے گریز کرتا کہ اسے قریباً بھول ہی گیا۔۔۔۔

کئی دنوں کے بعد ایک صبح کو جب وہ سیر کے لئے نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ موسم میں قدرے خنکی ہو چلی ہے —— اور جا بجا اُگی ہوئی جنگلی گھاس پر شبنم کی فرحت بخش ہے۔ آسمان مشرق میں سے ابھرتی ہوئی سحر کے غبار میں دھندلا دھندلا اور مٹیالا مٹیالا نظر آتا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے خیال میں گم ہلکے ہلکے قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ صبح کو بھیگی بھیگی ہوا اس کی آنکھوں میں سے نیند کا بوجھل خمار دھوئے دے رہی تھی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے شبنم سے بھیگے بھیگے راستے سے ہٹ کر اپنا رُخ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی کی طرف کر لیا اور لمبے لمبے سانس لیتا ہوا تازہ ہوا سے لطف اندوز ہونے لگا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ کسی کے قدموں کی ہلکی ہلکی چاپ آئی ــــ وہ سوچنے لگا یقیناً یہ کوئی مزدور ہوگا ۔ یا پھر کوئی دودھ والا ہوگا جو صبح صبح ان کوٹھیوں میں اپنی ڈیوٹی پوری کرنے آیا ہوگا ۔ اس نے پیچھے مڑکر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی اور اسی خیال سے راستے سے ہٹ کر اپنے قدم ایک طرف بڑھانے شروع کر دیئے تاکہ پیچھے سے آنے والا شخص بآسانی اس پگڈنڈی پر قدم دھرتا ہوا اس کے قریب سے آگے نکل جائے ۔

ابھی وہ یہی فیصلہ کر رہا تھا کہ اچانک اسے گھونگھروؤں کی ہلکی ہلکی آواز سنائی دی ــــ اور پھر جیسے کوئی نرم نرم گرم چیز اس کے پیروں سے اس طرح لپٹ گئی کہ وہ گرتے گرتے بچا ۔ اس نے جھٹ نیچے جھک کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا ۔ ایک چھوٹا سا ــــ بڑے بڑے کانوں اور لمبے لمبے بالوں والا کتا اس کی ٹانگوں سے الگ ہٹ کر اپنی زبان نکالے ہانپ رہا تھا ۔ اور اس کے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر زمین پر گھسٹتی چلی آرہی تھی ۔

"نہ معلوم کس کا ہے ؟" ــــ اس نے سوچتے ہوئے کتے کو اٹھا لیا ۔ اور پیار سے تھپکتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا ۔

اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا ثروت یوں لمبے لمبے قدم بڑھاتی چلی آرہی تھی جیسے صبح کا ستارہ ٹوٹ کر آسمان کی بلندیوں سے زمین کی طرف آرہا ہو ۔ اس کے بال اڑ رہے تھے ۔ باریک دوپٹہ زمین پر گر رہا تھا اور چہرے پر پریشانی کے آثار تھے ۔ اس نے محسن کے قریب آتے ہی بڑھے آرام سے کتا اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور پھر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اس کی زنجیر درست کرتے ہوئے نظریں جھکائے جھکائے بولی ــــ

"معاف کیجئے ۔ اس نے آپ کو خواہ مخواہ پریشان کر دیا ۔ غلطی میری تھی ۔ زنجیر ہاتھ سے چھوٹ گئی ۔"

اپنے خوابوں کا سہارا لیتے ہوئے محسن کا جی چاہا کہ روز ہی اس کی زندگی میں اسی طرح قوسِ قزح نکھر کر آیا کرے اور شفق کے رنگ بکھرتے رہیں ۔

وہ ذرا توقف کے بعد بولی ۔ "میں نے تو آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا ۔ آپ شاید یہاں نئے نئے آئے ہیں ؟"

اس کے کھلے گریبان میں پڑا ہوا سنہری لاکٹ اس کے دل کی دھڑکن پر بڑی تیزی سے ہل رہا تھا ۔ اور وہ مسلسل شرمائے جا رہی تھی ۔

"جی ہاں ! مجھے اس طرف آنے کا آج ہی اتفاق ہوا ہے ۔ میں آپ کے لئے اجنبی اور نووارد سہی لیکن آپ کو تو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے ۔"

"کہاں ؟" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی ۔

محسن کا جی چاہا کہہ دے ۔ "اپنے خوابوں میں" ــــ لیکن وہ سنبھل کر بولا ۔ "کلب میں ۔ اس دن آپ کے ساتھ کوئی بزرگ بھی تھے ؟"

"اوہ ، ڈاکٹر ہاشمی ! ــــ جی ہاں وہ ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں ۔ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں ــــ آپ نے مجھ کو کلب میں دیکھا تھا ۔ عجیب بات ہے میری نظر آپ پر نہیں پڑی ۔"

"یہ میری بدقسمتی ہے ۔"

"جی ! ــــ" وہ سرخ ہوتے ہوئے بولی ۔

محسن ہنس پڑا ــــ سرور اور کیف میں ڈوبی ڈوبی ہنسی ۔

"آج شام کو آپ کلب میں آئیں گے ؟" وہ پیٹھ موڑ کر جاتے ہوئے بولی ۔

"جی نہیں ۔ آج تو ذرا بھی فرصت نہ ہوگی ۔"

"پھر کب ؟" ــــ

"دیکھئے ــــ جس دن بھی فرصت ہوگی آجاؤں گا ــــ"

پھر وہ پیچھے پلٹ آئی ، کہنے لگی ۔ "یہ دیکھئے ، زیادہ دور نہیں ۔ یہ سامنے میرا گھر ہے ۔ آپ کو جس دن بھی فرصت ہو ضرور بلا تکلف

تشریف لائیے گا۔ میری ممی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ میں ان سے ضرور آپ کا ذکر کروں گی "

"کون سی ——— یہ والی کوٹھی ؟" ——— اس نے پھر شرارت سے اس کو چھیڑتے ہوئے اپنی انگلی کا اشارہ غلط سمت کر دیا۔

"جی نہیں ——— یہ سرے والی تو آج کل خالی ہے۔ سنا ہے کہ کچھ دنوں میں یہاں بھی کوئی نئی فیملی آجائے گی " بالکل اس کے ساتھ والی۔ جو سیمنٹ کی کوٹھی ہے نا۔ وہ ہماری ہے "

"اچھا اچھا۔ اب میں سمجھا " وہ اس کی طرف جھکتی ہوئی گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا ——— " تو پھر آئیے رخصت ہو جائیں۔ خدا حافظ!"

"خدا حافظ!" ——— وہ شرمائے لجائے انداز میں پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

پھر وہ چار دن کے بعد وہ اسے کلب میں دکھائی دی۔ دور ہی سے نگاہیں چار ہوئیں۔ ہلکی سی سرور انگیز مسکراہٹ نے خیر مقدم کیا اور وہ بے اختیار اپنی کرسی پر سے اٹھ کر اس کی طرف بھاگی آئی ———

"آپ ہمارے گھر آئے کیوں نہیں ؟ میں نے بڑا انتظار کیا ———"

"اوہ ——— اچھا! ——— تو یہ بات تھی ——— دیکھئے ———" وہ ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا " آپ نے میرا انتظار کیا ہی نہیں۔ ورنہ مجھے خبر نہ ہو جاتی ؟"

"سچ ؟" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس نے کھڑے کھڑے کھڑکی میں سے باہر کلب کے سرسبز لان کا نظارہ کرتے کرتے ایک دم ثروت کی بات پر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور نظریں جھکائے کھڑی تھی

"اچھی بات ہے۔ میں ضرور آؤں گا۔ چلئے ابھی چلیں ؟" اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

"ہم ایک گیم کھیل رہے تھے۔ میں۔ ڈاکٹر ہاشمی اور خلیق صاحب ——— آپ مسٹر خلیق سے ملے ہیں نا۔ بڑے دلچسپ اور منھ پھٹ آدمی ہیں۔ ہم سب اپنی اپنی پسند کے رنگ ایک دوسرے کو بتا رہے تھے۔ تو آپ کو کون سا رنگ پسند ہے ؟"

"مجھے تو آپ کی ساڑھی کا آسمانی رنگ پسند ہے !"

وہ جھینپ گئی۔

لوگ ان دونوں کی طرف بڑی پرمعنی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ کوئی کھنکار کر قریب سے نکل جاتا۔ کوئی سیٹی بجا دیتا۔ اور کوئی صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کرتا۔

محسن خاموش کھڑا تھا اور لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ مسٹر خلیق سے شاید نہیں ملے۔ چلئے آپ کا تعارف کرا دوں " اور وہ بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں خلیق اور ڈاکٹر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"ہیلو محسن ———!" خلیق اپنی کرسی پر سے بے اختیار اچھلا اور اس کے گلے میں جھول گیا۔

"یار خلیق کب آئے ؟ میں تو یہاں بالکل تنہا ہی مر گیا۔ نہ کوئی دوست۔ نہ جان پہچان !"

"مجھے یہاں آئے ہوئے دو دن ہی ہوئے ہیں۔ ویسے اس کلب کی فضا میں قدم دھرے ہوئے ایک گھنٹہ اور پانچ منٹ "

"آپ دونوں شاید ایک دوسرے سے واقف ہیں؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

"مس ثروت! محسن تو میرا بڑا پرانا دوست ہے۔ ویسے یہ ذرا تنہائی پسند واقع ہوا ہے۔ بہت کم لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ یہ آج کلب میں کیسے آگیا ہے؟" خلیق ایک سگریٹ منہ میں دبا کر لائٹر جلاتے ہوئے بولا ـــ "آپ ڈاکٹر صاحب، سگریٹ!"

"جی نہیں شکریہ!" ڈاکٹر نے اپنا سفید سر ہلا دیا۔

پھر تھوڑی دیر تک خلیق اپنے کاروبار کی باتیں کرتا رہا۔ دونوں سگریٹ کے دھوئیں اڑاتے رہے اور شام ختم ہوگئی۔

ثروت ایک بار پھر رخصت ہوتے ہوئے بولی: "مسٹر محسن ـــ پھر میں آپ کا انتظار کروں؟"

اور وہ ہنس کر بولا "ضرور!"

دو تین دن کے بعد ایسا اتفاق ہوا کہ ایک دن وہ بارش کی وجہ سے کام پر نہ جا سکا۔ رات بھر بنگلے کی ٹین کی چھت پر بارش کی بوندیں جلترنگ بجاتی رہیں، اور وہ رات کو ٹھیک طرح سے سو بھی نہ سکا۔ علی الصبح اٹھ کر اس نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ جل تھل برستی بارش کے رک جانے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ کوٹھیوں کے سامنے نشیب میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے جزیرے اور تالاب بن گئے تھے۔ ناہموار سڑکوں پر پانی جمع ہو جانے سے آمد و رفت کا سلسلہ قدرے محال ہو رہا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے برآمدے میں کرسی رکھی اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔

اس کے چاروں طرف خاموشی تھی صرف بارش اور سرد ہوا نے مل کر ایک سماں باندھ رکھا تھا۔

اس نے ساری دوپہر اپنے دفتر کی فائلیں اور سرکاری کاغذات الٹنے پلٹنے میں گزار دی۔ شام کے وقت وہ اپنی تنہائی سے اکتا گیا۔ اس نے سوچا سیر کے لئے باہر نکل جائے لیکن تیز برستی ہوئی پھوار میں بھیگ کر بیمار ہو جانے کے خیال سے وہ اپنے ارادے کو پورا نہ کر سکا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ اور ایک سرمئی دھند نے فضا کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اس کے پاس کوئی اچھی سی کتاب ہوتی تو وہ اپنے کمرے میں لیمپ جلا کر اس کی پہنائیوں میں خود کو کھو دیتا۔

اس خیال سے اس نے اپنی الماریاں اور میز پر رکھی ہوئی ساری کتابیں چھان ماریں لیکن جس چیز کی اس کو تلاش تھی وہ ہاتھ نہ آئی تو وہ بغیر کسی ارادے کے اپنی چھتری سنبھال کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا کیچڑ اور پانی سے بچتا بچاتا ثروت کے گھر کی طرف نکل گیا۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ دو تین منٹ میں ہی اس کے پھاٹک پر کھڑا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اندر جائے تو کیونکر اور یوں بے موقع چلے آنے کی کیا وجہ بیان کرے۔ اس برستی ہوئی بارش میں جبکہ ہر شخص اپنے گھر میں پناہ گزین ہے بھلا محسن پر ایسی کیا افتاد پڑی تھی کہ دوسروں کو خواہ مخواہ اپنی آمد سے بور کرے۔ پھر اس نے سوچ ہی لیا کہ جلدی سے وہ ایک اچھی سی کتاب مانگ لے گا اور فوراً واپس آ جائے گا ـــ

اس نے پھاٹک کھولا اور کچے راستے سے ہوتا ہوا برآمدے کی سیڑھیوں پر جا رکا ـــ اس نے چھتری وہیں رکھ دی اور خود پائیدان پر جوتے رگڑتا ہوا آگے بڑھا تاکہ گھنٹی کا بٹن دبائے۔ لیکن اس کو یہ زحمت بھی نہ اٹھانی پڑی۔ ثروت اپنے کمرے میں کھڑی بارش کا نظارہ کر رہی تھی۔ اس نے دور ہی سے محسن کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اور وہ ایک منٹ بھی رکے بغیر لپک کر باہر نکل آئی۔

"آیئے مسٹر محسن۔ آخر آپ آ ہی گئے نا ـــ"

وہ اس کی سرد اور بھیگی انگلیاں اپنے گرم گرم ہاتھوں میں دبا کر اسے کھینچتی ہوئی گیلری کے دروازے سے اندر لئے جا رہی تھی۔ ڈرائنگ روم کا پردہ سرکا کر وہ اپنی پوری مسرتوں کے ساتھ چلائی ـــ "ممی ـــ محسن آ گئے ـــ"

وہ ڈرائنگ روم کے دروازے میں اپنے گیلے جوتے لئے حیران کھڑا تھا۔ ڈرائنگ روم کی وسعت اور سجاوٹ نے اس کی آنکھوں کے سامنے

جیسے ایک نامعلوم دروازہ کھول دیا تھا۔ آتش دان پر رکھے ہوئے شیشے کے پھولدان میں سجے ہوئے پھولوں کی مہک نے اس کو خوش آمدید کہا۔ اور وہ ایک کشمکش میں الجھ کر رہ گیا ـــــ

ثروت نے جھٹ بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرے کی سبز دیوار میں لگی ہوئی خوش نما کانچ کے پھولوں کی ڈالی ایک دم روشن ہو گئی ـــ اور سامنے رکھے ہوئے دیوان کے نرم نرم گدیلوں میں سے ایک سیاہ چیک دار بلی کود کر جھرجھریاں اور انگڑائیاں لیتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔

"آئیے نا ـــ آپ وہاں ہی کیوں رُک گئے؟" وہ اپنے لمبے بالوں کو جھٹکتے ہوئے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مس ثروت! مجھے ڈر ہے کہ آپ کا خوبصورت قالین کہیں خراب نہ ہو جائے ـــ"

"اوہ ـــ آپ کے جوتے ـــ لائیے میں صاف کر دوں ـــ" وہ جھٹ آگے بڑھی اور اس کے پیروں کی طرف جھک کر تسمے کھولنے کے ارادے سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"نہیں نہیں...... وہ اپنے پاؤں پیچھے کرتے ہوئے پھر سے برآمدے میں جا رُکا۔ آپ مجھے گناہگار نہ کیجئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس میں کیا ہرج ہے۔ اچھا۔ نہ سہی۔ میں ابھی شہابو سے کہتی ہوں وہ صاف کر دے گا۔ ویسے میں تو دن میں ہر قسم کا کام کرتی رہتی ہوں۔ مجھے تو کبھی کوئی عار نہیں ہوئی ـــ" پھر وہ شہابو شہابو پکارتے ہوئے باہر نکل گئی۔

محسن برآمدے میں رکھے ہوئے ہیٹ اسٹینڈ کے قریب کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اس اپنائیت اور اس بے تکلفی کے کیا مطالب ہو سکتے ہیں۔ اس خلوص کی گہری اور پُرسکون وادی میں اس کا مقام کون سا ہوگا؟

"مسٹر محسن ـــ یہ میری ممی ہیں۔ ان سے ملئے ـــ"

وہ اپنے جوتے اتار کر کمرے میں ایک صوفے کے سہارے کھڑا تھا۔ اچانک پردہ ہلا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ ایک شرارہ سا لپکا اور کسی نے اپنے سفید سفید ہاتھوں میں اس کو تھامتے ہوئے بڑی شفیق آواز میں کہا ـــ "ہیلو ـــ مسٹر محسن ـــ کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے آپ کو یہاں دیکھ کر ـــ ایسے اجنبیوں کی طرح چپ چاپ کھڑے ہیں ـــ بیٹھئے نا ـــ"

اور پھر انہی نرم گرم سفید ہاتھوں نے اس کو پیار سے صوفے کی گہرائیوں میں چپکے سے دھکیل دیا۔

"مجھے آپ سے بڑا زبردست گلہ ہے۔ اور میں آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتی ......"

اس نے حیران ہو کر اس میٹھے پانی کے سمندر کی طرف دیکھا۔

"مجھ سے گلہ؟ آپ کو؟"

"جی ہاں ـــ آپ نے یہاں آتے آتے اتنے دن لگا دئے۔ بے بی کو تو آپ کے ذکر کے علاوہ ان دنوں اور کوئی بات ہی نہیں آتی تھی۔ اور میں بھی آپ سے ملنے کے لئے ـــ یوں سمجھئے کہ ـــ جیسے" اور وہ ہنس کر بولیں ـــ "بڑی بے چین تھی ـــ جی ہاں ـــ"

وہ بھی ہنس پڑا ـــ "دیکھئے نا......"

وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ پھر سے بات کاٹتے ہوئے بولیں ـــ "میں ایک بات نہیں سنوں گی ـــ آپ تو غیروں کی طرح کھنچے کھنچے پھرے۔ آخر ہماری دعائیں آپ کو یہاں لے ہی آئیں نا ـــ"

اور وہ خواہ مخواہ عرقِ ندامت سے اس ٹھنڈ میں بھی بھیگا جا رہا تھا ـــ اس نے کنکھیوں سے اوپر دیکھنے کی جرأت کی ـــ تقریباً پچاس باون

برس کے پھیر میں گزرتی ہوئی ثروت کی ممی ایک سرخ بارڈر کی سفید شال اپنے شانوں پر لپیٹے ہوئے اپنی بھوری بھوری چمکدار آنکھوں سے محسن کی طرف اس انداز سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ نظریں جھکانے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے گردن جھکا کر بڑی سادگی سے بغیر سوچے سمجھے کہا — "بڑا خوبصورت گھر ہے آپ کا" پھر وہ اپنی ہی کہی ہوئی اس بات پر محجوب سا ہو گیا۔

"چھوڑیئے بھی —" وہ اسی میٹھے لہجے میں بولیں "اب یہاں کیا خوبصورتی رہی — جب ثروت کے ڈیڈی زندہ تھے تب اگر کبھی آپ کو یہاں آنے کا اتفاق ہوتا تو ....."

ثروت نے آکر پوچھا — "آپ کیا پئیں گے — چائے - کافی — اوولٹین —؟"

"جی نہیں — شکریہ - ! میں تو ایک کتاب کی تلاش میں آیا تھا - آپ کے پاس ماڈرن آرٹ کی کوئی کتاب ہوگی ؟"

"کوئی ایک کتاب ؟" - ثروت کی ممی نے کہا "الماریاں بھری پڑی ہیں - اتنی کتابیں ہیں کہ آپ کو انہیں دیکھنے اور چھانٹنے کیلئے بھی ایک عمر درکار ہوگی"

"جی ہاں ! — بے شمار — آیئے میں آپ کو دکھاؤں —"

"ابھی نہیں بے بی — ابھی اپنے مہمان کو آرام سے بیٹھنے تو دو - ان سے باتیں کرو - محسن صاحب — ابھی اس میں بچپن بہت ہے - کسی بات کو ٹھیک سے سمجھتی ہی نہیں" انہوں نے ماتھے پر سنجیدگی سے بل ڈالتے ہوئے کہا —

"جی نہیں — کوئی بات نہیں —"

"مسٹر محسن —!" انہوں نے ذرا سا کشن کا سہارا لیتے ہوئے کہا - بات یہ ہے کہ اس کے ڈیڈی سر جمال الدین آرٹ کے بڑے دلدادہ تھے - بڑا نفیس اور عالی مزاج پایا تھا انہوں نے - اس بنگلے کی سجاوٹ کے لئے انہوں نے یورپ سے ..... اور دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے - دور دراز کے مقامات سے ......"

محسن کے کان سنسنا رہے تھے - اس کے چہرے پر خون کی گردش تیز ہو رہی تھی - اس نے محسوس کیا جیسے وہ آسمان کی بلندیوں کی سیاحت کرتے کرتے ایک دم زمین کی پستیوں کی طرف گرنے لگا - اسے اتنی اونچائیوں پر اپنا کوئی مقام نہیں مل رہا تھا - اپنے محور سے الگ ہٹتے ہٹتے وہ کچھ پریشان سا ہو چلا - اس کے سامنے سفید بالوں سے ابھرا ہوا ایک مدبر چہرہ تھا - ابروؤں کی محرابوں کے نیچے بڑی بڑی سنجیدہ سی آنکھیں اس کی طرف ہمدردی سے مائل تھیں - اور کان جیسے کھنچے ہوئے - پتلے پتلے ہونٹ اس سے کئی گزری داستانیں کہہ سنانے کو بل رہے تھے۔

"میں ابھی آتی ہوں" اپنی ممی کے طویل سلسلوں کو شروع ہوتے دیکھ کر ثروت گیلری کے چکنے فرش پر آرام آرام سے پاؤں دھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

محسن کو یوں لگ رہا تھا جیسے کسی عالی شان بوسیدہ عمارت کے باوقار کنگورے زمین بوس ہوتے ہوتے اور خاک میں ملتے ملتے بھی کتنے عظیم سے عالی حوصلہ ہوتے ہیں - یہ وقار اور یہ جلال - جیسے وقت کے سیمابی پردوں میں ایک کا زوال گزر گیا ہو اور ایک رنگین داستان باقی رہ گئی ہو۔

"میں تو اب یوں سمجھو دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہوں - جب زندگی میں کچھ بھی باقی نہ رہے تو پھر بھلا دنیا کی چیزوں سے کیا واسطہ" وہ جھکی جھکی نظروں سے قالین کے بڑے بڑے بیلوں کو گھور رہا تھا۔

"آپ تو یہاں بالکل نئے ہیں - جب ثروت کے ڈیڈی زندہ تھے تو وہ ہر سال یورپ کی سیاحت کے لئے جایا کرتے تھے - ثروت ان کے ساتھ جاتی تھی — وہاں سے وہ فرنیچر اور بنگلوں کی آرائش کے سامان - خوبصورت تصویریں - اور....."

"جی ہاں ——— مجھے یہاں پہلی مرتبہ ہی آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ابھی تو میں نے یہاں کی فضا میں ٹھیک سے آنکھ بھی نہیں کھولی — ہر چیز — ہر جگہ — ہر انسان — ہر چہرہ — ایک خواب کی طرح معلوم ہوتا ہے —

"ٹھیک کہتے ہیں آپ"

"ممی — آپ ساری باتیں نہ کر لیجئے گا۔ کچھ میرے لیے بھی چھوڑ دیجئے گا۔" ثروت دوسرے کمرے سے چلائی۔

"بھئی اِدھر آؤ نا — پھر تم وہاں کیا کر رہی ہو!"

"پہلے چائے تیار ہے۔" وہ پردہ سرکا کر بولی۔

اور وہ چائے کی میز کے گرد بیٹھ کر چاندی کے چمچوں کی جھنکار۔ شیشے کے برتنوں اور کھنکھناتی نازک نازک پیالیوں کے ساتھ ساتھ مٹی کی لطافتوں کے سحر میں گم ہو گیا —

"کیا کیا مشاغل ہیں آپ کے؟" اس نے یونہی پوچھ لیا۔

"کوئی خاص نہیں — بس یونہی —"

"شاید کتے پالنا — اور ان کے ساتھ سیر کرنا" وہ ہنستے ہوئے مذاق سے بولا۔

"محسن صاحب! بے بی نے اپنی ابتدائی تعلیم ولایت میں حاصل کی — پھر جب اس کے ڈیڈی زیادہ بیمار ہو گئے تو انھوں نے اس کو واپس بلا لیا — پھر کانونٹ میں داخل کر دیا — وقت تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جاتا ہے" چائے کی پیالی اپنے لبوں سے لگاتے ہوئے بولیں۔ "لیکن دلوں کی افسردگی اور غم کسی طرح دور نہیں ہو سکتا — اگر آج اس کے ڈیڈی زندہ ہوتے تو . . . . .

"مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ انھیں عارضہ کیا تھا"

"بلڈ پریشر — آپ رک کیوں گئے — پیسٹری لیجئے نا"

"شکریہ — اس نے اپنی پلیٹ آگے بڑھائی —

"بریں ہیمرج ہو گیا تھا" ثروت کی ممی کی آنکھیں چھلک آئیں۔ انھوں نے رومال سے آنکھیں صاف کیں اور پھر چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اپنے خشک حلق کو تر کر کے کہنے لگیں — "محسن صاحب — اس دنیا میں دولت سے سکون نہیں خریدا جا سکتا — بے بی بڑے آزاد ماحول میں پروان چڑھی ہے — اس کے لیے کسی چیز کی کمی نہیں ہے — روپیہ ہے — جائداد ہے — اس کے دادا کے آباد کیے ہوئے کئی گاؤں ہیں — جاگیر ہے — سیر تفریح ہے — سب کچھ ہے۔ لیکن زندگی میں ایک بہت بڑا خلا ہے — ایک محرومی ہے — غریب خلوص کے دو بولوں پر مرتی ہے — کسی نے ہمدردی اور پیار سے پکارا بس اُسی پر مر مٹی ——

اُس نے ثروت کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ وہ اپنی نظریں جھکائے ایک بسکٹ کے کنارے اپنے چھوٹے چھوٹے دانتوں میں دبائے کتر رہی تھی — اُس کی پلکوں پر کسی کسی وقت بارش کے قطروں کا عکس کپکپاتا ہوا جھلکنے لگتا۔

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ صرف کبھی کبھار پیالیوں کے ٹکرانے کی مدھم سی جھنکار سنائی دے جاتی —

چائے کے بعد وہ اپنی کرسی پر سے اُٹھتے ہوئے بولا "اگر میں آپ کے کسی کام آ سکا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی"

"شکریہ — بے حد شکریہ — مسٹر محسن — مجھے آپ سے مل کر اس قدر خوشی ہوئی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

ثروت بولی "مسٹر محسن صاحب۔ آپ کے لیے یہاں ہی کتابیں نہ آئیں تو آپ اُدھر چل کر الماری میں سے خود ہی دیکھیں گے۔"

"نہیں بے بی ستم خود ہی لے آؤ" — پھر انھوں نے بڑے پیار سے محسن کا بازو تھپتھپاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں بڑے اعتماد سے جھانک کر کہا "آپ اِس کو سیر کے لئے اپنے ساتھ لے جایا کیجیئے — میں تو روزانہ اِس کو زبردستی گھر سے نکال دیتی ہوں — کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کہیں صحت پر برا اثر نہ پڑے۔ مگر یہ جاتی ہی نہیں "

" یہ تو واقعی بڑی بُری بات ہے "

"جی ہاں — بہت بُری — دیکھئے نا — اِس کے بعد میرا اِس دنیا میں کون ہے — اُنہوں نے گریبان میں سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا — یہ مانتی ہی نہیں — روتی ہے — ضد کرتی ہے۔ کہتی ہے کس کے ساتھ جاؤں — مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ تو یہاں آگئے ہیں نا۔ اب کوئی دلچسپ سا پروگرام بنایئے —"

ثروت ایک جلد اُٹھائے اندر آئی —

"لیجئے — مسٹر محسن — اِس کتاب میں آپ کو دُنیا کے عظیم ترین شاہکار ملیں گے "۔ اُس نے کتاب اُس کے ہاتھوں سے تھام لی۔ اور پھر مسز کرآن سے مخاطب ہوا۔ "جی ہاں — ہم لوگ ضرور پروگرام بنائیں گے — آپ مطمئن رہیئے "

"بات یہ ہے مسٹر محسن! گزشتہ چند برس میں بھی آپ کی طرح بہت سے لوگ یہاں آتے رہے۔ بے بی کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے۔ بڑا اچھا وقت گزرتا رہا۔ اب آپ کو معلوم ہی ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں ٹرانسفر بھی ہوجاتی ہے۔ اتنا اچھا وقت گزارنے کے بعد جب وہ لوگ چلے جاتے ہیں اور اپنی اتنی اچھی اچھی یادیں چھوڑ جاتے ہیں تو یہ اور بھی غمگین ہوجاتی ہے — راتوں کو روتی ہے۔ ان کو خط پہ خط لکھتی ہے۔ ان کے جواب کا مدتوں انتظار کرتی ہے۔ اور پھر جب وہ لوگ بھول جاتے ہیں تو . . . . "

"جی نہیں! میرے ٹرانسفر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اگر کہیں گی تو میں اپنی ٹرانسفر کے وقت اپنے سامان کے ساتھ ان کو بھی اپنے ساتھ ہی سمیٹ کرلے جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کیجئے "

زوردار قہقہوں نے کمرے کی چھت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا — " فائن — آپ بہت شریر اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں " ممی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر مارے ہنسی کے دوہرے ہوتے ہوئے کہا اور پھر ایک مسرور ہنسی میں ڈوب گئیں —

ثروت شرارے کی طرح تڑپ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات کو جب وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تو شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ ایک سیاہ رنگ کی چڑیا اس کی کھڑکی کی ڈھلی ڈھلی سل پر بڑی رسیلی آواز میں کسی پرندے کو آوازیں دے رہی تھی۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ کسی قیمت پر بھی ثروت کا دامن کبھی نہ چھوڑے گا۔

پھر زندگی بڑے سہانے ماحول میں ڈھل گئی۔

روزانہ شام کو وہ دونوں اکٹھے کلب جاتے۔ للی کے پھولوں کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرتے۔ اکٹھے ٹینس کھیلتے۔ اس دوران میں اسے بارہا خیال آیا کہ باتوں باتوں میں ثروت سے اپنے ارادے کا اظہار کرے۔ لیکن اس کی ہمت نہ ہوئی۔ یہی سوچ کر رہ گیا کہ جس بات کو اس نے کئی مرتبہ اپنی خاموشی سے ظاہر کردیا ہے پھر اُس کو الفاظ میں ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے لئے ان دونوں زندگی ایک ساز تھی۔ ایک سنگیت تھی۔ ایک نغمہ تھی — ہوش ربا — اور مدہوش کن —

پھر ایک شام جب وہ دونوں کلب سے رخصت ہونے لگے تو محسن نے بڑی گہری نظر سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر اُس کا ہاتھ تھام لیا ——

وہ یکدم سُرخ ہو گئی —— جیسے اُس کی جھکی ہوئی نگاہوں میں ایک پیغام چھپا ہوا تھا —— اُس دن اُس نے اپنے بالوں میں ایک گلابی پھول ہی گویا سجا رکھا تھا جس کا عکس بات بات پر اُس کے رخساروں پر دوڑ جاتا —— گلابی گلابی —— خمار آلود نشیلی آنکھیں —— راج ہنس کی طرح بہکتی اور لچکتی چال ——

محسن نے سوچا کہ آج وہ اپنے دل کی بات ضرور اُس سے کہے گا —— اور وہ اُس کا ہاتھ تھام کر بولا —— چلئے میں آپ کو آپ کے گھر تک پہنچا دوں ——

اور وہ دونوں پیدل ہی چل پڑے —— راستہ لمبا تھا —— اور شام ڈھل کر رات کی ابتدائی منزلوں میں بھٹک رہی تھی —— آسمان پر چاند پُرانند تھا ——

وہ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چل پڑے —— ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اور دلوں میں دونوں کا ہیجان لئے —— فضا میں پھولوں کی ہلکی ہلکی مہک بسی ہوئی تھی —— اور چاروں طرف ایک معنی خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی ——

اُس کا جی چاہا کہ وہ اُس کی خوشبو دار زلفیں چُوم لے —— اُس کی اُلجھی ہوئی بالوں کی لٹ اپنے ہاتھوں سے سنوار دے اُس کی نازک کمر کے خم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دیتے ہوئے اتنا گدگدائے —— اتنا گدگدائے کہ وہ ہنستے ہنستے اور کھلکھلاتے کھلکھلاتے بے دم ہو کر اس کی باہوں میں جھول پڑے —— اُس کے موتیوں جیسے شفاف آنسوں چھلک پڑیں اور پھر وہ اس زرد چاندنی میں ڈوبے ہوئے سکوت میں اس کی سبز آنکھوں میں جھانک کر کہے —— آؤ ایک عہد کریں —— زندگی بھر اسی طرح ہاتھ تھامے اونچے نیچے راستوں پر سنبھل سنبھل کر چلنے اور ایک دوسرے کی رفاقت کا دم بھرنے کا …………

لیکن وہ ایسا نہ کر سکا —— اُس کے قدم سرمستی اور سرشاری میں لڑکھڑاتے ہوئے بہکے —— جیسے ابھی وہ مناسب وقت اور موقع نہ آیا ہو جبکہ وہ اپنے ارادوں کو الفاظ میں ڈھال سکتا ہو —— اُس نے ہمیشہ کی طرح سوچا کہ جب ایک بات کو دو دل اچھی طرح سوچتے اور سمجھتے ہوں تو پھر زبان ہلانے کی کیا ضرورت ہے —

وہ کچھ سوچتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکا —— آج یہ راستہ کس قدر حسین معلوم ہو رہا ہے —— یہ رات —— یہ چاندنی —— اور یہ درختوں کے سائے ——

ہُوں —— وہ خاموشی میں ڈوبی ڈوبی اُبھری ——

" آپ صبح کے وقت میرے ساتھ سیر کے لئے نہیں جا سکیں گی کیا ؟

وہ اس انداز سے بے اختیار ہنس پڑی جیسے اُس نے گلاس بھر کر اوس اُس پر گرا دی ہو۔ مسٹر محسن میں بڑی سُست ہوں۔ ممی خفا ہو کر اور ڈانٹ ڈپٹ کر مجھے کلب میں بھیج دیتی ہیں ورنہ میں تو اپنے پلنگ پر سے کبھی نہ اُٹھوں ——

اور جیسے وہ اپنے اُسی مقام پر واپس پہنچ چکا تھا جہاں سے اس نے اتنی طویل مسافت طے کی تھی —— اُس کی ساری طے کی ہوئی منزلیں ایک ایک کر کے اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں —— جیسے اُس کی اتنی محنت —— اتنی مسافت بے کار گئی —— بالکل بے کار ——

اسے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ اتنے موقعے ۔ اتنے لمحات ۔ اتنے شب و روز اس نے ضائع کر دئے ۔ اس کی خاموشی ایک بھی پیغام ثروت تک نہ پہنچا سکی ۔۔۔ وہ جس بات کو اپنے سینے میں ایک راز کی طرح چھپائے پھرتا تھا وہ ثروت آج تک نہ سمجھ سکی ۔

واقعہ ختم ہو چکا تھا ۔۔۔ اور وہ بڑی گرم جوشی سے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گئی ۔ وہ کافی دیر تک اپنی بزدلی پر لعنت بھیجتا رہا ۔ آخر وہ اتنا کم ہمت کیوں ہے ؟

پھر شب و روز بدلے ۔ حالات بدلے اور واقعات نے ایک نیا روپ اختیار کیا ۔

ان دونوں کے درمیان خلیق ایک پردے کی طرح حائل ہو گیا ۔

ایک شام کو وہ ثروت کے گھر گیا ۔ گھنٹی بجائی ۔ اس کی ممی باہر نکلی ۔

"مسٹر محسن ۔۔۔ بے بی خلیق کے ساتھ پکچر پر گئی ہے ۔"

وہ الٹے قدموں واپس آگیا ۔

موسم بدل چکا تھا ۔۔۔ ہوائیں اور بارشیں ختم ہو چکی تھیں ۔ ہر طرف سرخ اور نارنجی پھول سنہری دھوپ میں مسکراتے رہتے ۔ اونچے درختوں کے جھلملاتے سائے میں سبزہ انگڑائیاں لیتا رہتا ۔

تین چار دن کے بعد پھر اس نے ثروت کے برآمدے میں کھڑے ہو کر موسم کی لطافتوں سے مسحور ہوتے ہوئے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی ۔۔۔

اس کی ممی نے دروازہ کھولتے ہوئے بڑی پر تپاک مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا ۔۔۔

"محسن صاحب ! بڑا افسوس ہے ۔ بے بی کو ابھی ابھی خلیق باہر لے گیا ہے ۔ وہ بھی آپ ہی کی طرح بڑا سمارٹ ہے ۔ ہمدرد ہے ۔ خوش مزاج ہے ۔۔۔ بے بی تو اس کا ذکر کرتے کرتے پاگل ہوئی جاتی ہے ۔ آج وہ اپنی نئی اوپن کیڈلک لایا تھا ۔ دونوں ذرا سیر کے لئے گئے ہیں ۔"

پھر ہفتہ بھر بعد اس نے گھبرا کر زور سے گھنٹی بجائی ۔

اس کی ممی نے ہنس کر کہا ۔ "آپ اب آئے ہیں محسن صاحب ! ۔۔۔ صرف پانچ منٹ کا وقفہ ہوا ہے ۔ بے بی کو خلیق تو کسی وقت چھوڑتا ہی نہیں ۔ ابھی ابھی دونوں چائے پی کر اٹھے تھے ۔ کہنے لگے اب کہاں جائیں ؟ میں نے کہا سیر کرنے چلے جاؤ ۔۔۔ آپ نے جو پل بنوایا ہے وہی دیکھنے کے لئے گئے ہیں ۔۔۔"

"بیٹھئے نا ۔۔۔ آئیے ۔۔۔"

اس نے بید کی آرام کرسی گھسیٹی ۔۔۔ اور بڑے تھکے تھکے انداز میں آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا ۔

"مسٹر محسن !۔۔۔ وہ خوش ہو کر اپنی ابروؤں کی محرابوں کو جھٹکتے ہوئے بولیں ۔۔۔ " بات یہ ہے کہ ثروت آج کل بہت خوش ہے ۔ کہتی تھی کہ مسٹر محسن تو سرکاری ملازم ہیں ۔ کسی وقت بھی ان کی ٹرانسفر ہو جائے گی اور وہ یہاں سے چلے جائیں گے ۔ لیکن خلیق سرکاری آدمی نہیں ہے ۔ اس نے یہاں بنگلہ بھی خرید لیا ہے ۔ فریجڈ ئرکمپنی کا مالک بھی ہے ۔ بے بی اپنا گھر چھوڑ کر کہیں جانا پسند بھی نہیں کرتی ۔ پھر ان کے سوا میرا اس دنیا میں اور ہے بھی کون ؟ ۔۔۔ انہوں نے آبدیدہ ہو کر گریبان میں سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں پونچھیں ۔۔۔ اور اس کی طرف فریاد بھری نظروں سے دیکھا ۔

محسن آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا ۔ اس کو اچانک یوں لگا جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ گھول کر اسکے کانوں میں ڈال دیا ہو ۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھا :

ثروت کی ممی نے بڑے پیار سے اس کے بازو کو تھپتھپاتے ہوئے اپنا منہ اس کے رخسار کے قریب لاکر اپنی ایک آنکھ شرارت سے مٹکاتے ہوئے کہا — "بے بی بڑی خوش ہے اور اس کے ڈیڈی کی دلی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ خوش رہے۔ خلیق نے اپنے خلوص کو بڑی اچھی طرح نبھایا ہے۔ خوب ہے خلیق بھی۔"

وہ اندر ہی اندر بل کھاتا ہوا گہری گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور وہ بڑی رازداری سے برابر کہے جا رہی تھی — "کچھ مدت کے بعد ان دونوں کا ارادہ شادی کرنے کا بھی ہے — آپ بے بی کو ضرور مبارکباد دیجئے گا۔"

محسن کو ایک دم یوں لگا جیسے اس کے خوابوں کا محل بڑی اونچائی سے گرتا ہوا زمین پر چکنا چور ہو گیا ہو۔

"جی ہاں۔ ضرور دوں گا" اس نے اٹھ کر کہا — اور پھر بولا "خدا حافظ!"

وہ اس رات بالکل نہ سو سکا — نہ معلوم یہ بدلتے ہوئے موسم کا تقاضا تھا یا اس کے اندر سلگتی ہوئی آگ کی تپش کا۔۔

پندرہ بیس دن بڑی بے دلی سے اپنے کام پر جانے اور واپس آکر اپنے کمرے میں بند ہو جانے کے بعد آخر کار اس نے اپنی بڑھتی ہوئی ناکامیوں سے گھبرا کر میڈیکل سرٹیفکیٹ چسپاں کرتے ہوئے ٹرانسفر کی درخواست دے ڈالی — اور خود بیمار نہ بھی ہوتے ہوئے اپنے کمرے کی گہرائیوں میں جا چھپ کر مقید ہو گیا۔

پھر کئی دنوں کے بعد ایک شام کو وہ اپنے ٹرانسفر کے آرڈر بڑی احتیاط سے الماری میں رکھ کر کلب میں اپنی آخری شام گزارنے اور ثروت کو ایک نظر دیکھ لینے کے ارادے سے چلا گیا۔

لوگ بڑی دلچسپی سے اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے ہال میں بڑے زور شور سے برج چل رہی تھی۔ ساتھ کے کمرے میں ٹیبل ٹینس کی کھٹاکھٹ سنائی دے رہی تھی۔ قہقہے تھے، چہچہے تھے۔ اور شام بڑی خوشبوؤں سے مسکرا رہی تھی۔

اس نے اپنی متجسس نگاہیں چاروں طرف دوڑائیں — وہ جدھر سے بھی گزرتا ہنستے ہوئے چہرے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے — ہیلو محسن! — ہیلو محسن —!

اور وہ ہنستا — ایک بوجھ تلے دبا دبا مسکراتا ہوا اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کسی کو سلام کرتا — کسی سے ہاتھ ملاتا ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں سے گزرتا گیا۔ ثروت اس کو لوگوں کے ہجوم میں کہیں بھی نظر نہ آئی —

بلیرڈ روم میں سے نکل کر وہ لان میں آ گیا — اور ایک دم کچھ دیکھ کر ٹھٹک گیا — وہ ڈاکٹر ہاشمی کے ساتھ ایک سرخ رنگ کے صوفے پر بڑی خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی محسن نے محسوس کیا کہ وہ انتہائی زرد اور کمزور نظر آ رہی ہے —

"ہیلو ڈاکٹر — مزاج بخیر!" وہ بناوٹی مسکراہٹ سے خود کو سنبھالتا ہوا آگے بڑھا اور قریب ہی ایک کرسی گھسیٹ کر سامنے میز پر رکھے ہوئے گلدان میں سے جھک کر ایک پھول کو سونگھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"ہیلو — مس ثروت — میں نے تو آپ کو دیکھا ہی نہیں — کیا حال ہے — بہت دنوں کے بعد نظر آئیں۔"

"جی ہاں —!" وہ اس کے پُرتکلف انداز اور لہجے کی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے سوچ سوچ کر بولی — "کئی دنوں سے کہیں باہر جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا — بس گھر میں ہی ......"

"کیا کوئی خاص مصروفیت تھی؟"

جی نہیں ۔ بس یونہی ۔۔۔ وہ اپنے چھوٹے سے سفید رومال میں لگی ہوئی لیس سے کھیلتے کھیلتے رک کر بولی ۔ آپ بھی تو بہت دنوں کے بعد دکھائی دیتے ہیں "

جی ہاں ۔۔۔ درست فرمایا آپ نے ۔۔۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی ٹرانسفر کے سلسلے میں مصروف تھا ۔ آج آرڈر مل گئے ہیں تو ذرا سی فرصت ہونے پر یہاں چلا آیا ۔

آپ کی ۔۔۔۔ ٹرانس ۔۔۔۔ فر ۔۔۔۔ وہ رک رک کر بولی ۔ اور پھر اُس نے اپنے بے جان ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے ۔ اور وہ بڑی معصوم ہو کر ٹینس لان کی طرف دیکھنے لگی جہاں سفید سفید وردیوں والے مارکر ٹینس کی اچھلتی ہوئی گیندیں لپک لپک کر اٹھا رہے تھے ۔

مسٹر محسن ۔۔۔ بھئی یہ مس باجوہ کھیلتی خوب ہے ۔ کس پھرتی سے گیم کو سنبھالتی ہے ۔ ڈاکٹر ہاشمی نے ایک دبلی پتلی کٹے ہوئے بالوں والی لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ گیند کو یوں جھک کر اس غضب سے شاٹ مارتی ہے ۔ جیسے کوئی لچکتی ہوئی ڈالی زمین پر جھک جھک دہری ہو جائے

" خوب کہی ڈاکٹر ۔۔۔ آپ تو شاعر ہو گئے " ۔ وہ ہنس کر بولا ۔۔۔

" دوسری سائڈ بھی تو غضب کی ہے ۔ مقابلہ برابر کا ہی ہے ۔۔۔ معاف کرنا ذرا مسٹر محسن " ۔۔۔ ڈاکٹر نے اچٹتی ہوئی ایک نظر اُن دونوں پر ڈالی اور کھڑا ہو گیا ۔۔۔

" میں ابھی آیا "

" ڈاکٹر صاحب ۔۔۔ وہ انہیں روکتے ہوئے بولا ۔ " کھیل تو یہاں سے بھی بڑی اچھی طرح نظر آ رہا ہے "

" نہیں بھئی ۔۔۔ وہاں بیٹھ کر دیکھنے میں زیادہ لطف آئے گا "

اور ڈاکٹر اپنی چھڑی سنبھال کر لان کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا ۔

" خوب ۔ اِس عمر میں ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی قابلِ رشک ہے " محسن بڑا محظوظ ہو رہا تھا ۔

وہ دونوں لان میں تنہا بیٹھے تھے ۔ شام کی ہوا خراماں خراماں اُن کے بالوں کو چھیڑتی ہوئی لان میں سے گزر رہی تھی ۔

" تو پھر آپ یہاں سے جا رہے ہیں ؟ ثروت نے بڑے دبے دبے لہجے میں کہا ۔۔۔

جی ہاں ۔۔۔ وہ کرسی پر اطمینان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔ پھر ایک لمبا سا سانس کھینچتے ہوئے بڑی بے رخی سے بولا " دیکھئے نا ۔ میرے یہاں رہنے نہ رہنے سے کوئی خاص فرق بھی تو نہیں پڑتا "

ہوں ۔ وہ خاموش ہو گئی لیکن اُس کی جھکی جھکی نگاہوں اور رک رک کے انداز سے ظاہر تھا کہ اُس کے دل میں کوئی طوفان مچل رہا ہے اور وہ کچھ کہنا چاہتی ہے پھر وہ دونوں بالکل خاموش بیٹھے رہے ۔ لوگ ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے گزرتے رہے ۔ فضا میں کھیلنے والوں کی سیٹیاں گونجتی رہیں ۔ اور شام ڈھلتی رہی کچھ دیر کے بعد محسن اٹھتے ہوئے بولا ۔ مس ثروت ۔ معاف فرمایئے گا ۔۔۔ مجھے ذرا جلدی ہے ۔ ابھی سامان بندھوانا ہے اور ایک دو آدمیوں سے ملنا بھی ہے آپ کی ممی تو بخیریت ہوں گی ۔ افسوس ہے کہ میں رخصت ہوتے ہوئے اُن سے نہ مل سکا ۔۔۔ اچھا ۔ خدا حافظ ۔

" ذرا ٹھہریئے " ۔ اُسکے لہجے میں التجا تھی ۔ وہ اُس کی طرف منت سے دیکھتے ہوئے بولی ۔ آج رات آپ کیا ہمارے گھر نہ آ سکیں گے ؟

" آپکے دولت خانے پر ؟ وہ طنز سے بولا " کیا کوئی خاص تقریب ہے " ؟

جی نہیں ۔ وہ رک گئی ۔۔۔ پھر سر جھکا کر بولی ۔۔۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے ۔

"جلدی سے کہہ ڈالئے — میں مشکور ہوں گا" وہ پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "جلدی کہئے — کیا کہنا چاہتی ہیں آپ"
روما کے گھومنے پھرنے سے ملول ہو گئی — سر جھکائے جھکائے بڑے کھوئے کھوئے لہجے میں یوں بولی جیسے وہ کسی ٹوٹے ہوئے جملے کو جوڑنے میں ناکام رہی ہو۔ مناسب الفاظ اور انداز کا سہارا نہ ملنے کی وجہ سے بالکل بے بس اور مجبور ہو رہی ہو۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

"خلیق نہیں آئے آج؟" محسن نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ایک چوٹ اور کی۔ اور اس نے تڑپ کر اپنی نگاہیں یوں اس کے چہرے کی طرف اٹھائیں جیسے اسے بڑی تکلیف ہوئی ہو۔

اچھا — اجازت دیجئے —

"مسٹر محسن — پھر آپ آئیں گے نا — میں آپ کا انتظار کروں گی"

دیکھئے مس ثروت — مجھے صبح چار بجے کی گاڑی سے روانہ ہونا ہے۔ اگر آپ کا اصرار ہے تو میں ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن آپ انتظار نہ کیجئے گا"

اور پھر وہ ٹیرس سے ہوتا ہوا — لان کے پھولوں بھرے راستے سے گزرتا ہوا ہال میں جا پہنچا جہاں لوگ کھیل ختم کر کے تبصروں میں مصروف تھے۔
اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی میں سے لان کا وہ حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جہاں سے وہ ابھی اٹھ کر آیا تھا۔ ڈاکٹر اپنی جگہ واپس آ چکا تھا۔ اور ثروت کرسی کا سہارا لئے ماتھے کو اپنی انگلیوں میں تھامے بڑی اداس بیٹھی تھی۔

پھر جب وہ اپنے بنگلے کی طرف قدم بڑھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ تو راستے ہی میں اس کو خلیق مل گیا ——

ہیلو محسن — اس نے شام کے دھندلکے میں اس کو پہچان کر دور ہی سے ہاتھ بڑھا دیا۔

ہیلو خلیق — وہ بڑی رکھائی سے بولا — کہاں سے آ رہے ہو۔ آج کلب نہیں آئے — میں؟ ارے چھوڑو — میں کلب کب جاتا ہوں —
یہ سرخ بنگلہ ہے نا — اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا — یہی جو ایک مدت سے خالی پڑا تھا۔ یہاں ایک نئی فیملی آ گئی ہے کوئی ڈپٹی صاحب ہیں۔ بڑی اچھی فیملی ہے۔ خوب بہت ساری لڑکیاں ہیں۔ ایک سے ایک سمارٹ"

محسن سنتے ہی رہ گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے بتی جلائی اور تعجب سے بولا "نئی فیملی؟ بہت سی لڑکیاں؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو"

"میں غلط نہیں کہہ رہا۔ میں نے سنا تھا کہ تم آجکل بیمار ہو۔ اسی لئے تمہیں دیکھنے وہیں سے چلا آ رہا ہوں — سناؤ کیا حال ہے تمہارا"

محسن نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا — اور بعد خاموشی سے ایک کرسی اس کی طرف بڑھا دی۔

نہیں بھئی۔ میں تو میز پر ہی بیٹھوں گا۔ خلیق اوپر اچکتے ہوئے بولا۔ اور پھر وہ اس کی کتابوں اور کاغذات سے بھری ہوئی میز پر آرام سے ٹک گیا —

"بھئی یہ کیا اپنی جان کو روگ لگائے بیٹھے ہو — یہ اترا ہوا چہرہ — یہ روکھا پھیکا انداز کسی ڈاکٹر سے مشورہ بھی لیا؟"

نہیں خلیق! وہ ایک لمبا سانس لیتے ہوئے بولا۔ میں نے اپنی ٹرانسفر کرا لی ہے۔ اب دوسری جگہ جا کر کسی ڈاکٹر سے مشورہ لوں گا"

"ٹرانسفر؟ تمہاری ٹرانسفر؟ ہاں مذاق کرتے ہو — اتنی خوبصورت جگہ — اتنا رومان پرور ماحول — تمہیں کس حکیم نے کہا تھا کہ یہاں سے ٹرانسفر کرواؤ"

بھئی یہاں سے دل اکتا گیا تھا اس لئے کروا لی — وہ بے دلی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا —

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ صرف کھڑکی میں رکھی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک کمرے کے سکوت میں سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد محسن آنکھیں جھپکتا ہوا بولا — یار میں تو تمہیں تمہارے انتخاب پر مبارک باد دینا ہی بھول گیا۔ کہو پھر کب تک خوشخبری سنا رہے ہو؟

"میرا انتخاب ! کیسا ؟ کیسی خوشخبری ۔" سچ کہو" نعیق کا صاف رنگت پر ایک چمک سی آگئی

" میرا مطلب ثروت سے ہے ۔" محسن نے بڑے افسردہ لہجے میں کہا ۔

ارے وہ ! نعیق زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا ۔ ڈاکٹر ہاشمی کی لڑکی سے تمہارا مطلب ہے !

" ڈاکٹر ہاشمی " ! محسن کو جیسے بچھو نے زور سے ڈنک مارا اور اس کے زہر سے اس کا چہرہ سیاہ ہوگیا۔ " ہاں ہاں ۔۔ ڈاکٹر ہی تو ہے ۔۔ وہ بوڑھا ۔۔ سفید بالوں والا ۔"

" نہیں یار وہ تو کسی بڑے آدمی کی لڑکی ہے ۔۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ۔"

ارے نہیں ۔۔ میں تو اس کو جنم جنم سے جانتا ہوں ۔۔ یار میرے تمہیں غلط معلومات دی ہیں کسی نے ۔۔ ثروت ڈاکٹر کی لڑکی ہے ۔ اور اس کی ماں اپنے زمانے کی مانی ہوئی بدچلن عورت تھی ۔

" نہیں بھئی میں کبھی مان ہی نہیں سکتا ۔"

" نہ مانو ۔"

" تو پھر وہ سرجمال الدین ۔۔ وہ جاگیریں ۔ وہ سامان ۔"

بابا ۔۔ مختصر سی بات یوں سمجھو کہ ثروت کی ماں اپنے حسن کی بدولت ایک جاگیردار کی منظورِ نظر بن گئی ۔۔ ثروت کی پیدائش انہی دنوں میں ہوئی ۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس جاگیردار کو ڈاکٹر ہاشمی کی حقیقت اور اہمیت کا اندازہ ہوا تو اس نے ناکام ہو کر خود کو ہلاک کر لیا ۔۔ وہ تو سوچتا تھا کہ اب یہ ایک شریفانہ زندگی بسر کرے گی ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا ۔۔

" تو ڈاکٹر ہاشمی " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" ہاں ہاں ۔۔ وہ تو ثروت کی ماں کے ساتھ فیملی ڈاکٹر کی حیثیت سے سائے کی طرح ساتھ ساتھ رہتا تھا ۔۔

" تم جھوٹ کہتے ہو " محسن ساری بات سن کر بڑے کرب میں چلّایا ۔۔

" محسن ۔۔ میرے دوست ۔ اپنی بات پہ ضد سے اڑ جانا تو تمہاری بڑی پرانی عادت ہے " ۔۔ وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سختی سے بولا ۔ لیکن تم نے آج میرے وقار کو سخت صدمہ پہونچایا ہے ۔ میں تمہیں کبھی بھی معاف نہیں کر سکتا ۔

محسن کی نظروں میں در و دیوار جل رہے تھے ۔۔ پھر بھی وہ بڑی ہمت کر کے بولا ۔ " کیوں ؟ "

تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو ! یاد رکھو ۔۔ تمہارا دوست دوسروں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں سے پیٹ بھرنے پر فاقوں سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کو ترجیح دیتا ہے ۔

لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری بھی تو سنو ۔۔

میں کچھ نہیں سنوں گا ۔۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے اتنا ہی گرا ہوا سمجھ لیا ہے کہ میں اُن گری پڑی عورتوں کو اپنے نام کے ساتھ چپکا کر دنیا سے نظریں چار کرنے کی ہمت کروں ۔۔ اور پھر ایسی فاحشہ عورتوں کو جن کے سر پہ ہزاروں کا قرض ہے ۔ جن کا بنگلہ رہن ہے اور جو اپنی قرقی کے خوف سے بچنے کے لئے ، نوجوان کے دامن کی پناہ ڈھونڈتی ہیں ۔۔ اونہہ ۔۔ بس جانے دو دیکھ لی دوستی ۔۔ وہ میز پہ سے اٹھ کر باہر جانے کو تیار ہو گیا ۔۔ .

"خلیق!"—— وہ جیسے کرب میں چلایا —— "تو پھر تمہارا یہ میل جول —— یہ رقابت" —— یہ سیر! اُس نے پیٹھ موڑ کر جاتے ہوئے خلیق کا بازو پکڑ کر اُسے
واپس اپنے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے پوچھا —— "بھائی میرے —— یہ تو کھلونے ہیں چینی اور کانچ کے کھلونے —— نازک —— نفیس اور خوبصورت گڑیاں"
"خلیق!" جیسے وہ اُس کی بات نہ سمجھ سکا

"ہاں ہاں —— غلط تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ ان کے پاش پاش ہوتے ہوئے ٹکڑوں کی جھنکار پر خوش ہو کر کھکھلاؤ —— اور آگے بڑھ جاؤ —— لیکن یاد رکھو —— اگر بھولے سے بھی کبھی تم نے ان کرچیوں کو جمع کر کے جوڑنے کی کوشش کی تو تمہارے ہاتھ لہولہان ہو جائیں گے۔"

"خلیق —— بس کرو —— بس کرو اپنا یہ لیکچر"——

وہ کرسی میں دھنسا بیٹھا خلیق کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کی نظروں کا مرکز خلیق کے ہونٹ تھے۔ طنز سے مسکراتے —— سکڑتے اور پھیلتے ہوئے ہونٹ۔

"بے شک میری بات نہ مانو —— مگر اتنا اور بتا دوں کہ میں نے تمہیں غلط راستے پر جاتے ہوئے ثروت سے میل جول بڑھا کر تمہیں صحیح راہ دکھا دی ہے اب تم ان اندھیروں میں بھٹکنے کی بجائے ایک سیدھی اور روشن شاہراہ پر کھڑے ہو —— اور آج میں اس ارادے سے بھی یہاں تمہارے پاس آیا تھا ——
تم کو یقیناً ثروت سے علٰحدہ ہونے کا غم ہوگا —— لیکن یاد رکھو —— تم سے پہلے بھی اُس کی زندگی میں ہزاروں نوجوان آئے اور چلے گئے —— اب تم چلے جاؤ گے تو اور کوئی آ جائے گا"——

محسن خاموش بیٹھا رہا —— اُس کے لبوں پر کوئی مسکراہٹ نہ تھی۔ نہ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر تھا —— غم کا —— نہ خوشی کا ——

"اچھا۔ لاؤ سگریٹ تو دو" —— خلیق اپنی جیبیں ٹٹولتا ہوا بولا —— "آج میں اپنی ڈبیہ ساتھ لانی بھول گیا"

اور اُس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈبیا اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر اُس نے سوچ سوچ کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبا کر سلگایا اور اپنے نتھنوں اور گلے میں سے رُکا رُکا دھواں کمرے کی گھٹی گھٹی فضا میں پھونک مار کر اڑانے لگا۔

خلیق نے دیوار میں لگے ہوئے آئینے میں جھانک کر اپنے بال سنوارے —— پھر اپنی ٹائی کی ناٹ کو درست کرتے ہوئے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوتے ہوئے بولا —— "تمہیں میری بات بُری تو نہیں لگی ؟"

"نہیں نہیں ...." وہ زبردستی ہنسا —— اور خلیق اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سیٹی بجاتا ہوا برآمدے کی اونچائی پھلانگ کر نیچے اتر گیا۔

رات کے بارہ بجے تک وہ ثروت کے بنگلے کے سامنے سر جھکائے ٹہلتا رہا۔ سڑک پر ہلکی ہلکی کھمبوں کی روشنی آڑے ترچھے زاویوں میں پھیل رہی تھی لیکن اُس کے بنگلے میں سارے روشنی کے دن سا چڑھا ہوا تھا۔

بڑی دیر تک وہ اپنے خیالوں میں مگن اس اُلجھن کی گتھیوں کو سلجھانے اور اُلجھانے میں مصروف تھا کہ کسی کو دلدل سے باہر نکالنے اور بہار اپنے میں زندگی اپنی معراج پر پہنچتی ہے یا داغدار ہو جاتی ہے ؟ وہ اندر جا کر ثروت کی بات سن لے یا نہیں !

اُس نے اپنے قدم اُس کے پھاٹک کی طرف بڑھائے اور دُور ہی سے درختوں کی اوٹ میں سے چھپ کر دیکھا۔ برآمدے کے سامنے کچی سڑک پر ہلکی ہلکی روشنی میں کوئی سایہ بڑی بے تابی سے آگے پیچھے ٹہل رہا تھا۔

محسن ٹھٹک کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اُس نے غیر ارادی طور پر اپنے قدم اپنے بنگلے کی طرف موڑ لئے۔ اور اپنے پلنگ پر شکستہ دل

ہو کر اس کشمکش میں ڈوب گیا کہ اپنی ٹوٹی ہوئی محبت کے ٹکڑوں کو سمیٹے یا ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جائے ۔

وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا ـــــ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے رات کی کئی منزلیں آنکھوں ہی میں گزار دیں ـــــ

صبح تین بجے اُٹھ کر اُس نے شیو کیا۔ ملازم کو آواز دے کر چائے منگوائی ـــــ اور پھر سامان کار میں رکھ کر وہ آخری مرتبہ ثروت کے بنگلے کی طرف چلا ـــــ

آسمان پر ستارے رخصت ہو رہے تھے۔ اور صبح کا اُجالا چپکے چپکے آگے بڑھتا آ رہا تھا ـــــ

برآمدے میں پھر اُس نے دیکھا کہ بتی جل رہی تھی ـــــ اُس نے کار قدرے فاصلے پر روک لی۔ خود دبے پاؤں پھاٹک کی طرف بڑھا۔ اُس نے پھر سے اندر دیکھنے کی کوشش کی۔ اور وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔

گملوں اور پودوں سے گھرے ہوئے برآمدے میں بوڑھا ڈاکٹر اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنے رات کے سناٹے میں آہستہ آہستہ کسی کو اپنے بازو کا سہارا دیئے گیلری کی طرف لئے جا رہا تھا۔

اُس کا جی بے اختیار چاہا کہ وہ بے تحاشا بھاگتا ہوا اندر چلا جائے اور ثروت کو اپنے بازو کا سہارا دیتے ہوئے کہے ـــــ "آؤ ـــــ ایک پیمان باندھیں۔ ایک عہد کریں۔ گزری ہوئی باتیں بھول کر ایک حسین زندگی گزارنے کا ـــــ

لیکن ڈاکٹر کا سفید سر دیکھ کر ایک دم اُس کے سب ارادے ختم ہو گئے ـــــ اُس کی ساری ہمت جواب دے گئی ... ۔

دونوں سائے آہستہ آہستہ گیلری کے اندھیروں میں چھپ گئے تو اُس کو یوں لگا جیسے وہ دلدل میں گرتے ہوئے ایک بھاری ستون کو اٹھاتے اٹھاتے ہانپ رہا ہے اُس کے بازو شل ہو گئے ہیں اور کیچڑ کے بدنما دھبوں سے اُس کی شفاف پیشانی اور اُجلا دامن داغدار ہو گئے ہیں۔

وہ بوجھل قدموں سے واپس اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے کوٹ کا کالر اپنے کانوں تک اونچا کر لیا۔ اور پھر صبح کے پھیلتے ہوئے غبار میں کار کا اسٹیئرنگ تھام کر یوں ہلکی رفتار سے اسٹیشن کو جانے والی سڑک پر روانہ ہو گیا۔

○

تھی وہ اِک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

(اقبال)

برٹ ہارٹ　　　　تلخیص و ترجمہ: یعقوب چودھری

بچہ

(برٹ ہارٹ امریکہ کا مشہور ادیب ہو گزرا ہے۔ ۱۸۳۶ء میں البانی (نیویارک) میں پیدا ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں وہ مشہور اہلِ قلم مانا گیا۔ اس کا بہترین افسانہ (THE LUCK) تھا جس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اسی افسانہ نے اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر صفِ اوّل کے ادیبوں کا ہم پایہ ادیب بنا دیا۔ اس کی مشہور نگارشات میں افسانہ THE OUTCAST OF POKERFLAT اور ایک نظم بعنوان PLAIN LANGUAGE FROM TRUTHFUL JAMES. شامل ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں وہ نیویارک میں فوت ہوا۔)

یعقوب چودھری

"رورنگ کیمپ" میں آج ایک ہنگامہ سا برپا تھا لیکن یہ ہنگامہ ان ہنگاموں سے مختلف تھا جو اس سے پہلے اکثر اس بستی میں ہوتے رہتے تھے۔ بستی کے باہر اس کے قریباً تمام باشندے جمع تھے۔ وہ تمام ایک بدنما سے کیبن کے ارد گرد مختلف گروہوں میں جمع تھے۔ ہر گروہ کے آدمی دبے دبے لہجے میں باتوں میں مصروف تھے۔ ان باتوں میں ایک عورت کا نام بار بار دہرایا جا رہا تھا اور یہ نام ان کے لئے نیا نہیں تھا۔ ایک پرانا نام تھا "چیروکی سال!"

اس عورت کے متعلق زیادہ تشریح کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ یہ اس بستی میں بسنے والی واحد عورت تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی عورت نہیں تھی۔ باقی تمام مرد ہی آباد تھے۔ یہ عورت ہر خاص و عام کی نظروں میں ایک آبرو باختہ عورت تھی۔

اس وقت اس عورت کی حالت بہت نازک تھی۔ اسے اپنے علاج کے لئے مردوں سے زیادہ عورتوں کی ضرورت تھی۔ کیبن کے اندر وہ تنہا ایک چارپائی پر پڑی ہوئی تڑپ رہی تھی۔ اس کی خبر لینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ سخت خطرے میں تھی اور زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھی۔ اُسے اپنے پہلے ہی گناہ کی بڑی خوفناک سزا مل رہی تھی۔ یہ کیا کم سزا تھی کہ اس نازک وقت میں جب کہ اسے کسی عورت یا کسی تجربہ کار نرس کی ضرورت تھی وہ صرف مردوں کے رحم و کرم پر تھی۔ اور مرد بھی وہ جنہوں نے کبھی اس قسم کے معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔ ان کی تمام عمر فتنے اٹھانے اور ہنگامے برپا کرنے میں گزری تھی۔ اگرچہ وہ سب لوگوں کی نظروں میں گری ہوئی عورت تھی پھر بھی اس وقت وہ چند تماشائیوں کے دلوں میں رحم کے جذبات پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ "سینڈی ٹپ ٹون" سوچ رہا تھا کہ اس عورت پر بڑا "برا" وقت آن پڑا ہے۔ سینڈی ایک جوئے باز تھا اور اس وقت بھی اس کی جیب میں ایک "یکہ" اور دو "غلام" پڑے ہوئے تھے۔

یہ واقعی ایک عجیب مرحلہ تھا۔ اس بستی میں آج موت کی بجائے ایک زندگی جنم لے رہی تھی۔ اگر اس بستی میں کسی کی موت واقع ہو جاتی تو

کی بھی آنکھ نم نہ ہوتی تھی۔ اور پیدائش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اس بستی میں سوائے "چیروکی سالی" کے کوئی عورت نہ تھی اور وہ عورت بھی آج پہلی دفعہ ایک نئی زندگی کو جنم دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ پیدائش اس بستی میں ایک انوکھی بات تھی۔ اس بستی میں سے اکثر لوگوں کو ہمیشہ کے لئے جلا وطن بھی کر دیا جاتا تھا۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ باہر سے کوئی شخص اس بستی میں داخل ہو کر یہاں کا باشندہ بن بیٹھا ہو۔ یہاں تمام جرائم پیشہ لوگ آباد تھے۔ اور شریف لوگ تو کافی مدت ہوئی اس بستی کو خیرباد کہہ چلے تھے —— آج ہر شخص پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ کیونکہ ایک فرد براہِ راست اس بستی میں داخل ہو رہا تھا۔ مگر بستی کا قانون ان کے سامنے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

"سٹمپی!" ایک بھاری اور مضبوط جبڑے والے معزز شہری کینٹک نے ایک آوارہ گرد بوڑھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
"تم اندر جاؤ اور جو کچھ تم سے ہو سکے کرو۔ میرے خیال میں تم ایسے معاملات میں کافی تجربہ رکھتے ہو"

کینٹک نے شاید ٹھیک انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ اس پر کسی شخص نے بھی اعتراض نہ کیا۔ سٹمپی روئرنگ کیمپ سے دُور کسی شہر میں دو خاندانوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ اور اس کو پیدائش اور موت کے معاملات میں کافی تجربہ تھا۔ تمام لوگوں نے سٹمپی کو موزوں قرار دیا۔ سٹمپی تمام لوگوں کے سامنے تعظیماً تھوڑا سا جھکا اور پھر کیبن کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ باقی تمام لوگ باہر بیٹھ کر بچے کی پیدائش کا انتظار کرنے لگے۔

وہاں قریباً ایک سو آدمی جمع تھے۔ ان میں سے کچھ پہلے محکمہ انصاف سے متعلق تھے۔ مگر اب مجرموں میں شمار ہوتے تھے۔ بعض عادی مجرم تھے اور باقی تمام بھی شریفوں میں نام لکھانے کے قابل نہ تھے۔ جسمانی طور پر بھی ان میں سے کوئی شخص مکمل نہ تھا۔ سب سے بڑا بدمعاش کسی لڑائی میں اپنا ایک کان کھو بیٹھا تھا۔ اوک ہرسٹ مشہور جوئے باز اپنی پُروقار شخصیت کے باوجود دلوں کو مسخر نہیں کر سکتا تھا۔ سب سے زیادہ بہادر شخص کے داہنے ہاتھ کی تین انگلیاں غائب تھیں۔ اور اسی طرح سب سے اچھے نشانے باز کی ایک آنکھ غائب تھی۔

یہ بستی دو پہاڑوں اور ایک دریا کے درمیان تکونی وادی میں واقع تھی۔ باہر کی دُنیا سے اس بستی کو صرف ایک تنگ راستہ جاتا تھا۔ جو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے اترتا ہوا اس کیبن کے سامنے ختم ہو جاتا تھا۔ اب رات ہو گئی تھی اور آسمان پر چاند نکل آیا تھا۔ چاند کی چاندنی میں کیبن اور اس کے ارد گرد کے ماحول پر ایک پُراسرار کیفیت چھا گئی تھی۔ کچھ لوگ سُلگتے ہوئے صنوبر کی لکڑی سے جلتے ہوئے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ اور باقی کیبن کے قریب منتظر تھے۔ ان لوگوں میں سے اکثر کے جسم تو کیبن کے باہر تھے۔ مگر اُن کے دماغ کیبن کے اندر کی فضا کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ اچانک کیبن کے اندر ایک چیخ بلند ہوئی۔ جو صنوبر کے سرسراتے ہوئے پتّوں کی آواز، بہتے ہوئے دریا کے شور اور الاؤ میں چٹختی ہوئی لکڑیوں کی آواز پر حاوی ہو گئی۔ اب معلوم ہوا گویا صنوبروں نے گنگنانا بند کر دیا ہو۔ دریا نے بہنا بند کر دیا ہو اور الاؤ میں جلتی ہوئی لکڑیوں نے چٹخنا ختم کر دیا ہو۔ شاید قدرت خود بھی ایک لمحہ کے لئے مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔

تمام لوگ یک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بچہ عالمِ وجود میں آ چکا تھا۔ کچھ لوگوں نے بارود کے ایک ڈرم کو اُڑا کر دھماکا پیدا کرنے کی تجویز پیش کی۔ مگر زچہ کی حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے چند ریوالوروں سے ہوائی فائر کرنے کا فیصلہ ہوا اور پہلی تجویز رد کر دی گئی۔

زچہ کو شاید اچھی طبی امداد میسر نہ آ سکی تھی اس لئے اُس کا سانس ڈوبنا شروع ہو گیا اور تقریباً ایک گھنٹہ بعد اُس نے دم توڑ دیا۔ وہ اس دُنیا کی شرمناک زندگی سے نجات پا گئی ——

"چیروکی سالی" کی موت کا اعلان ہوا تو کسی نے بھی دھیان نہ دیا۔ البتہ وہ اس بات پر بہت فکرمند ہوئے کہ اب بچے کا کیا بنے گا۔ کیا وہ

"زندہ رہ سکے گا؟" ہر شخص کے دماغ میں یہی سوال گونج رہا تھا۔ سٹمپی سے بعض لوگوں نے یہی سوال کیا۔ اس کا جواب شک سے مبرا نہ تھا۔ بچے کی زندگی کا دارومدار صرف گدھی کے دودھ پر تھا۔ مگر اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ بچے کا بچنا محال ہے۔ بہرحال سٹمپی کے کہنے کے مطابق گدھی کا دودھ حاصل کیا گیا اور بچے کو پلایا گیا۔ تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔ بچے نے خوب سیر ہو کر گدھی کا دودھ پی لیا تھا۔ اس پر تمام لوگوں کے چہروں پر بشاشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

پھر ایک گھنٹہ زچہ اور بچہ کو سنبھالنے میں صرف ہوگیا۔ مردہ زچہ کے جسم کو کمبل سے ڈھانپ کر کیبن کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اور بے تاب لوگوں کا ہجوم جو اب تک ایک قطار کی شکل اختیار کر چکا تھا اندر داخل ہونے لگا۔ زچہ کی چارپائی کے قریب صنوبر کی لکڑی کی ایک میز پر بچہ سرخ فلالین کے کپڑے میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ بچے کے قریب ایک صندوق پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔ اور قریب ہی ایک ہیٹ پیالے کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔ ہیٹ کو اس انداز میں رکھنے کی وجہ بھی جلد ہی سمجھ میں آگئی۔ سٹمپی نے اعلان کیا "حضرات! آپ لوگ بچے کو دیکھ کر سامنے والے دروازے سے باہر نکلتے جائیے۔ لیکن جو حضرات اس یتیم بچے کی کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس ہیٹ کو اپنے سے کچھ دے کر جائیں گے۔"

پہلا آدمی جو اندر داخل ہوا اُس نے ہیٹ پہنا ہوا تھا مگر جب وہ بچے کے قریب گیا تو اُس نے بے اختیار ہیٹ کو اُتار لیا۔ اور اس طرح دوسروں کے لئے ایک راستہ کھول دیا۔ چنانچہ اب ہر شخص نے اندر آکر اپنے ہیٹ کو تعظیماً اتارنا شروع کر دیا۔ ہر شخص بچے کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی تبصرہ کرتا۔ سٹمپی نے جو تبصرے سنے ان میں سے چند یہ ہیں "کیا یہ وہی بچہ ہے جو پیدا ہوا ہے؟" —— "کتنا چھوٹا سا نمونہ ہے؟" —— "نہ زیادہ بڑا ہے اور نہ بہت چھوٹا ہے" —— وغیرہ وغیرہ۔

جس طرح تبصرے عجیب و غریب تھے اسی طرح ان لوگوں کی دی ہوئی چیزیں بھی عجیب تھیں۔ یہ چیزیں کچھ اس قسم کی تھیں ایک چاندی کا تمباکو دان ڈبہ۔ ایک نیوی کا ریوالور۔ چاندی کا ایک تمغہ۔ سونے کی ایک زنجیر۔ ایک خوبصورت زنانہ رومال۔ یہ اوکہرسٹ مشہور جوئے باز نے دیا تھا۔ ہیرے کی ایک پن۔ ایک انگوٹھی۔ ایک بائبل جس کا دینے والا معلوم نہ ہو سکا۔ ایک چاندی کا چمچہ۔ پانچ پونڈ کا ایک نوٹ۔ دو سو شلنگ کے رلے جلے سکے۔ اور ایک سونے کا ہیئر کلپ۔

سٹمپی اس دوران میں خاموش کھڑا رہا۔ جب کینٹک بچے کے قریب گیا تو بچے نے اچانک کروٹ بدلی اور کینٹک کی ایک انگلی جو اس کے قریب تھی پکڑ لی۔ اور پھر اُسے زور سے دبا کر اپنی طرف کھینچا۔ کینٹک کی حالت اس وقت قابلِ دید تھی۔ وہ اس وقت انتہائی احمق نظر آنے لگا تھا۔ وہ بدحواسی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس کے گالوں میں اس وقت خون کی سُرخی جھلکنے لگی تھی۔ پھر وہ سنبھل گیا۔ اُس نے آہستہ سے اپنی انگلی چھڑائی اور مسکراتے ہوئے کہا "او ننھے بدمعاش!" پھر وہ اپنی اس انگلی کو دیکھتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر جا کر وہ بار بار اس واقعے کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا رہا اور اپنے دل میں ایک عجیب لذت محسوس کرتا رہا۔ بچے کو بار بار وہ "ننھا بدمعاش" کہہ کر پکارتا رہا۔

رات کے دو بجے تک تمام لوگ گھروں کو چلے گئے۔ کینٹک اس رات بالکل نہ سویا۔ وہ تمام رات بچے کی نگرانی کرتا رہا۔ وہ ایک عجیب سے نشہ میں سرشار کیبن کے گرد گھومتا رہا۔ جب تمام لوگ گھروں کی طرف روانہ ہوگئے تو وہ دریا کی طرف چلا گیا اور دیر تک سیٹیاں بجاتا رہا۔ پھر وہ کیبن کی طرف آیا مگر خاموشی سے آگے نکل گیا۔ کچھ دُور آگے جا کر وہ مڑا مگر پھر کیبن کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہ پڑی۔ اُس کا خیال تھا کہ کہیں سٹمپی اس کی بے قراری کا مذاق نہ اڑانے لگے۔ وہ خاموشی سے دوبارہ دریا کی طرف روانہ ہوگیا مگر بے قرار ہو کر دوبارہ ... واپس آگیا اور کیبن کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ سٹمپی نے دروازہ کھولا۔

"کیسے گزر رہی ہے؟" کینلک نے پوچھا اور کیبن کے اندر صنوبر کی میز پر پڑے ہوئے بچے پر نظریں گاڑ دیں۔

"سب ٹھیک ہے!" سٹمپی نے جواب دیا۔

"کوئی گڑبڑ تو نہیں؟"

"نہیں!"

اب کینلک نے ایک جمائی لی اور اپنی وہی انگلی اٹھا کر سٹمپی کو دکھانے لگا جسے بچے نے پکڑا تھا اور کہا

"بچہ اس انگلی کو کھینچتا تھا ——————— بدمعاش!"

اور پھر بغیر کچھ کہے واپس ہو گیا

سٹمپی نے ایک عجیب انداز میں سر کو جنبش دی اور دروازہ بند کر لیا۔

اگلے روز "چیروکی سال" کی تجہیز و تکفین کے بعد بستی میں ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں نومولود بچے کے مستقبل کے بارے میں اہم فیصلہ ہوا۔ میٹنگ میں جب بچے کو کسی ایک شخص کے حوالے کر دینے کا فیصلہ ہوا تو ہر شخص اُسے لینے کا متمنی نظر آیا۔ اب اگر کسی ایک شخص کو بچہ دے دیا جاتا تو باقی مرنے مارنے پر اُتر آتے۔ چنانچہ یہ تجویز مسترد ہو گئی۔ پھر ٹپ ٹن نے یہ تجویز پیش کی کہ بچے کو ریڈ ڈاگ کی بستی میں بھیج دیا جائے۔ وہاں اُسے عورتوں کی خدمات بھی میسر آ سکتی تھیں۔ لیکن اس تجویز کی پُر زور مخالفت کی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگ اس بچے کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ٹام راتھارسن نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اگر یہ بچہ ہم ان کو دے آئیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ چند سال بعد وہ ہم کو یہی بچہ واپس کریں گے۔ دراصل "روئرنگ کیمپ" والے کسی دوسری بستی کے لوگوں پر کم ہی اعتبار کیا کرتے تھے۔

"روئرنگ کیمپ" میں بچے کے لئے کسی نرس کو منگوانے کی تجویز بھی مسترد ہو گئی۔ سب کا یہی کہنا تھا کہ اوّل تو کسی بیرونی فرد کا یہاں آ کر رہنا ہی بستی کے قانون کے خلاف ہے دوم یہ کہ کوئی شریف عورت "روئرنگ کیمپ" کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ آخر کار سٹمپی نے کہا "میرے خیال میں لوگ بچے کو اپنے سے جدا دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ اس لئے بہتر ہے کہ اسے ایک تجربہ کار شخص کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی پرورش میں تمام لوگ برابر کے حصہ دار بن جائیں۔ ہر شخص جو جی چاہے اس بچے پر خرچ کرے۔ اور بچے کو کسی ایسی جگہ رکھا جائے جہاں ہر خاص و عام ہر وقت جا کر اُسے دیکھ سکے اور اس کی خدمت کر سکے۔ یہ بچہ ہماری بستی کی ملکیت ہے اور بستی کے تمام لوگوں کا حق اسی طریقے سے ادا ہو سکتا ہے جس طرح میں نے اپنی تجویز میں کہا ہے"

یہ تجویز کافی لوگوں نے پسند کی۔ اور بالآخر سب اس پر متفق ہو گئے۔ جب لوگوں نے سٹمپی سے اُس تجربہ کار شخص کے بارے میں پوچھا کہ وہ کون ہو گا۔ تو اُس نے کہا "میں وثوق سے بچے کی زندگی کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ میں اور وہ گدھی جس کا دودھ بچہ پیتا ہے مل کر بخوبی بچے کی پرورش کر سکیں گے۔ اگر مجھ سے زیادہ کوئی تجربہ کار شخص موجود ہے تو وہ سامنے آ جائے"

کوئی شخص بھی اس ذمہ داری کو قبول کرنے نہ اٹھا۔ سٹمپی ہی سب کی نظروں میں موزوں ترین آدمی تھا۔ جو یہ کام سرانجام دے سکتا تھا۔ کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد میٹنگ کے صدر نے سٹمپی کا نام بچے کے نگران کے طور پر اعلان کر دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ بچہ گدھی کے دودھ پر پلتا رہا۔ اور صحت مند رہا۔ روز بروز اُس کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔ شاید وادی کی صحت بخش ہوا نے اُس کی کمزور خوراک کی کمی کو پورا کر دیا تھا۔ سٹمپی لوگوں کو کہا کرتا تھا "میں اس بچے کا باپ ہوں اور یہ گدھی اس کی ماں ہے"۔

جب بچہ تقریباً ایک ماہ کا ہوا تو اس کا نام رکھنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی۔ اب تک عام طور پر اُسے "ننھا" ہی کہا جاتا تھا۔ لوگ اسے "سٹمپی کا لونڈا" اور باقی "غوں غوں" (بچے کی آواز کی مناسبت سے) پکارتے تھے۔ کینٹک اُسے اب بھی ننھا بدمعاش ہی کہتا تھا۔ ان تمام ناموں کے باوجود بھی لوگ اُسے ایک خاص نام سے پکارنے کے متمنی تھے۔ جوئے باز عموماً وہم پرست ہوتے ہیں۔ ایک دن اوک ہرسٹ نے اعلان کیا کہ بچہ اپنے ساتھ رورنگ کیمپ کے لئے کسی قسم کی خوش قسمتی لایا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے وہ بہت مبارک شگون ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اسے اسی مناسبت سے "خوش نصیب" پکاریں۔ کسی کو اس کے ماں باپ کے نام پر نام رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس طرح اس بچے کے نام سے اس کی ماں کے بُرے کردار کا نقشہ لوگوں کے سامنے آجایا کرے گا۔ اور لوگ بچے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ بہتر ہے کہ پرانی یادوں کو دفن کر دیا جائے۔ اور بچے کو معصوم شمار کرتے ہوئے اس سے نفرت نہ کی جائے۔

بچے کی مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے ایک دن مقرر کر لیا گیا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اس قسم کی بستی میں جہاں تمام جرائم پیشہ اور خدا کے قانون سے باغی بستے تھے۔ مذہبی رسوم کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچی ہوں گی۔ بہرحال تمام مذہبی رسوم ادا کی گئیں۔ اور بڑی سنجیدگی سے ادا کی گئیں۔ رسوم ادا کرانے والا بڑا مشہور مسخرا تھا۔ دور سے دیکھنے پر یہ تقریب بڑی شاندار معلوم ہوتی تھی۔ ہر شخص نہایت سنجیدہ تھا۔ اور ہر رسم میں سنجیدگی سے حصہ لے رہا تھا۔ سینڈی ٹپٹن مذہبی باپ کا کردار ادا کر رہا تھا۔ آخرکار بچے کو بپتسمہ دیا گیا اور بالکل مذہبی فضا میں یہ تقریب ختم ہوئی۔

اس طرح رورنگ کیمپ میں پہلی دفعہ پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا۔ رورنگ کیمپ کچھ بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ کیبن کو "خوش نصیب" کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اب روز بروز چمکنے لگا تھا۔ کیبن کو ہر وقت صاف اور سجا کر رکھا جاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر سفیدی کرا دی گئی تھی جن پر رنگین کاغذ منڈھ دیئے گئے تھے۔ کمرے کا پرانا فرنیچر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس سے کمرے کی فضا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ جو لوگ "خوش نصیب" کو دیکھنے کے لئے آتے وہ اس تبدیلی کو بہت پسند کرتے۔ بعد میں سٹمپی نے ہر شخص پر یہ پابندی لگا دی کہ وہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر بچے کے پاس آسکتا ہے۔ ورنہ دوسری صورت میں اسے بچے کے پاس نہیں آنے دیا جائے گا۔ یہ پابندی حالانکہ بہت سے لوگوں کو ناگوار محسوس ہوئی مگر پھر بھی انہوں نے اس کو پسند کیا کیونکہ وہ بچے کو ہر حالت میں تندرست دیکھنا چاہتے تھے۔ اس پابندی سے کینٹک کو خاصی پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ ایک سرحدی علاقے کا باشندہ تھا اور اپنے جسم اور کپڑوں کی صفائی ہفتوں نہیں کیا کرتا تھا۔ بہرحال اُس نے بھی چند ہی روز میں اپنی حالت کو درست کر لیا۔ اور اب ہر وقت چمکتے ہوئے چہرے اور صاف کپڑوں میں نظر آنے لگا۔ بچے کے قریب کسی قسم کا شور مچانے کی اجازت نہیں تھی۔ اور نہ ہی تمباکو پینے کی اجازت تھی۔ لوگ ان پابندیوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کیبن کے اندر وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے تھے۔ اگر کسی کو چھینک آتی تو وہ اُٹھ کر باہر نکل جاتا تھا۔ اور پائپ یا سگریٹ کوئی بھی پینے کی کوشش نہ کرتا تھا۔

گرمیوں کے لمبے دنوں میں لوگ بچے کو اُٹھا کر باہر کھلے میدان میں صنوبر کے درختوں کے نیچے لے جاتے۔ وہاں وہ صنوبر کی ٹہنیوں کے اوپر ایک کمبل پھیلا کر بچے کے لئے سائے کا انتظام کرتے۔ پھر وہ جنگل سے درخت کاٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ کام کرتے کرتے وہ اکثر کام چھوڑ کر بچے کی طرف دوڑ آتے۔ اور اس سے کھیلنے لگ جاتے۔ بچے کے خیمہ کو سجانے کے لئے وہ ایک عجیب و غریب کوششیں کرتے۔ کوئی پھولوں کی ایک ٹہنی لا کر بچے کے چہرے کے عین اوپر لٹکا دیتا۔ کوئی جنگلی پھل لا کر بچے کے سامنے ڈھیر کر دیتا۔ کوئی اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دریا کی تہہ میں ملنے والے گھونگھے اور سیپیاں لاتا اور بچے کو کھیلنے کے لئے دیتا۔ اس بچے نے ان کو تقریباً دیوانہ بنا رکھا تھا۔ بچہ خود بھی ان لوگوں میں بہت خوش رہتا تھا۔ وہ ہر کسی کو دیکھ کر مسکرا پڑتا تھا۔ اس کی اس مسکراہٹ پر سب ہی مرتے تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو تمام دن طرح طرح کے ہنگامے اٹھایا کرتے تھے۔ بات بات پر خونریزی کے لئے

تیار رہتے تھے۔ جن میں سے بعض کے دن جوئے خانے میں اور راتیں شراب خانے میں بسر ہوتی تھیں۔ مگر اب اس بچے نے نہ جانے ان پر کیا افسوں پھونکا تھا کہ ہر کوئی اپنا شغل بھول چکا تھا۔ ہر کوئی شریف بننے کی فکر میں تھا۔ بچے کے سامنے تو کم از کم ہر کوئی انتہائی شریف نظر آتا تھا۔ ہر کوئی اپنی حالت میں اس خوشگوار تبدیلی پر دل میں فخر کرتا تھا۔ "رورنگ کیمپ" والے اب ہر اجنبی شخص پر کڑی نظر رکھنے لگے تھے۔ بچے کے متعلق وہ حد سے زیادہ محتاط تھے۔ انہیں اس بات کا خطرہ تھا کہ باہر کی بستی کا کوئی شخص اُن کے اس لازوال خزانے کو چوری نہ کرے۔ کئی محتاط قسم کے لوگوں نے تو باقاعدہ کیبن کے گرد پہرہ دینا بھی شروع کر دیا تھا۔

اس وقت اگر کسی اجنبی ملک کا کوئی شخص اس بستی میں داخل ہوتا تو وہ واپس جا کر اپنے ملک کے باشندوں کو اس بستی کے متعلق یہ بتاتا کہ وہاں کے باشندے نیم پاگل ہیں۔ وہ ایک کمرے کو بہت سجا کے رکھتے ہیں۔ اور اس کے اندر رہنے والے بچے کی پرستش کرتے ہیں۔ آپس میں عموماً اچھے تعلقات رکھتے ہیں۔ مگر اجنبیوں کو بڑی خونخوار نگاہوں سے گھورنے کے عادی ہیں۔

"رورنگ کیمپ" کے لوگوں نے اب اپنی بستی کی حالت سدھارنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو بستی کی صفائی کی گئی۔ پھر راستوں کو درست کیا گیا۔ اور ٹوٹے ہوئے مکانوں کی مرمت کی گئی۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ آئندہ موسمِ بہار میں بستی میں ایک ہوٹل تعمیر کیا جائے جہاں اس بچے کو رکھا جائے۔ اور بچے کی پرورش کے لئے باہر کی بستیوں سے ایک دو خاندان بلا لئے جائیں۔ جن میں بچے اور عورتیں بھی ہوں جو بچے کو اچھی طرح پرورش کر سکیں۔

بستی کے لوگ عورتوں کی آمد کے سخت مخالف تھے۔ مگر بچے کی مسرت اور صحت کے پیشِ نظر انہوں نے اپنے پرانے اصول کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا قدرت کو شاید اس بستی میں عورتوں کی آمد ناپسند تھی۔ چنانچہ آنے والے موسمِ سرما میں "رورنگ کیمپ" کے گردونواح کی پہاڑیوں پر سخت برف پڑی۔ ہر پہاڑ سے پانی کی نہریں بہہ نکلیں اور پھر یہ ندیاں دریا بن گئیں۔ دریا جھیلوں کی شکل اختیار کرنے لگے پھر پانی کا زور اتنا بڑھا کہ وہ اپنے ساتھ پہاڑوں سے بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھاڑ کر لانے لگا۔ میدانوں میں وہی پانی سیلاب کی صورت اختیار کرنے لگا۔ "ریڈ ڈاگ" کی بستی دو دفعہ زیرِ آب آ چکی تھی۔ اور "رورنگ کیمپ" کو بھی ہوشیار رہنے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ آخر کار وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ "رورنگ کیمپ" کے ساتھ بہنے والا دریا نارتھ فورک ایک رات طغیانی پر آ گیا۔ جو اپنے ساتھ تمام وادی کو بہا لے گیا۔ وہ رات بڑی خوفناک رات تھی۔ ہر طرف چیخ پکار مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا پانی کے تیز بہاؤ، گرتے ہوئے درختوں کے شور۔ اور رات کی بھیانک تاریکی نے قیامت کا نقشہ بنا دیا تھا۔

صبح تک پانی کا زور کم ہو گیا۔ بستی کا کافی مالی نقصان ہو گیا تھا۔ مگر کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ جب دن چڑھا تو لوگوں کو اچانک بچے کا خیال آیا۔ سب کے چہروں کی رنگت زرد پڑ گئی۔ بہت سے لوگ ایک ساتھ کیبن کی طرف دوڑے مگر کیبن کا وہاں نام و نشان تک نہ تھا۔ دریا سے قریب ہونے کی وجہ سے وہ پانی کے پہلے ہی ریلے میں بہہ گیا تھا۔ سٹمپی تھوڑی دور گیلی ریت پر مُردہ پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر فخر، امید اور مسرت کے جذبات صاف پڑھے جا سکتے تھے۔ وہ شاید بچے کو بچانے کی کوشش میں خود اپنی جان کھو بیٹھا تھا۔ لوگ افسردہ دلوں اور پُرنم آنکھوں کے ساتھ واپس ہونے کو تھے کہ دُور دریا کے قریب سے کسی شخص نے اُن کو چلا کر پکارا۔ وہ سب دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دریا میں ان کو ایک حفاظتی کشتی نظر آئی۔ جس میں چند اجنبی سوار تھے۔ جب وہ سب کشتی کے قریب پہنچے تو انہوں نے اجنبیوں کے درمیان کشتی کے تختوں پر کینٹک کو لیٹے ہوئے پایا جس نے اپنے سینے پر بچے کو اوندھا لٹایا ہوا تھا۔ اجنبیوں نے ان کو بتایا کہ یہ شخص اس بچے کے ساتھ اُن کو "رورنگ کیمپ" سے دو میل نیچے دریا کے کنارے بے ہوش پڑا ہوا ملا۔ ہم نے ایک دفعہ اسے "رورنگ کیمپ" میں دیکھا تھا۔ اس لئے اسے یہاں اُٹھا لائے ہیں۔

اُنہوں نے کینٹک کو بغور دیکھا۔ وہ بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔ جب وہ اُس پر جھکے ہوئے تھے تو اُس نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ مگر خاموش

رہا۔ لوگوں نے بچے کو اچھی طرح دیکھا مگر وہ سرد ہو چکا تھا۔ اس کی نبض حرکت نہیں کر رہی تھی۔

"بچہ تو ہم سے منہ موڑ چکا ہے" ایک شخص کے رندھے ہوئے گلے سے آواز نکلی۔

"ہاں۔ میرے دوست! ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔ یہ بچہ مجھے بھی اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ سب کو بتا دینا کہ بچہ اکیلا نہیں گیا بلکہ کابلی والا کیٹنگ بھی اس کے ساتھ تھا۔ اچھا خدا حافظ!"

کیٹنگ نے آہستہ آہستہ کہا اور پھر اس نے اپنے نواسے کو بازوؤں میں جکڑ کر اس طرح پکڑ لیا جس طرح ایک ڈوبتا ہوا انسان تنکے کو آخری سہارا سمجھتے ہوئے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔

○

اس دنیا میں جو بچہ بھی آتا ہے وہ کہتا ہے :-

"خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا!"

(ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور)

ڈاکٹر وحید اختر

○

ہمارے دل سے ہر غم کی رہی برسوں شناسائی
مگر ہر موڑ پہ تیرے ہی غم نے کی مسیحائی

وہی اک یاد اُداسی میں رفیقِ عیشِ تنہائی
وہی جشنِ طرب میں اشک بن کر غم کی رسوائی

نہ پہچانا مسرت نے، نہ کی غم نے پذیرائی
تمنا اجنبی بن کر تری محفل سے لوٹ آئی

کدھر لے کر چلی ہے در سے تیرے دشت پیمائی
نہ فکرِ چاکِ داماں، نہ رنجِ آبلہ پائی

کسی کو دیکھتا کیا تجھ سے چھٹ کر تیرا سودائی
سنا ہے زندگی قدموں سے لپٹی دور تک آئی

اب اُن کی یاد چہرہ بھی پہچانا نہیں جاتا
غمِ دوراں نے ایسی زندگی کی شکل دکھلائی

ہر اک ذرہ سمجھتا ہے کہ چاند اُس پر ہی اُترا ہے
ملی ہے چاندنی کو بھی تری طرزِ دل آرائی

اتاریں آرتی دن کے اُجالے اُس کی چوکھٹ پر
اندھیری رات میں در در کی جس نے خاک چھنوائی

ہم اپنے آپ سے بھی مدتوں ملنے نہیں پاتے
کسے شوقِ نظارہ، کیا دماغِ مجلس آرائی

فراقِ دوست کا اک پل بھی کتنا اک قیامت تھا
نہ ڈھلتا شاعری میں گر سکوتِ شامِ تنہائی

وحید اُن کو دعائیں دو جنھوں نے غم دیئے تم کو
کتابِ دل پہ کیوں کرتے ہو خوں سے خانہ فرسائی

نسیم شمائلپوری

○

ہاتھ پھیلائے تھے تم نے مجھ کو تنہا دیکھ کر
اب جدا ہوتے ہو کیوں زخمِ تمنّا دیکھ کر

چاندنی راتوں میں اکثر اس گلی کے موڑ پر
چونک اٹھتا ہے کوئی اپنا ہی سایا دیکھ کر

یہ نظر کی تشنگی، یہ سلسبیلِ حسنِ یار
جی سُلگتا ہے لبوں کے پاس دریا دیکھ کر

یاد آجاتا ہے ناشگفتہ امیدوں کا مآل
ڈھلتے سایوں میں گلوں کا رنگ اڑتا دیکھ کر

نغمے بہ فیضِ عشق ہم بھی یوسفِ بازارِ مصر
لوٹ کر جاتے کہاں شہرِ زلیخا دیکھ کر

اصغر سودائی

○

بے کار نوائیں تھیں نوا ساز نہیں تھا
میں مصلحتاً گوش بر آواز نہیں تھا

دل کی کسی دھڑکن کا ہم آواز نہیں تھا
نالہ مرا ہمراز تھا، دم ساز نہیں تھا

اے صبحِ ازل حسن پہ اتنا تو نہ اترا
تخلیق کا جادو کوئی اعجاز نہیں تھا

اس درد کا درماں کبھی ہوتا بھی تو کیونکر
ظالم کا کوئی نقطۂ آغاز نہیں تھا

چپ چاپ زمانے کی ہر اک چوٹ سہی ہے
انسان تھا انسان، رگِ ساز نہیں تھا

اے غیب کے فنکار، صنم کتنے حسیں ہیں
کیا تو ہی تو در پردہ صنم ساز نہیں تھا

گائے ہیں وہاں گیت ترے خلق و وفا کے
کوئی بھی جہاں میرا ہم آواز نہیں تھا

کیا خوب سجائے تھے در و بام خرد کے
جب مقصدِ دل عشقِ جنوں ساز نہیں تھا

یوں بگڑے ہیں اصغر مری برجستہ لبی پر
جیسے وہ بگڑنے کا بھی انداز نہیں تھا

شبیر افضل جعفری

○

وفا کدہ اک راستہ رہی ہے
فضا میں جگنو اڑا رہی ہے

ہوا میں لہرا رہے ہیں آنچل
شراب سی تھرتھرا رہی ہے

اُتر کے مہتاب کی غزالہ
زمیں کے پاؤں دبا رہی ہے

سُنا ہے سرو و سمن کے بدلے
بہار غزلیں اُگا رہی ہے

دُعا ستاروں کی انکھڑیوں میں
حیا کی مہندی رچا رہی ہے

اُچھل کے جیسے حیات افضلؔ
اجل کو امرت پلا رہی ہے

آتش لدھیانوی

○

پوچھ نہ اس عالم کی بات
نیند اڑ جاتی ہے جس رات
لاکھ افسانوں کا عنواں
اس کی نظر کی پہلی بات
کیا کیا روپ دکھاتی ہے
پچھلے پہر کی چاندنی رات
اپنی اپنی سوجھ سمجھ
اپنی اپنی ہے اوقات
طرفہ تماشا بازیٔ عشق
جیت بھی مات اور مات بھی مات
جھوٹی بات آخر کو جھوٹ
سچی بات ہے سچی بات
بن اشکوں کے دل روتے
بن پانی برسے برسات
آتش کتنی کوشش کی
کہہ نہ سکے کہنے کی بات

رشید الجراتی

○

جاگ اُٹھے یادوں کے سویرے		آنکھوں نے موتی سے بکھیرے
اُن کی گلی کے شام سویرے		ہوتے ہیں پھیروں پہ پھیرے
کون بتائے اُن کے بسیرے		دیوانوں کے جوگی پھیرے
مہکے مہکے، بہکے بہکے		ہائے اُن زلفوں کے اندھیرے
او مستِ پندارِ جوانی		دل بھی تیرا ھم بھی تیرے
پل میں تولہ، پل میں ماشہ		دیوانے تیرے ہیں نہ میرے
آنکھوں میں اندازِ گریزاں		لیکن دل میں پیار کے ڈیرے
چاک گریباں اِک دیوانہ		آ نکلا ہے شہر میں تیرے
ان آنکھوں کے متوالوں نے		گردشِ دوراں کے رُخ پھیرے
دل ہی نہیں تو غم کیا معنی		دل ہے سلامت غم بہتیرے
آج بھی ہیں موضوعِ محبت		کچھ سُکھ تیرے، کچھ دُکھ میرے
آج ہے کس منزل پر انساں		رُخ پہ اُجالے دل میں اندھیرے

ہم سے آنکھ ملا کر رشیدا
کوئی کیونکر نظریں پھیرے

طاہر سہادھنوی

محو ہوں اُن کے خیالات کی رعنائی میں
زمزمے گونج رہے ہیں مری تنہائی میں

وہ مسافر سرِ منزل جنہیں راحت نہ ملی
سو گئے سایۂ دامانِ شکیبائی میں

وسعتِ ظرف پہ موقوف ہیں الطافِ جمال
لاکھ ارمان سہی چشمِ تماشائی میں

کیا کہیں آج اِک انجان اچٹتی سی نظر
کیا اثر چھوڑ گئی ۔ قلب کی گہرائی میں

کس مپرسی کا بھی احساس بُرا ہوتا ہے
داغ سُنتے ہیں دلِ لالۂ صحرائی میں

یوں تو سب کچھ ہے جہاں میں مگر امکانِ وفا
جیسے موہوم سی لرزش کسی پرچھائی میں

بات بڑھتی ہے حقیقت سے کنارا کر کے
جھوٹ کو دخل ہے مشقِ سخن آرائی میں

سایۂ زُلف ہے ساون کا سہانا موسم
منظرِ قوسِ قزح ہے تری انگڑائی میں

آج اس منزلِ ہستی میں ہے طاہرؔ کہ جہاں
اجنبیت میں مزا ہے نہ شناسائی میں

رحمان فراز

○

پہلے دیوانوں کے اطوار کہاں
اب وہ ہنگامے سرِ دار کہاں

ہار کر بیٹھ گئے دھوپ میں ہم
اب ترا سایۂ دیوار کہاں

تیر پیوستِ رگِ جاں بھی نہیں
آج وہ لذتِ آزار کہاں

تیرگی اور بڑھے گی یارو
شام سے صبح کے آثار کہاں

اپنی ہستی نہ کہیں کھو بیٹھیں
ہم کہاں، آپ کا دیدار کہاں

تیر جاتے ہیں اجالے ہر سُو
ہم جو روئیں تو شبِ تار کہاں

ہم اگر مٹ گئے اے عصرِ جدید
ہم سے پھر صاحبِ کردار کہاں

منزلیں گرد ہوئی جاتی ہیں
لے اڑی وقت کی رفتار کہاں

ٹوٹ جائے درِ محبس تو فراز
پھر یہ زنجیر کی جھنکار کہاں

پڑھنے والوں کے خطوط

حمید کاشمیری

آپ کا خط اور مارچ کا شمارہ مل گئے ہیں۔

اب کی دفعہ آپ نے رومن رسم الخط پر نہایت ہی پُر مغز اور فکر انگیز اداریہ لکھا ہے۔ یہ کوئی ایسی تحریر نہیں جسے پڑھ کر داد دے کے صفحہ پلٹ دیا جائے بلکہ اس پر تمام ادیبوں، دانشوروں اور مفکروں کو سنجیدگی کے ساتھ سوچنا چاہیئے۔ آپ نے رسم الخط کے سلسلے میں جو بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور مثالیں دی ہیں ان کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے اور اگر ہے تو بجز مقل اور عقیدہ اضبع۔

جہاں تک صدرِ محترم کا تعلق ہے تو انہوں نے رومن رسم الخط رائج کرنے کے سلسلے میں کوئی حکم صادر نہیں فرمایا ہے بلکہ ایک سچے پاکستانی کی طرح دو تہذیبوں اور زبانوں کو قریب تر لانے کی مخلصانہ تجویز پیش کی ہے اور ساتھ ہی اس موضوع پر آپ ایک تقریب میں یہ بھی تو فرما چکے ہیں کہ زبان کا مسئلہ حل کرنا مجھ سپاہی کا کام نہیں بلکہ دانشوروں کا کام ہے لیکن حیرت ہے کہ دانشوروں نے اس مسئلہ سے اس طرح چشم پوشی اختیار کر رکھی ہے جیسے یہ مسئلہ صدیوں کی پروردہ زبان، تہذیب، ثقافت، معاشرت، ادب اور ادبی روایات کا نہیں بلکہ کاٹن کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کا ہو۔ ادیبوں کی عظیم ترین تنظیم رائٹرز گلڈ، ترقی اردو بورڈ اور دیگر متعدد علمی و ادبی ادارے بھی خاموش ہیں اور کمال تو یہ ہے کہ زندگی بھر اردو کو سینے سے لگائے رکھنے والے بابائے اردو مولوی عبد الحق جو اردو کا ایک لفظ ادھر سے ادھر ہو جانے پر ماہئ بے آب کی طرح تڑپ جاتے ہیں۔ اس مسئلے پر چپ سادھے ہوئے ہیں۔ کیا ان کا مشن ختم ہو گیا ہے یا وہ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں۔ ویا انہوں نے مخالفین کی بڑھتی ہوئی تعداد کو بدستور نیچا دکھانے کے لئے رومن کو بھی قابلِ قبول سمجھ لیا ہے۔ خدا کرے وہ اپنی زندگی میں ہی اس کی وضاحت کر دیں۔ ورنہ ان کی خاموشی سے غلط نتائج اخذ کئے گئے اگر اس بے سوچے سمجھے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا گیا تو ہمارے ماضی کی شاندار روایات تباہ ہو جائیں گی اور مستقبل کی تہذیب اور معاشرت اپنے ماضی پر کبھی فخر نہیں کر سکے گی۔

ایک بات یہ کہ ترکی کے بیشتر حلقوں میں آج رومن رسم الخط سے نجات حاصل کرنے کے مسائل زیر بحث ہیں۔ اس سے بھی ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

○

محمد ایوب اولیا

"ادبِ لطیف کے پیارچۂ آغاز میں آپ کا مقالہ افتتاحیہ پڑھا جس میں آپ نے رسم الخط اور سستے ادب کی اشاعت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ——— سب سے پہلے میں رسم الخط کے مسئلے کو لوں گا ——— جس پر آج کل وسیع پیمانے پر مذاکرے ہو رہے ہیں ——— بحثیں ہو رہی ہیں مقالے

لکھے جا رہے ہیں دو وا ز کار تاریخیں پیش کی جا رہی ہیں یا ایسے جواز پیش کئے جا رہے ہیں جو علمی حیثیت سے کچھ وقعت نہیں رکھتے ——— آج کل باتیں بنانا اور بحث نا ایک فیشن سا ہو گیا ہے اور یار لوگ ہر وقت کسی نہ کسی موضوع کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ وہ اس پر کھیل تماشا کر سکیں۔ حدیثِ مادرہ تک ہی بات رہتی تو اچھا تھا ——— لیکن اب کچھ لوگ سنجیدگی سے رسم الخط کو بدلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو لسانی، تہذیبی اور ثقافتی ہر اعتبار سے مضر ہے۔ آپ نے درست لکھا ہے جب دو ایسی زبانوں کو جو ہر لحاظ ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ایک ہی رسم الخط میں لکھا جائے گا۔ تو کیا ان کی فطری تفاوت دور ہو جائے گی۔ یا کم از کم بیشتر تفاوت دور ہو جائے؟ ''ہرگز نہیں۔''

ہر زبان کی مخصوص صوتیات ہوتی ہیں۔ مخارج اور نزاکتیں ہوتی ہیں۔ جو مخصوص رسم الخط سے ہی ادا کی جا سکتی ہیں۔ اگر ہم اردو رسم الخط کی بجائے رومن رسم الخط استعمال کرنا شروع کر دیں تو زبان کی نفاست کا جھٹکا ہو جائے گا ——— وہ بنیادی اور ضروری فرق جو تقریباً ہر زبان میں ہوتا ہے ختم ہو جائے گا جس سے کہ ہر زبان کی ''انفرادیت'' اور تخصیص پیدا ہوتی ہے۔ ان نزاکتوں کو برقرار رکھنے کے لئے بہرحال اپنے موجودہ رسم الخط میں ہی وہ کر سہولتیں پیدا کرنا چاہئیں۔ ورنہ معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ سرسید کے بیٹے جسٹس محمود کسی کلب میں اپنے کسی انگریز دوست کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے ——— زبان کے مسئلے پر بحث چھڑ گئی۔ سید محمود کا ادعا یہ تھا کہ ہندوستانی میں یہ صلاحیت سب قوموں سے زیادہ ہے کہ وہ ہر زبان کو اس کے صحیح لب و لہجہ میں ادا کر لیتا ہے ——— یہی خصوصیت انگریز اپنی قوم میں بتاتا تھا۔ سید محمود نے کہا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں ——— اتنے میں اس انگریز کا ننھا سا بچہ آ گیا۔ جسٹس محمود انگریزی میں اس کے ساتھ باتیں اور چہلیں کرتے رہے ——— کھیل کود کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بچہ بھی ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہر انگریز باپ اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کرتا ہے جب بچہ چلا گیا تو انہوں نے انگریز سے پوچھا کہ کہیں حضرت میں نے غلط انگریزی لہجہ تو نہیں برتا ——— یا غلط انگریزی تو نہیں بولی ——— انگریز نے کہا بالکل نہیں ——— آپ نے بڑی صحیح اور نفیس انگریزی بولی ہے ——— اب انگریز دوست کی باری تھی جسٹس محمود نے ایک بیرے کو بلایا اور اس سے کہا کہ جو صاحب کہے اس پر عمل کرنا ——— اپنی طرف سے کوئی ترمیم نہ کرنا ——— انگریز نے بیرے سے کہا ''اس پلیٹ کو دو کر لاؤ'' بیرا پلیٹ لیکر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد پلیٹ کے دو ٹکڑے کر کے لے آیا ———۔ جسٹس محمود نے انگریز کو مخاطب کر کے کہا ''آپ نے اپنی ساری عمر ہندوستان میں گزاری اور آپ کی اردو دانی کا یہ حال ہے کہ ''دھو کر لاؤ'' کو ''دو کر لاؤ'' کہتے ہیں۔ کسی زبان کی نزاکت کو آپ کیا سمجھ سکتے ہیں؟

یہی حال کہیں مجوزہ رومن رسم الخط کا نہ ہو ——— کہ لکھا کچھ جائے اور پڑھا کچھ جائے ——— بہتر یہی ہے کہ پینترے بازی کو چھوڑ کر اسی موجودہ رسم الخط کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ ٹائپ میں بھی سہولت سے سما جائے۔ اس میں کلی طور پر بدلنے کی نسبت کم محنت پڑے گی اور اسرافِ زر بھی کم ہوگا۔

سستے ادب کے متعلق بھی مجھے آپ کی تائید کرنی ہے جس قدر جنسی، رومانی اور جاسوسی ناول یا افسانے چھپتے ہیں ان کا عشر عشیر بھی معیاری ادب پیش نہیں کیا جاتا ——— اس کی ذمہ داری سب سے پہلے ناشرین پر عائد ہوتی ہے۔ دوم قارئین پر اور سوم خود مصنفین پر ——— اگر ناشرین غیر معیاری ادب نہ چھاپیں تو مصنف ہرگز قارئین تک اپنی ناقص تحریریں نہیں پہنچا سکتا ——— قارئین اگر سب کے سب اعلیٰ معیار کے ہوں تو ناشر اور مصنف دونوں کو اپنا نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ خود مصنفین میں اتنا احساسِ ذمہ داری اور جذبۂ دیانت ہونا چاہیئے کہ وہ کوئی ایسی تحریر چھپنے کے لئے نہ دیں ——— جس پر ان کے ضمیر نے ٹوکا ہو ——— مگر بیچارے مصنفوں کی غربت انہیں اپنے معیار سے نیچے اترنے پر مجبور کرتی ہے

اور اس پر ناشر کا اصرار اور تکرار مستزاد!

میرے خیال میں اگر ناشرین ذرا دیانت پسند ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ معیاری ادب بیشتر تعداد میں نہ چھپے ——— ناشرین دراصل دہرا فائدہ اٹھاتے ہیں ——— کم قیمت پر مصنفین سے ان کی تحریریں حاصل کرتے ہیں اور معقول قیمت پر زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچاتے ہیں اب تو اور جاسوسی کتابیں پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ بن چکا ہے ——— دھڑا دھڑ جاسوسی ناول چھپتے ہیں اور بڑے اشتیاق سے ہر مہینے کا انتظار کیا جاتا ہے۔

ناشرین ایک ظلم اور کرتے ہیں۔ شہرت یافتہ ادیبوں کی کتابیں تو وہ آنکھیں بند کر کے چھاپ دیتے ہیں۔ چاہے وہ ادبی حیثیت سے کتنی ہی مجروح کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس نئے اور ذہین لکھنے والوں کی تحریریں مدتوں گلتی سڑتی رہتی ہیں اگر کوئی ناشر "ترس کھا کر" چھاپ دیتا ہے ——— تو وہ اس احسان کو ہی معاوضہ سمجھتا ہے کہ اس نے ایک ادیب کو متعارف کرایا ہے ——— اور ادیب کو کتاب کی چند کاپیاں بھی مفت نہیں دے سکتا ——— گویا ناشر یہ سمجھتا ہے۔ کہ ادیب کا لکھنا مشغلہ ہے ——— اور کھانے پینے کا انتظام کسی اور طریقے پر کرتا ہے یا اس کے ساتھ پیٹ ہی نہیں ہے۔ کاش ناشر ادیب کی ضروریات کو بھی سمجھے کہ اسے بھی قوتِ لایموت چاہیئے۔ اور تحریر کے پیشے سے ہی اُسے بال بچوں کا پیٹ پالنا ہے جس روز ہمارے ناشر کو یہ شعور آگیا اسی روز اچھے اور سستے ادب کا نعرہ ختم ہو جائے گا ——— اور پھر ہر طرف معیاری اور سلجھا ہوا ادب نظر آئے گا۔ میری رائے میں ہر ناشر ان حالات سے واقف ہے۔ پتہ نہیں محترم علاؤالدین خالد اور دیگر ناشرین کرام کیوں اس حقیقت سے آنکھیں چراتے ہیں۔ یہ تمام باتیں ان پر روزِ روشن کی طرح واضح ہیں، ہم انہیں کیا کیا بتائیں ؎

خضر کیوں کر بتلائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

سلیم اختر

مارچ کے "ادبِ لطیف" میں آپ نے جس اہم مسئلے پر اداریے میں لکھا ہے وہ واقعی ایسا ہے کہ آج کے دانشوروں اور فنکاروں کو اس پر جذباتیت سے بلند ہو کر غور کرنا چاہیئے۔ اسی ملک میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کے لئے اردو کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں رسم الخط کا مسئلہ غالباً سب سے اہم اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ رومن رسم الخط کے قبول کر لینے کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ ہم نے سرے سے زبان ہی ختم کر دیا ہے۔

رسم الخط کوئی لباس نہیں جسے فیشن کے تغیر و تبدل یا ذاتی پسند کے مطابق جب چاہا بدل ڈالا۔ حروف اور ان کی ساخت محض چند اشارات (SYMBOLS) نہیں ہیں۔ حروف کا اصوات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ہر قوم اور ملک کے لوگ نسلی خصائص اور جغرافیائی حالات کے مطابق بعض خاص قسم کی آوازیں ہی نکال سکتے ہیں بعض اصوات ان کے کام و دہن کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔ آریائی نسلیں لاطینی اور سامی زبانیں بولنے والی اقوام کی نسبت زیادہ مشکل، پیچیدہ اور ادق آواز کا اخراج کر سکتی ہیں یہی وجہ ہے کہ انگریز ساری عمر کی مشق کے بعد بھی ح، خ، غ، ق، ص، ض، ڑ وغیرہ کو صحیح طریقے سے ادا نہیں کر سکتے اسی طرح سے جیسے پنجابیوں کی اکثریت ق اور ع وغیرہ کو صحیح آواز سے ادا کرنے میں دقت محسوس کرتی ہے۔

ماہرین اصوات کے نزدیک کسی زبان کے رسم الخط کی یہ سب سے بڑی اور اہم خوبی گنی گئی ہے کہ اس میں ہر صوت کا سمبل ایک ہی علامت یعنی حرف سے ادا کیا جائے۔ انگریزی چونکہ ہمارے اکثر حروف کو ادا کرنے پر قادر نہیں اس لئے ہماری آوازوں کی نمائندگی کے لئے ان کے حروف قطعی ناکاف

اور ناقص ثابت ہوتے ہیں مثلاً ش کے لئے SH ہے۔

رومن رسم الخط محض فوجی ضرورتوں کے لئے اپنایا گیا تھا۔ اور صاف طور پر مخصوص مقاصد کے تابع تھا اس لئے اس کا ذخیرہ محض گنے چنے چند سو الفاظ پر ہی محدود تھا۔ لیکن آج ہم قلی قطب شاہ کی کلیات سے لیکر موجودہ دور تک کی کتابوں کو رومن رسم الخط میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے تو یہ اتنا عظیم منصوبہ ہوگا۔ کہ ہم اپنے محدود وسائل اور ذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے اس سے عہدہ برآ نہ ہوسکیں گے۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے غالباً ۱۹۲۱ء میں رومن الخط کو اپنایا گیا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا آج وہ قوم اپنے صدیوں کے تہذیبی، علمی، ادبی اور ثقافتی سرمائے سے متمتع نہیں ہوسکتی کیونکہ پوری سعی کے باوجود ابھی ماضی کی تحریروں کو رومن رسم الخط میں نہیں لایا جاسکا۔ محض گنتی کی چند سو کتابوں کی تبدیلی سے تو یہ کام نہیں سرانجام پاسکتا۔ پھر اس سے الفاظ کے معانی میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوتے کا احتمال ہے ان کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ مثلاً رومن میں KHAT ہے اس سے خط بھی مراد ہوسکتی ہے اور کھاٹ بھی۔ اس طرح زبر، زیر اور پیش اور تلفظ کی دیگر علامات اور اشارات کے لئے کیا کیا جائے گا! اسی طرح "ہ" کے لئے کون سا رومن حرف لایا جائے گا۔

رومن رسم الخط کی طوالت آج یورپ اور امریکہ کے لئے ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ مسٹر آئزک پٹ مین نے اس کی قباحتوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے موجودہ دور کی ضرورتوں کے لئے ناکافی بتاتے ہوئے ایک نیا سسٹم ہی ایجاد کر ڈالا۔ یہ وہی ہے جسے شارٹ ہینڈ کے نام سے جانتے ہیں امریکہ نے املا میں جو اجتہاد کیا یہ بھی اسی بے اطمینانی کا مرہون ہے اسی طرح ماہرین لسانیات و اصوات کیمبل نے عربی رسم الخط کی اسی لحاظ سے بے حد تعریف کی ہے کہ اسمیں علامات (VOWALS) اور (CONSONENTS) کی صحیح ادائیگی اور نمائندگی کے لئے بالکل صحیح اور موزوں تر اشارات ملتے ہیں۔

جب وہ لوگ اپنے رسم الخط سے نالاں ہیں اور اسکی خامیاں دور کرنے کی سعی میں مصروف ہیں تو پھر ہمیں کیا پڑی ہے کہ ہم اپنے موزوں رسم الخط کو چھوڑ کر مفت کا ایک نیا مسئلہ کھڑا کرلیں۔ ملک کے دونوں حصوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے والی دلیل ——— تو بات یہ ہے کہ دو خطوں کے افراد رسم الخط سے کبھی نہیں قریب لائے جاسکتے۔ یہ تو قومیت کا احساس، وطنیت کا جذبہ، بعض مشترک قدروں کا احترام، واحد مقصد کا حصول — اور اسی قبیل کے دیگر نفسیاتی اور سماجی عوامل ہوتے ہیں جن سے افراد میں یگانگت، یک جہتی اور بھائی چارہ پیدا کیا جاتا ہے تقسیم سے قبل جب سب لوگ پاکستان کا نعرہ بلند کرتے تھے تو یہ رومن رسم الخط کی بنا پر نہ تھا بلکہ ایک مقصد کی زنجیر نے سب کو ایک بندھن میں جکڑ رکھا تھا۔

ویسے تو اس مسئلے پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن یہ ایک فنی مسئلہ ہے اور اس پر ماہرین فن مجھ سے زیادہ بہتر انداز سے روشنی ڈال سکتے ہیں یہ تو محض ایسی باتیں ہیں جو ہر انسان عقل عامہ سے کام لیکر سوچ سکتا ہے

——— ایک بات اور!

سالنامہ کے سلسلہ میں جو خطوط چھپے تھے ان سب میں ایک بات مشترک ہے یعنی یہ تمام خطوط نئے لکھنے والوں کے تحریر کردہ ہیں اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ کیا پرانے لکھنے والوں نے ادب میں کوئی خاص دلچسپی لینی چھوڑ دی ہے یا وہ اس بات کے قائل ہوگئے ہیں کہ نئی تخلیقات پر اظہار رائے کرنا ان کا فرض نہیں ہے نئے لکھنے والوں کی ذمہ داری ہے ——— ہونا تو یہ چاہیئے کہ وہ لوگ جن کے نام کا سکہ اب بھی چلتا ہے نئے لکھنے والوں کے لئے ایک شفیق مربی کی حیثیت اختیار کرلیں۔ جہاں انہیں کوئی جوہر قابل نظر آئے اسکی ہمت بندھائیں۔ اسے فنی رموز سے آشنا کریں۔ جہاں غلطی اور کوتاہی ہو رہی ہو وہاں اسے سمجھائیں اس سے جہاں ادب کی "شاہراہ زندگی" کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ وہاں انہیں یہ احساس بھی ہوگا کہ ہمارے بھی سرپرست کوئی "موجود" ہے۔ میرے خیال میں اس سے ان کی عظمت میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی۔ بلکہ ان کی وقعت میں اضافہ ہی ہوگا۔

جائزے

ہم قلم

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اردو کے تین رسالوں کے خاص نمبر ہیں جن کی ترتیب یوں ہے۔ ہم قلم سالگرہ نمبر۔ قلمکار، پہلا شمارہ۔ فروغِ اردو، جگر نمبر۔
"ہم قلم" ادارہ مصنفین پاکستان شاخ کراچی کا ترجمان ہے اور یہ اس کا سالگرہ نمبر ہے جو ادارہ مصنفین پاکستان کی دوسری سالگرہ کے موقعے پر چھپا ہے۔
ضخامت کم و بیش چار سو، کئی تصویریں بھی ہیں۔ کتابت و طباعت: عام۔ قیمت تین روپے جو اس حجم کے پرچے کے لئے مقابلۃً کافی کم ہے۔ کوئی کاروباری
ادارہ یہ ضخیم نمبر شائع کرتا تو اس کی قیمت چار روپے سے کسی صورت بھی کم نہ ہوتی۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ پرچہ اگر کاروباری خطوط پر نہیں چل
رہا تو خالصتاً ادبی تخلیقات کے لئے بھی وقف نہیں ہے۔ اس کی اشاعت کا اساسی مقصد ادارہ مصنفین کے مقاصد کی نشر و اشاعت ہے۔ اور یہ اس صورت
میں ممکن ہے کہ اس کے نئے صفحات پر ادارے کے مرکزی اور صوبائی حلقوں کی سرگرمیوں کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے اور سالگرہ نمبر نے اس بنیادی
غرض و غایت کو بدرجۂ اتم پورا کیا ہے۔ یہ نمبر اس اعتبار سے ایک بڑی اہم اور قیمتی دستاویز ہے کہ اس نے تقریباً قریب اُن تمام سرگرمیوں کو اپنے دامن
میں شامل کر لیا ہے جو گزشتہ دو سال کی مدت میں صورت پذیر ہوئی ہیں ___ سالگرہ نمبر کے مرتبین نے اس سلسلے میں بڑی کدوکاوش سے کام لیا ہے اور یہ انہی کی
کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ادارہ مصنفین پاکستان کی دو سالہ جدوجہد کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جسے سمیٹ لینے کی سعی نہ کی گئی ہو۔ ادارہ ہم قلم نے اچھی اور معقول
ادبی تخلیقات پیش کرنے میں بھی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ اس نمبر میں ادب کی بیشتر اصناف کو مناسب حد تک نمائندگی دی گئی ہے۔ مقالے بھی ہیں نظمیں بھی،
ڈرامے اور غزلیں بھی۔ افسانے نہیں ہیں ___ اس کے لئے ادارے نے لکھا ہے ___ "ہم نے جان بوجھ کر افسانے شامل نہیں کئے کیونکہ ہم بہت جلد الگ
ایک افسانہ نمبر شائع کر رہے ہیں!"

ہمارا خیال ہے ہمارے اکثر و بیشتر پڑھنے والے افسانوں کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کریں گے۔ مگر جب ہم قلم کے مخصوص کردار کو سامنے رکھا
جاتا ہے تو یہ کمی خاص طور پر محسوس نہیں ہوتی۔ اس نمبر کا ایک نہایت اہم مقالہ ڈاکٹر وحید اختر کا ہے جس میں انہوں نے گزشتہ تیس برس کے ادب کا جائزہ لیا
ہے۔ یہ مقالہ خاصا فکر انگیز اور جامع ہے۔ مگر اس کے اوپر ادارے کا یہ نوٹ درج ہے ___ "یہ مضمون ایک ہندوستانی ادیب کا ہے جس کی افادی اہمیت سے
انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ان کی رائے سے تعرض نہیں لیکن شاید صاحبِ مضمون کو پاکستان کے اکثر ادیبوں کے بارے میں پوری واقفیت نہیں" ___
یہ نوٹ لکھتے وقت ادارے نے محسوس کیا ہے کہ اس مضمون میں بعض اہم ادبی نام شامل نہیں ہیں اور اس چیز کو اس نے صاحبِ مقالہ کی ناواقفیت پر
محمول کیا ہے ___ اگر اس انداز سے سوچا جائے تو بعض ہندوستانی ادیبوں کو بھی اس بات کی شکایت ہو سکتی ہے اور یقیناً ہو گی بھی۔ وہ بھی غالباً اس
طرح سوچ رہے ہوں گے کہ یہ مضمون ایک پاکستانی رسالے میں شائع ہوا ہے۔ اس لئے صاحبِ مقالہ نے دانستہ پاکستانی ادیبوں کا تفوق چاہا ہے
یہ رجحان کسی صحت مند نظریے کی علامت نہیں ___ البتہ اس طرح ضرور سوچا جا سکتا ہے کہ بعض نام قطع نظر اس امر کے کہ وہ پاکستانی ہیں یا ہندوستانی
[illegible]

قلم کار

قلم کار۔ سہ ماہی پرچہ ہے جو پاکستان کے مصنفین کی مجلس مشرقی پاکستان کا ترجمان ہے۔ قلم کار سہ ماہی ہے یعنی سال میں اس کے دو نمبر شائع ہوا کریں گے۔ یہ اس کا پہلا شمارہ ہے جو ۲۰۰ صفحات پر چھاپا گیا ہے۔ ادارے میں پانچ نام ہیں جن میں عطا الرحمٰن جمیل، صلاح الدین محمد، ام عمارہ، بانو اختر شہود اور انور فرہاد۔ نگراں احسن احمد اشک ہیں اور ایڈیٹر سرور بارہ بنکوی۔ شرکا ادارت، نگراں و ایڈیٹر کے نام خاصے جانے پہچانے ہیں۔ ان لوگوں نے مضامین کے جمع کرنے میں بڑی کوشش اور انتخاب میں نقدِ نظر سے کام لیا ہے۔ مقالوں میں دو مقالے خاص طور پر بہت اچھے ہیں۔ پہلے مقالے میں سلیم اللہ فہمی نے "مشرقی پاکستان میں اردو شاعری کے تیرہ سال" کے عنوان سے مشرقی پاکستان کی تیرہ سالہ شاعری کا بڑی خوش اسلوبی سے جائزہ لیا ہے اور سید اقبال عظیم نے اسی انداز میں اسی مدت کی اردو نثر کا تجزیہ کیا ہے۔ دونوں مقالے بڑے اہم اور معلومات افزا ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے بڑی خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان کے دوسرے حصے میں اردو شاعری اور اردو نثر کے کتنے خوبصورت نمونے معرضِ وجود میں آ چکے ہیں۔ حصہ نظم و غزل میں بعض تخلیقات بہت اچھے معیار کی ہیں۔ افسانوں میں ام عمارہ اور بانو اختر شہود کی ذہنی کاوشیں بالخصوص قابلِ قدر ہیں۔ رسالے میں تیس صفحات انتخاب کے لئے بھی وقف کر دیئے گئے ہیں۔ ان صفحات میں موقت الشیوع رسائل و جرائد کی منتخب چیزیں لی گئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ قلم کار میں بنگالی تخلیقات کے تراجم بھی دیئے گئے ہیں مگر مناسب حد تک نہیں۔ قلم کار جو بنگال سے شائع ہو رہا ہے اس میں بنگالی کو زیادہ نمائندگی ملنی چاہئے۔ اس کے علاوہ ہم نے ایک اور کمی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ قلم کار مشرقی پاکستان سے چھپے اور اس میں ڈاکٹر محمد لطیف شاہ دانی، پروفیسر حنیف فوق، پروفیسر ارشد کاکوی اور اختر لکھنوی نظر نہ آئیں۔ یہ بڑی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ نام پاکستان گیر شہرت کے مالک ہیں اور مشرقی پاکستان کے ادبی رسالے کو بہرحال ان کا تعاون حاصل ہونا چاہئے۔

قلم کار۔ ہمارا اپنا پرچہ ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ ادارے کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جائے۔ یوں بھی قلم کار بڑے اچھے ادبی معیار کو لے کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ اور بڑے تابناک مستقبل کی نشاندہی کر رہا ہے۔

(م۔ ا)

فروغِ اردو لکھنؤ کا جگر نمبر

کتابی سائز کا یہ خاص نمبر ۲۱۶ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مدیر اعزازی: ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی۔ مرتبین: سید احتشام حسین رضوی اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت مجلد چار روپے۔ مقامِ اشاعت ۳۷، امین آباد پارک لکھنؤ۔ پاکستان میں یہ نمبر مبارک بلڈنگ، ویتو ہال بندر روڈ کراچی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

یہ نمبر جیسا کہ نام سے ظاہر ہے تمام و کمال موجودہ دور کے ممتاز ترین غزل گو مرحوم جگر مرادآبادی کے لئے وقف ہے۔

فروغ اردو کا یہ جگر نمبر مرحوم شاعر سے پورا پورا انصاف کر رہا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر جب کسی مصنف کے لئے کسی رسالے کو وقف کیا جاتا ہے تو اس کی تخلیقات کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دینے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس نمبر میں اس روایت کے برخلاف لوگوں نے جگر کی زندگی، اس کی شاعری کے محرکات، عوامل اور ان سے متعلقہ موضوعات کے متعلق معلومات کا ایک نہایت اچھا اور بیش بہا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے۔ جگر کی شخصیت اور اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے یہ نمبر بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

مقالہ نگاروں میں اردو کے کئی بہت اچھے نقاد جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً مولانا سعید اکبرآبادی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، ہدایت علی سندیلوی، رشید احمد صدیقی، منظر سلیم، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی اور ان کے علاوہ وہ بھی — "اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں" — یعنی سید احتشام حسین رضوی۔ احتشام حسین مدت سے خاموش ہیں اور ان کا اردو تنقید کے لئے فالِ نیک نہیں کہا جا سکتا۔

مقالات کے علاوہ مرحوم شاعر کے کئی فوٹو بھی ہیں۔ آخر میں "شعلۂ طور" اور "آتشِ گل" کا انتخاب دیا گیا ہے۔ شعلۂ طور سے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے انتخاب کیا ہے۔ اور آتشِ گل سے رضی احمد نے۔ اس انتخاب میں جگر کے اکثر و بیشتر مشہور شعر شامل ہو گئے ہیں۔

(م۔ ا)


فیٹ موٹر کار
سن لائٹ صابن کی
ایک ٹکیہ کی قیمت میں!
آج کل ہر شخص کے ذہن میں یہی سوال اُبھر رہا ہے کہ دیکھیں وہ پہلا خوش نصیب کون ہے جسے سن لائٹ میں فیٹ موٹر کار کی چابی کا ٹوکن ملتا ہے۔
سن لائٹ صابن کی وہ تین ٹکیاں جن میں ہر ایک کے اندر فیٹ ۵۰۰ موٹر کار کی چابی کا ایک ٹوکن موجود ہے ابھی تک پاکستان کی دوکانوں میں موجود ہیں۔ وہ خوش نصیب خریدار جنہیں یہ ٹوکن اپنی ٹکیوں میں مل گئے انہیں ایک ایک نئی فیٹ ۵۰۰ موٹر کار بالکل مفت پیش کی جائے گی۔ سن لائٹ صابن باقاعدگی سے خریدتے رہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بھی ان تین خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں!
ہوشیار رہیئے! خریداروں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ چند غیر ذمہ دار اشخاص سن لائٹ صابن کی ایسی ٹکیاں فروخت کر رہے ہیں جن میں جعلی چابیاں رکھی گئی ہیں۔ اصلی ٹوکنوں پر خفیہ نشانات کے علاوہ ٹوکن میں ہدایات بھی کندہ ہیں جنکی نقل نہیں ہو سکتی۔ اصلی ٹوکن پانے والوں کے نام، پتے اور فوٹو وغیرہ اخباروں میں شائع کئے جائیں گے۔
FIAT
جب بھی کپڑے دھونے کے
صابن کی ضرورت ہو
سن لائٹ
ہی خریدیئے

پنجاب بک ڈپو کی مطبوعات

طالب علموں کو بہت عزیز ہیں ——— کیونکہ یہ کتابیں
ان کی تمام ضرورتیں پوری کرتی ہیں

برائے جماعت نہم و دہم

پاپولر انگلش گرامر اینڈ کمپوزیشن	۴/-
سٹینڈرڈ انگلش گرامر	۴/-
پاپولر انگلش ٹرانسلیشن	۲/۸
ماڈل ٹرانسلیشن	۲/۱۲
پاپولر اردو گرامر اینڈ کمپوزیشن	۳/-
سنہری تاریخ انگلستان	۲/۱۲
پاپولر عملی سائنس فرسٹ بک	۳/-
کلیات حساب	۴/-
کلیات ہندسہ	۴/-
کلیاتِ الجبرا	۴/-

مڈل کلاسز کے لئے

معین الترجمہ۔ اول ۸ر دوم ۱۰ر سوم ایک روپیہ
ماڈل ٹرانسلیشن ششم ۸ر ہفتم ۱۰ر ہشتم ۱۲ر
پاپولر انگلش کمپوزیشن ششم ۱۲ر ہفتم ۱/۴ ہشتم ۲/۴
پاپولر انگلش ٹرانسلیشن ششم ۸ر ہفتم ۱۲ر ہشتم ۱/۴
عملی سائنس نوٹ بک مڈل و پرائمری اوّل ۱۲ر دوم ۱۲ر سوم ۱۲ر چہارم ۱۲ر پنجم ۱۲ر
مفید القواعد اوّل ۸ر دوم ۱۲ر سوم ۱۲ر چہارم ۱۴ر پنجم ۱۲ر
آسان ترجمہ فارسی ششم ہفتم و ہشتم کے لئے
رہنمائے املا ۸ر

نئی لغات

طلباء کی خاص مشکلات کو سامنے رکھ کر نہایت محنت سے اردو لغت کی یہ کتاب مرتب کی ہے۔ لغات کی ایسی کتاب کی کمی تھی۔ جس میں لغوی معنوں کے ساتھ اصطلاحی معنی بھی درج ہوں۔ جن کی مدد سے طلباء بغیر استاد کی مدد کے بھی آسانی سے اپنے اسباق تیار کریں اور ہر قسم کے الفاظ کے معنی سمجھ سکیں۔ نئی لغات نے یہ مشکل دور کر دی ہے۔ اس میں ہر لفظ کی اصل اور مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔ ضرب الامثال اور محاورے ہر ردیف کے آخر میں کثیر تعداد میں دیے گئے ہیں۔ معلومات عامہ میں قانونی اصطلاحات درج کی گئی ہیں۔ طلباء کے علاوہ ان لوگوں کے لئے بھی نئی لغات مفید ثابت ہو سکتی ہے جو اردو پڑھنے کے معاملے میں دقت محسوس کرتے ہیں۔ قیمت پانچ روپے ۵/-

مینیجر پنجاب بک ڈپو۔ لاہور

سیرت نگاری میں ایک گرانقدر اضافہ

انوار الہدیٰ فی سیرۃ المصطفیٰ

مولانا فضل احمد نے اس کتاب میں آنحضرت صلعم
کی حیات مقدسہ کو اس انداز سے قلمبند کیا ہے
کہ ایک ایک واقعہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے

یہ کتاب سیرت نگاری میں ایک نیا کارنامہ
ہے۔ مصنف نے تمام واقعات کو ان کے تمام
پہلوؤں اور تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈیڑھ سو عنوانات کے تحت حضور صلعم
کی زندگی کے مختلف واقعات

کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ ۔ رنگین گرد پوش

قیمت مجلد نو روپے

پنجاب بک ڈپو ☆ لاہور

REGD. L. No. 3521

شہرِ ممنوع

جنگل میں دھنک

ادبِ لطیف

جلد ۴۸ شمارہ ۲ فون نمبر ۲۰۰۹

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۳۵۰۶/۵۴
مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء - ۲۷۷۶۷۹ مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۵۴ء...
بموجب سرکلر نمبر ۴۱۵ مورخہ ۲۲ اپریل

بانی چودھری برکت علی مرحوم

ادبِ لطیف لاہور

اگست ۱۹۶۱ء

مینجنگ ایڈیٹر: افتخار علی چودھری

مرتب: میرزا ادیب

زرِ سالانہ ۱۰ روپے

فی پرچہ ۷۵ پیسے

غیر ممالک میں ۱۲ روپے

مکتبہ ادبِ لطیف ○ لاہور

افتخار علی چودھری نے اردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ادبِ لطیف سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا

فہرس

مرتب

پیرایۂ آغاز

ارنسٹ ہیمنگوے کا اچانک انتقال ادب کا ایک بین الاقوامی حادثہ ہے!

ہیمنگوے کی زندگی مختلف النوع اور خطرناک حادثات ہی کا شکار رہی تھی۔ کوئی حادثہ بھی اس کے لئے نیا نہیں تھا۔ اس کی عمر جو زندگی ایک ایسے حادثے کا انتظار کر رہی تھی جو اس حادثاتی سلسلے کی آخری کڑی ثابت ہو ۔۔۔ اور دو جولائی کو یہ حادثہ بھی ہو گیا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنی بندوق صاف کر رہا تھا کہ اچانک گولی نکل گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے بوڑھے جسم سے طائرِ روح بھی پرواز کر گیا۔

دو جولائی کو وہ قلم خاک و خون میں تڑپ کر خاموش ہو گیا جس نے دنیا کو "فار ہوم دی بیل ٹالز" ۔۔۔ "دی اولڈ مین اینڈ دی سی" ۔۔۔ "فیئر ویل ٹو آرمز" اور "دی سن آلسو رائزز" جیسے شاہکار دئے تھے۔

'ہیمنگوے' کی سب سے بڑی فن کارانہ خصوصیت اس کی حقیقت پسندانہ کردار نگاری ہے۔ ہیمنگوے کا ہر کردار ۔۔۔ اپنی مخصوص خصوصیات' رجحانات اور حرکات و سکنات کے اعتبار سے اپنی جگہ ایک مکمل کردار ہوتا ہے۔ اس کا اسلوبِ نگارش بڑا منفرد، بڑا دل نشین ہے۔ اپنے ناولوں کے ذریعے اس نے دنیا کو 'رجائیت' کا پیغام دیا ہے۔ اس پیغام کے لحاظ سے اس کا مختصر ناول "دی اولڈ مین اینڈ دی سی" خاص اہمیت لئے ہوئے ہے۔ ہیمنگوے کو اسی ناول پر ۱۹۵۴ء میں 'نوبل انعام' ملا تھا۔

○

استاد ذوقؔ اور شیخ ناسخؔ اردو کے دو ایسے شاعر ہیں جنہیں خاصا بدنام کیا گیا ہے۔ دونوں کی شاعری کو شاعری نہیں "ذہنی ورزش" کہا جاتا ہے۔ ذوقؔ کے ہاں محاورہ بندی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور ناسخؔ میں وہ شے تو کلیتہً موجود ہی نہیں جسے ذوقِ سلیم یا جذبۂ لطیف کہہ سکتے ہیں۔ اب کے مظفر حسین ملک نے ناسخؔ کا تجزیاتی مطالعہ اس انداز سے کیا ہے کہ اس کی شاعری کے بعض اچھے اور قابلِ قدر پہلو بھی ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔

غالبؔ اور میرؔ پر تو بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اب ان کے بارے میں کچھ اور باتیں کہنا مشکل بھی ہے اور ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک حد تک آسان بھی ۔۔۔ کیونکہ اس کے لئے ہمارے پاس کافی مواد موجود ہے ۔۔۔ مگر کسی "نئے" بالخصوص بدنام شاعر پر غائر نظر ڈالنا کافی مشکل کام ہے اور ملک صاحب کی یہ کوشش مستحسن ہے کہ انہوں نے عام روش سے الگ ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کی ہے!

○

اس شمارے میں یونس جاویدؔ کا ایک اور افسانہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔

یونس جاوید افسانہ نگاروں کی اس نسل کا فرد ہے جسے 'جدید تر' کہنا چاہیے۔ اس نئے افسانہ نگار نے تھوڑی سی مدت میں چند ایک

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

افکار و مسائل

(دوسری قسط)

اگر آپ کو انارکلی لاہور کے ایک نہایت معروف کتب فروش ادارے میں جانے کا اتفاق ہو تو آپ کو ایک طرف وہ تمام کتابیں نظر آجائیں گی جن کا ضمنی طور پر ذکر پچھلے "افکار و مسائل" میں ہو چکا ہے۔ امریکی کتابوں کے ان اردو تراجم کی اشاعت کا فخر اسی ادارے کو حاصل ہوا ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر کتاب پندرہ ہزار کی تعداد میں اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ یہ وہ حدِ اشاعت ہے جسے اردو کی چند گنتی کی بہت مقبول کتابیں ہی چھو سکی ہیں اور پھر یہ بہت مقبول کتابیں بھی ایک دم اتنی بڑی تعداد میں نہیں چھپیں۔ ان کی مجموعی اشاعت کا زمانہ سالہا سال کی مدت پر محیط ہے۔ اس کے برعکس یہ کتابیں ایک دم اتنی بڑی تعداد میں چھپ گئی ہیں اور قریب قریب ہر کتب فروش کی دکان پر پہنچ گئی ہیں۔ دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر کتاب کی قیمت ڈیڑھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔ تین کتابیں تو اچھی خاصی ضخیم بھی ہیں۔ ایک چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری کے صفحات پانچ سو ہیں اور تیسری چھ سو پچاس صفحات کو پہنچ گئی ہے۔ یہ بالکل درست کہ ان کی گٹ اپ اوسط درجے کی ہے، تاہم اتنی ضخامت کی کتابیں ڈیڑھ روپے میں کسی طرح فروخت نہیں کی جا سکتیں۔ عام کتب فروش دکاندار اس ادارے سے کم و بیش پچیس فیصد کمیشن بھی لے گا۔ یعنی ادارہ دکاندار کو ہر کتاب پر کم از کم آٹھ آنے کمیشن بھی دے گا۔ کمیشن اس سے کم نہیں ہوگی۔ قدرے زائد ہی ہو گی۔ اس اندازے سے دیکھا جائے تو یہ ادارہ چار سو تا پانچ سو اور ساڑھے چھ سو صفحات کی کتاب ایک روپے میں دے رہا ہے!

علم پروری کے اس مقدس جذبے کی داد نہیں دی جا سکتی!

علم پروری کا یہ جذبہ واقعی بڑا مقدس ہے مگر جس وقت ظاہری سطح سے اتر کر اندرونی سطح کو کریدنے کی کوشش کرتے ہیں تو بعض ایسی حقیقتیں بھی سامنے آجاتی ہیں کہ ان کی تیز روشنی سے آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔

امریکہ کے جو ادارے ہمارے ملک میں اپنی کتابیں شائع کروا رہے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ ہر مترجم کو اس کی مترجمانہ محنت کا پورا پورا معاوضہ خود ادا کرتے ہیں بلکہ جو ناشر یہ کتابیں ان کے تعاون سے شائع کرتے ہیں ان کو گوناگوں مراعات سے بھی نوازتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ناشروں کی بیشتر تعداد اردو کی تخلیقی کتابوں کو بہت حد تک نظر انداز کر کے ان اداروں کے اشتراکِ عمل کے ساتھ دھڑا دھڑ امریکی کتابیں شائع کر رہے ہیں اور جس رفتار سے شائع کر رہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ ذوقِ ثواب، اور بڑھے گا اور برابر بڑھتا رہے گا!

یہاں ہمیں ایک ایسے ادارے کا ذکر بھی کرنا ہے جس نے آج تک اردو کے عام ناشروں کے اس رویے کو نہیں اپنایا۔ اور جس نے ہمیشہ اس رویے کو اردو ادب کے حق میں بہت حد تک خطرناک سمجھا ہے۔ ہماری مراد "نیا ادارہ" سے ہے جس نے نہ فقط اردو میں خوبصورت کتابیں شائع کرنے کی ایک نہایت تابناک روایت سی قائم کی ہے۔ بلکہ ارادۃً تخلیقی ادب کی تنگ بخشی پر قناعت کر کے غیر ملکی اداروں کی منفعت بخشی کو مطلقاً نظر انداز کر دیا ہے۔ اسے نیا ادارہ کی ایثار پیشگی کہہ لیجئے یا فرض شناسی۔ بہرحال یہ قابلِ قدر چیز ہے اور ہمارے لئے قابلِ احترام۔

اوپر ہم نے اُن کتابوں کی بات چھیڑی ہے۔ جو پندرہ پندرہ ہزار کی تعداد میں چھپی ہیں۔ اور جن کی قیمت حیرت انگیز حد تک کم ہے۔ ان کتابوں کو دیکھ کر ذہن میں کئی سوال پیدا ہو جاتے ہیں۔

ان کتابوں میں کونسی ایسی خوبی ہے کہ انہیں اتنی بڑی تعداد میں چھاپا گیا ہے۔ اگر انہیں معقول تعداد میں شائع کیا جاتا تو اس کاغذ پر درجنوں کتابیں اور بھی چھپ سکتی تھیں۔ اگر ہر کتاب کو دو ہزار کی تعداد تک محدود کر دیا جاتا۔ تو کم از کم پچاس نئی کتابیں بازار میں آسکتی تھیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ان کی قیمت اتنی کم کیوں کر دی گئی ہے۔ اس میں کیا مصلحتِ خصوصی ہے۔

ظاہر ہے کسی خاص مصلحت کے بغیر ان کتابوں کو اتنی بڑی تعداد میں چھپوا کر پھیلانا اور پھر اتنی کم قیمت رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل چیز —— اور حقیقتاً اصل پہلو یہی خاص مصلحت ہے۔

اگر کوئی غیر ملکی ادارہ اپنے مخصوص ملکی نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنے وسائل بروئے کار لاتا ہے۔ تو ہمیں بھی لازماً یہ سوچنا چاہیئے کہ آخر ہماری بھی کچھ ملکی مصلحتیں ہیں۔ ہم پر بھی کچھ ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اور ہمارے ساتھ بھی کچھ فرائض وابستہ ہیں۔ ہم اقتصادی مصلحتوں کی خاطر انہیں مجروح ہونے دیں گے۔ تو ہمارا یہ رویّہ —— ایک باغیرت اور باوقار قوم کا رویّہ نہیں ہوگا۔ اور ایک فرض شناس قوم کا شعور اسے کبھی مستحسن قرار نہیں دے گا۔

کہا جاتا ہے کہ مکتبہ فرینکلن اور امریکہ کے کسی دوسرے ادارے کے تعاون سے اردو میں جو کتابیں آگئی ہیں ان سے ہمارے ادب میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اور ہمیں اس بات پر معترض ہونے کی بجائے خوش ہونا چاہیئے کہ ہمارا ادب بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اور اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

اگر ادب کے بڑھنے اور پھیلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں دنیا کا ہر رطب و یابس منتقل ہوتا رہے تو کوئی باشعور شخص بھی اس پر مسرت کا اظہار نہیں کرے گا۔ بڑھنے اور پھیلنے اور ترقی پذیر ہونے میں بہت فرق ہے۔ یوں دیکھئے کہ آج کل اردو ادب میں تیسرے درجے کے ناولوں کا دن رات اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے ہمارے ادب میں اضافہ ہو رہا ہے —— آپ ایسا نہیں سمجھیں گے۔ پھر ایسا کیونکر سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ کسی غیر ملکی ادب کی کم تر درجے کی کتابیں اردو ادب میں آجاتی ہیں تو اس سے اردو ادب بلند ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض ایسی امریکی کتابیں بھی اردو میں آگئی ہیں جنہیں ہم معقول اضافہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے مگر بیشتر کتابیں وہ ہیں جنہیں ہم ادنیٰ درجے کا ادب نہیں سمجھ سکتے۔ اگر یوجین اونیل، ٹینیسی ولیمز اور آرتھر ملر کے ڈراموں کو اردو میں لایا جاتا۔ تو ہمیں مسرت ہوتی کہ فی الواقعی ہمارے ادب کے بلند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جہاں تک ڈرامے کا تعلق ہے امریکہ اس وقت دنیا میں سب سے آگے ہے۔ لیکن ان مصنفوں کے ڈراموں کی طرف آج تک توجہ نہیں کی گئی۔ جو چھپ رہے ہیں تو امریکی ناول یا ایسی کتابیں جن میں امریکی نظریہ حیات، امریکی تہذیب اور امریکی زندگی کے روشن پہلو دکھانا مقصود ہے۔ پڑھنے والے ان روشن پہلوؤں سے متاثر ہو جائیں۔ یہی ان اداروں کا نصب العین ہے۔

امریکی اداروں کی بہرصورت کوشش یہی ہے کہ وہ اپنی تہذیب کے بہترین حصوں کو ہمارے سامنے لائیں۔ تاکہ ہم ان سے متاثر ہو کر اس ملک کے گن گانے لگیں۔ اس تہذیب نے انسانی فکر و نظر کو کتنی شدید اور ہیجان آور کشمکش میں گرفتار کر دیا ہے۔ یہ ادارے کبھی ایسے لٹریچر کو اپنے تعاون سے ہمارے سامنے نہیں آنے دیں گے۔ حالانکہ امریکہ میں ایسا لٹریچر بھی مسلسل چھپ رہا ہے۔

ہم پچھلے اداریے میں واضح طور کہہ چکے ہیں۔ کہ امریکی مطبوعات سے ہماری اپنی تخلیقی رو رک سی گئی ہے۔

ابھی ہمارے ادب میں کتنی کمی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں ہے —— پاکستان کو قائم ہوئے چودہ برس کی مدت گذر گئی ہے اردو بنگالی کے [illegible] ہمارے پاکستان کی قومی زبان ہے —— مگر کیا یہ امر حد درجہ تأسف انگیز نہیں کہ ابھی تک ہم اسی تاریخِ ادبِ اردو پر قانع ہیں۔ جو ایک ہندوستانی نے انگریزی زبان

میں لکھی تھی۔ اور جسے چھپے ہوئے مدت گذر چکی ہے۔ ہمارے یہ بزرگانِ محترم جن میں اردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کی پوری صلاحیت بھی ہے۔ جنہیں فراغت بھی ہے۔ اور جنہیں ہر ممکن سہولت بھی حاصل ہے۔ امریکی مطبوعات کے تراجم سے کنارہ کشی کر کے اس طرف توجہ نہیں دے سکتے۔ کیا یہ درست ہے نہ اس کام میں انہیں دس پندرہ روپے فی صفحہ معاوضہ بڑی آسانی کے ساتھ کسی امریکی ادارے سے نہیں مل سکے گا۔ مگر اصل کام تو یہی ہے اور یہی کام ان کے کرنے کا ہے ۔۔ نہ جانے وہ اس دائرے سے کب باہر نکلیں گے؟

○

بقیہ پیرایۂ آغاز

بہت اچھے افسانے لکھ دیئے ہیں اور توقع ہے کہ وہ اور بھی بہت اچھے افسانے ہمیں دے گا۔۔

یونس کا یہ افسانہ ایک ایسے کردار کا مطالعہ پیش کرتا ہے جس کا نظریۂ حیات ڈرامائی طور پر بدل جاتا ہے۔ افسانے کا ایک آدھ پہلو کمزور بھی ہے۔ ڈاکٹر کی آخری خطیبانہ تقریر کچھ جچتی نہیں ہے۔ اگر صاحبِ افسانہ زیادہ سختی سے قطع و برید کرتے تو افسانے کا تاثر زیادہ گہرا ہو سکتا تھا۔

○

ادبِ لطیف کے آئندہ شمارے سے چند نئے مستقل عنوانات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے اس سے پرچے کی افادیت بڑھ جائے گی ۔۔۔!

○

مظفر حسین ملک

ناسخ کی بدنام شاعری

ناسخ نے کیا درست کہا تھا ؎

کہتے ہیں وہ ہنسی سے ناسخ کو شاعری میں تجھے شعور نہیں

نقاد حضرات کے خیال میں ناسخ اُردو کے بدنام ترین شعراء میں سے ہیں۔ ناقدین نے ان کے متعلق جو فیصلے دئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) ا:۔ "غزلوں میں شوکتِ الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم"

ب:۔ "شیخ صاحب کی اکثر نازک خیالیاں ایسی ہیں کہ کوہ کندن و کاہ برآوردن" (آزاد)

(۲) ا:۔ "تمثیل اور مبالغے سے کلام میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس ترکیب کے استعمال میں اکثر اعتدال سے گزر جاتے ہیں" (عبدالحی صاحب گلِ رعنا)

ب:۔ "طبیعت قصیدہ دں کیلئے مناسب تھی مگر خدا جانے اس کا شوق کیوں نہ تھا" (عبدالحیٔ صاحب گلِ رعنا)

(۳) ا:۔ "ناسخ کے ہاں ایسے اشعار جن میں حسنِ مطلق یا اس کی کارفرمائیاں نظم کی گئی ہوں۔ بالکل نہ ملیں گے۔ یا ملیں گے تو محض برائے بیت ان کی بجائے محبوب کے لوازمِ ظاہری اور متعلقاتِ خارجی کا بیان کثرت سے موجود ہے"

ب:۔ "انہوں نے ہی سب سے پہلے دلّی اور لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کو قواعد و ضوابط کی سند دی" (ابو اللیث صدیقی)

(۴) "ناسخ بلا شبہ ایک اچھے اور پاکیزہ طرز کے ناسخ اور ایک بھونڈے طرز کے موجد ہیں۔ ان کے کلام میں نہ نمکینی ہے نہ شیرینی" (ڈاکٹر عبدالحق)

(۵) ا:۔ "ناسخ کے مزاج کی یہ خصوصیت بڑی نمایاں ہے کہ وہ دماغی عمل کی طرف زیادہ راغب ہیں۔ جذباتی ردِّ عمل اور جذباتی فکر سے ان کی طبیعت بھاگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے"

ب:۔ "وہ بہر حال ایک مسلّم الثبوت استاد ہیں"

ج:۔ "لکھنؤ کا اگر کوئی دبستان تھا تو اس کی تعمیرات کے واحد ذمہ دار ناسخ ہی نہ تھے"

د:۔ "میرا خیال یہ ہے کہ ناسخ کو لکھنؤ کا بہترین نمائندہ قرار دے دینا لکھنؤ کی لطیف ادبی روح کے ساتھ سخت ناانصافی ہے۔ ناسخ کی نمائندگی کا عقیدہ اس ادبی عصبیت کی پیداوار ہے جس نے دہلی کی شاعری کو اتنی ملکوتی تقدیس بخش دی کہ لکھنؤ کی شاعری کو سراپا خرابی اور برائی سمجھ لیا گیا ...."

س:۔ "ناسخ کے یہاں غالب کو نشتر نظر ضرور آتے ہیں مگر وہ کس قدر ہیں اور کہاں پڑے ہیں۔ اس کے متعلق بڑی ہی کاوش کی ضرورت ہے" (ڈاکٹر سید عبداللہ)

۶ - "از سنِ بست سالگی بمقتضائے موزونیٔ طبع فکرِ شعرِ ہندی می کند و در تلاشہائے معنیٔ تازہ می نماید۔" (مصحفی)

مندرجہ بالا آراء سے ماسوائے مصحفی کی رائے کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ناسخ اپنے علم و فضل اور مہارتِ فن کے باوجود عمر بھر ایک زبان کی ورزش میں مبتلا رہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ "معلم اللسان" یا "قواعد دان" کہا جا سکتا ہے۔ شاعری جو وارداتِ قلب کے بیان کا دوسرا نام ہے۔ ان کے بس کی چیز نہ تھی۔ وہ شخص جو بقولِ مصحفی "بیس سال کی عمر سے بمقتضائے موزونیٔ طبع" شعر و سخن کی خدمت کرتا رہا کسی صورت میں اس شئے لطیف کا اہل نہ تھا۔ خود ناسخ کی زبانی اس کے کلام کے متعلق سُنئے تو وہ متذکرہ بالا آراء کے پیشِ نظر ایک عجیب غلط فہمی میں مبتلا نظر آتا ہے :-

ہر بیت میں اک شاہدِ معنی کی ہے تصویر
ناسخ ہے مرقع نہیں دیوان ہمارا

آج اے ناسخ ہوں میں اسکندرِ ملکِ سخن
ہیں صفائی لفظ و معنی میں سب اشعار آئنہ

چونک اُٹھے خوابِ لحد سے سُن کے سودا یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں ناسخ فقط اعجاز ہے

عوضِ ملکِ جہاں ملکِ سخن ہے ناسخ
گو نہیں حکم رواں طبعِ رواں رکھتے ہیں

اور ناسخ جسے اعجاز سمجھتے ہیں۔ نقادانِ فن کو نہ اس میں شیرینی نظر آتی ہے نہ نمکینی۔

میرے خیال میں ناسخ کی شہرت کو نقصان پہنچانے کا باعث ان کی روایات سے وفاداری ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے کلام میں جن خوبیوں کا ذکر کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فارسی اردو اساتذہ کی روائیت کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنے کلام میں مندرجہ ذیل اساتذہ کے طبعی رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں :-

مست ناسخ تجھ کو رکھتا ہے کلامِ حافظ
میرے ساغر میں بجز بادۂ شیراز نہیں

ناسخ کی غزل سُن کے کہا کہتے ہیں شاباش
آتی ہے مجھے حافظِ شیراز کی آواز

ہے ریاضِ فکرِ ناسخ کی جو شادابی یہی
لکھنؤ میں آئے گی روحِ غنی کشمیر سے

محفلِ عشرت میں ناسخ یاد آیا ہے غنی
شمع ساں جلنے میں یاروں کو رلایا چاہئے

ناسخ یہ فصاحت و بلاغت
گویا سلمان و ساوجی ہے

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب
ہاں تتبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

ناسخ ہے میر سلمہ اللہ کی زمیں
اک معنیٔ شگفتہ کو باندھا ہزار رنگ

کون سی طرزِ سخن ہے جو اسے آتی نہیں؟
کیوں نہ ہو شاگرد ہے ناسخ ہر اک اُستاد کا!

ہر طرزِ سخن کے جاننے اور ہر استاد کی شاگردی کا دعویٰ بھی بالعموم فائدے کے بجائے نقصان دہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اس کا اقرار ہے کہ مدعی کی اپنی کوئی طرزِ سخن نہیں یعنی وہ اپنی منفرد ادبی شخصیت ہی سے انکار کرتا ہے۔ لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے!

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر شخص اپنی شخصیت کی تعبیر میں بے شمار ذرائع سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ جہاں تک بادۂ شیراز کا تعلق ہے یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ ناسخ کے کلام میں وہ بجنسہٖ موجود ہے۔ اگرچہ "مے و معشوق" کے مضامین کی کمی نہیں۔ صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں تصوف کی روایت جو ایران سے ہندوستان میں پہنچی۔ ناسخ اس سے بے خبر نہیں ؎

فصل میں عجب نہیں ہے اگر ابر برسا ہے بجائے آب شراب

حق پرستی کو نہیں چھوڑتے ہم بادہ پرست ہے نمازِ اولِ شب بادہ شرابِ آخرِ شب

ہو گیا مے سے نشۂ عرفان یار نے نور کر دیا ہم کو

ساغرِ امید خالی رہ گیا تو رہ گیا ساقیا! ہم اپنا جامِ زندگانی بھر چلے

ہستیِ عاشق ہے تیرے حسن کی تاثیر سے ذرّے پیدا ہوتے ہیں خورشید کی تنویر سے

آئنہ خانہ ہے عالم عکس افگن ہے وہی ہے فروغِ مہر و ذرّہ ایک ہی تنویر سے

اشارہ آمد و رفتِ نفس کا یہی ہے ہر دم بدن میں دم جو آیا ہے مقرر اس کو جانا ہے

بھرے ہیں جام مے لبریز شبنم ساغرِ گل ہے ادھر ہے نغمۂ بلبل ادھر شیشہ کی قلقل ہے

ان اشعار کے مطالعہ سے ناسخ کا یہ دعویٰ تو صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ؎

ناسخ کی غزل سن کے کہا کرتے ہیں شاباش آتی ہے مجھے حافظِ شیراز کی آواز

حافظ ممکن ہے ناسخ کو ان استعارات و اشارات کے استعمال پر شاباش دیتے ہوں جو حافظ کی ایجاد ہیں اور بعض تجربات کی ہم آہنگی پر بھی وہ مسرور ہوتے ہوں۔ مگر ناسخ کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ ؏

مرے ساغر میں بجز بادۂ شیراز نہیں

خالصتہً بادۂ شیراز ناسخ کے ہاں موجود نہیں۔ اگر کچھ ہے تو اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔ ولی سے لے کر ناسخ تک بادۂ شیراز میں بے شمار ہندی رنگ حل ہو چکے تھے۔ اردو شعرا کے علاوہ ہندی فارسی شعرا نے بھی ایرانی ادب میں خاصے اضافے کئے۔ ناسخ ان سے غیر متاثر نہ رہ سکتے تھے۔ وہ خود ہی تو غنیؔ کاشمیری کا ذکر بڑے خلوص سے کرتے ہیں اور فی الحقیقت غنیؔ کا اثر ان پر دیگر شعرا سے کہیں زیادہ ہے۔ غنیؔ سے نہ صرف وہ اپنی غزل کی ہیئت مستعار لیتے ہیں بلکہ ان کی تراکیب اور قوافی کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

غنیؔ

ہر رگِ گل رشتۂ باشد بپائے عندلیب دامِ دیگر نیست حاجت از برائے عندلیب

ہست ہر شاخِ گل عشرت سرائے عندلیب بر زمیں کے میرسد در باغ پائے عندلیب

تا وزید از گلشن کوئے تو بادے در چمن باشد از گل آتشے در زیر پائے عندلیب

گل برنگِ شعلۂ حسن از چمن پرواز کرد | گردم تا در آشیاں گردید جای عندلیب
ہیچ نقصے نیست ضائع در زمینِ پاکِ عشق | خندہ ہای گل دمید از گریہ ہای عندلیب
از صدائے خندۂ گل می شود روشن کہ نیست | ہیچ صوتی دل کشاتر از نوای عندلیب
نو عروسانِ چمن مشتاقِ دیدارِ تو اند | ہست در گلزار کویت گل بجای عندلیب
رشکِ زمینِ شعرم از گلہای مضمون گلشنی | ہست در ہیچ در دِ عشرت سرای عندلیب

بالِ بلبل را بجائی دستۂ گل بستہ ایم
پرواز خود بسکہ مارا نالہ ہائی عندلیب

ناسخ

کیا تری الفت میں ہیں اک نالہ ہائے عندلیب | ہے شکستِ رنگِ گل میں بھی نوائے عندلیب
مثلِ پروانہ جو اس محفل میں جائے عندلیب | آگ اپنے آشیانہ کو لگائے عندلیب
گر مشابہ تیری زلفوں سے نہ ہووے رشکِ گل | دام میں کیوں آپ کو ناحق پھنسائے عندلیب
نقشِ پا تیرا جو ہے اک گل تو اے خوش خرام | ہر جگہ پا ہے رشکِ نغمہ ہائے عندلیب
ہر کلی منقار ہے اس رشکِ گل کے عشق میں | آتی ہے ہر شاخِ گلبن سے صدائے عندلیب
جام مے لبریز ہیں ساقی فقط مطرب نہیں | گل کھلے ہیں باغ میں خالی ہے جائے عندلیب
تو وہ ہے پرکالۂ آتش جو گذرے باغ میں | پر نور تجھ سے چراغِ گل کھلائے عندلیب
چہرۂ جاناں ہے گل ایسا کہ ہر دم ہاتھ میں | طائرِ رنگِ حنا نالاں ہے جائے عندلیب

بعدِ مردن اڑتے پھرتے ہیں چمن میں بال و پر
عشقِ گل میں دیکھو اے ناسخ وفائے عندلیب

مندرجہ بالا اشعار میں ردیف و قوافی کی ہم آہنگی کے قطعِ نظر خیالات کی یکسانیت حیرت انگیز ہے۔ دونوں اساتذہ کو کسی حد تک ملتے جلتے مضامین سوجھتے ہیں۔ اگرچہ توارد کلی تو نہیں ہوا لیکن اثرات سے انکار ممکن نہیں:-

غنی:- فیض چوں گرسنہ پنہاں برود کس ز کریم | آب دریا ہمگی صرف بگرداب شود
ناسخ: پڑ گئے ہیں ناتوانی سے جو حلقے ان دنوں | سب کو میری چشمِ تر پہ ہے شبہ گرداب کا

غنی

تا بہ صحرا ہر طرف روشن چراغِ لالہ شد | گردباد از پرتوِ آں شعلۂ جوالہ شد
ابرِ طالع را تماشا کن کہ در فصلِ بہار | بیضۂ بلبل برائے گلشنم ژالہ شد
بسکہ در دشتِ جنوں دایم آتش زیرِ پا | حلقۂ زنجیر خواہد شعلۂ جوالہ شد

بسکہ افتاد ست بی علت گرہ در کارِ عشق — قطرۂ می بر لبِ دریا کشاں تبخالہ شد
تا دلِ ما کرد سر فریاد در صحرای عشق — گنبدِ گردوں علی پُر از صدای نالہ شد

ناسخ

پھر بہار آئی چمن میں زخمِ دل آلے ہوئے — پھر گئے داغِ جنوں آتش کے پرکالے ہوئے
واہ کیا تاثیر ہے رخسارِ آتش ناک کی — شعلۂ جوالہ تیرے کان کے بالے ہوئے
میرے خرمن پر اگر بجلی گرانے کو ہوا — سب ستارے برگشتۂ آسماں تزلزلے ہوئے
ہو گئی کیا آتشیں جل کر وہ بے ساقی شراب — تاک میں بھی دانۂ انگور تبخالے ہوئے

اس قدر ہے شوخ رنگت روئے آتش ناک کی — شعلۂ آتش ترے آگے دھواں ہو جائے گا

لگا دے شعلۂ عارض سے گر وہ آگ گلشن کو — کباب سیخ سمجھیں بلبلیں شاخِ نشیمن کو

حیرت ہے کہ دونوں کاملانِ فن کو محبوب کا جلال و جمال آتشیں نظر آتا ہے ؎

طالبِ آتشِ حسنِ ازلی ہیں ہوں وہ گرم — کہ ہوا مضغۂ دل سینے میں بریاں پیدا

اور سب سے زیادہ تعجب آمیز امر یہ ہے کہ دونوں اساتذہ کے الفاظ کا ردِ عمل یکساں ہوتا ہے۔ قطعِ نظر اس کے کہ قوافی میں بھی یکسانیت ہے ان قوافی کے زیرِ اثر جو خیالات سوجھ سکتے ہیں وہ بھی یکساں ہیں۔ تجربات کی یہ ہم آہنگی مختلف حالات کے باوجود خاصی دلچسپ ہے۔ ان تمام امور کے علاوہ حسن اور متعلقاتِ حسن کے تصورات بھی دونوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں :-

غنی :- شد رشتۂ گلدستہ زبادم تنِ زارم — آں دستۂ گل جانی در آغوش کہ دارد

ناسخ :- گل کو جب دیکھا وہ گلگوں پیرہن یاد آگیا — یاسمیں کو دیکھ کر اس کا بدن یاد آگیا

غنی :- میز ند چشم تو ہر لحظہ بمژگاں ناخن — ترسم اے شوخ میانِ من و تو جنگ شود

ناسخ :- ایسے ہم آماجگاہِ تیرِ مژگاں ہو گئے — روزنگوں کے جا بدن پر سارے پیکاں ہو گئے

غنی :- پیرہن گل، تن گل، عارض لب و لبارِ گل — باغبانِ عشق بستہ دستۂ زیں چار گل

ناسخ :- شاخِ گل ہیں دست و پا، رخسار گل لب برگِ گل — غنچۂ گل کہتے اس رشکِ چمن کی ناک کو

شاخِ گل ہے قد و قامت رنگِ گل رخسار پر — خندۂ گل جنبشِ لب بوئے گل تقریر ہے

شاخِ گل نے سیکھی ہے بنگِ گل وہ طفل نے سوار — نکہتِ گل کہتے ہیں ہم گرد بازی گاہ کو

گل رخوں کا جو تصور ہے سخن سنجی میں — گل فشانی ہے یہ ناسخ تری تقریر نہیں

غنیؔ کے کلام کے اثرات بلاشبہ ناسخؔ پر بڑے گہرے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ متاخرین فارسی شعرا جن میں بیدلؔ اور غنیؔ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں مجاز کی خوبی اور خیال کی نزاکت پر فریفتہ تھے۔ ناسخؔ کو غنیؔ کا یہ انداز زیادہ مرغوب معلوم ہوتا ہے لیکن غنیؔ کا اختصار اور جامعیت ناسخؔ کے بس کی بات نہیں۔ غنیؔ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کے باوجود اپنے تجربات کے ہر گوشہ کا ابلاغ کر دیتے ہیں۔ مگر ناسخؔ کو بعض اوقات اس میں مشکل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہاں فارسی اور اُردو زبان کا فرق بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ پھر ناسخؔ کے عہد میں اردو اتنی ترقی یافتہ نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔

حافظؔ اور غنیؔ کے علاوہ ناسخؔ نے جس فارسی شاعر سے اپنے کلام کا موازنہ کیا ہے وہ سلمانؔ ساوجی ہے ؎

ناسخؔ پہ فصاحت و بلاغت　　گویا سلمانؔ و ساوجی ہے

سلمانؔ و ساوجی کے درمیان واوؔ کا استعمال سمجھ میں نہیں آیا۔ ممکن ہے کہ کتابت کی غلطی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ سلمانؔ اور ساوجی کو دو شخصیتیں نہیں سمجھتے کیونکہ ردیف میں ضمیر واحد غائب "ہے" موجود ہے۔ دیوانِ ناسخؔ مطبوعہ نولکشور ۱۹۲۳ء اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس میں یہ شعر اسی طرح مطبوعہ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی دوسری اشاعت میں اس کی کوئی اور صورت ہو۔ صحیح مصرع یوں معلوم ہوتا ہے ع گویا سلمانِ ساوجی ہے۔

ناسخؔ اور سلمانؔ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دونوں کی شاعری کی بنیاد قدیم اساتذہ کی قائم کردہ روایات پر ہے۔ دونوں نے متقدمین کے مضامین کو نئے رنگ میں پیش کیا۔ دونوں شعرائے قدیم اور جدید میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں نے زبان کی نزاکت، صفائی، روانی اور چُستی کا خیال رکھا۔ مجاز کے برجستہ اور خوبصورت استعمال سے دونوں اساتذہ اپنی تخلیق کو حسن بخشتے ہیں۔ جمال کے بیان میں محبوب کے مختلف اعضا کا ذکر دونوں کی مشترکہ خصوصیت ہے۔ سلمانؔ :-

درِ دُرجِ درِ عقیقِ لبت نقدِ جاں نہاد　　جنسِ نفیس بود بہ جائی نہاں نہاد
قفلے ز لعل بر درِ آں دُرج زد لبت　　خالت ز عنبر آمد و مہری برآں نہاد
باریک تر ز مو کمرت را قبیعۂ　　ناگاہ در دل آمد و اسمش میاں نہاد
بعد ازیں از گرہِ زلفِ مغاں کن تسبیح　　بعد ازیں از خمِ ابروئے بتاں کن محراب

ناسخؔ :-

یہ نور ہے رُخِ مہ جبیں کا کہ ہو خجل چاند چودھویں کا　　جو حلقہ ہے زلفِ عنبریں کا وہ ایک نافہ ہے مشکِ چیں کا
زبسکہ وصفِ دہانِ شیریں کہ کرچکی ہے زبانِ شیریں　　بدن میں جب تک ہے جانِ شیریں مزا دہن میں ہے انگبیں کا
وہ چشم فتاں ہے غیرتِ گل وہ زلفِ پیچاں ہے رشکِ سنبل　　عذار میں ہے شباہتِ گل بدن میں عالم ہے یاسمیں کا
یہ ساعدوں کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بے دم　　نیامِ تیغِ قضا ہے مبرم لقب ہے قاتل کی آستیں کا

ان فارسی شعرا کے علاوہ ناسخؔ فردوسیؔ کا بھی ذکر کرتے ہیں ؎

ہیچ ہے فردوسیِ طوسی کو نسبت مجھ سے کیا　　دل سے ہوں مداح ناسخؔ بادشاہِ طوس کا

شاہِ طوس کی مداحی کے علاوہ بھی دونوں کے کلام میں کوئی مماثلت نہیں۔

اردو زبان کے اساتذہ میں ناسخؔ میرؔ اور سوداؔ کے [illegible]

باعث یہ تقلید کسی اور اردو شاعر سے نہ ہو سکی۔ ناسخ کی طبیعت میر سے بہت مختلف ہے۔ میر کے غم کی خصوصیت خلوص اور شدت ہے۔ ناسخ کے یہاں درد ضرور ہے۔ مگر وہ ایک وضعدار دنیا کا غم ہے۔ میر:۔

برسوں تک جی کو مار مار رہے
رات دن ہم امید وار رہے

موسمِ گل تک رہے گا کون؟
پچھتے ہی دل کو خار خار رہے

غمِ مرگ سے دل جگر راتیں ہے
عجب مرحلہ ہم کو درپیش ہے

دل تڑپے ہے جان کھپے ہے حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

دیدۂ تر کو سمجھ کر اپنا ہم نے کیا کیا حفاظت کی
آہ بزجانا رفتہ رفتہ یہ چشمہ دریا ہوگا

کیا جانیں آشفتہ دلاں کچھ ان سے ہم کو بحث نہیں
وہ جانے گا حال ہمارا جس کا دل بے جا ہوگا

نصیبوں میں ہے جن کے عیش وہ ہی میر جیتے ہیں
جیتے ہیں ہم بھی جو مرنے کو تھے تیار، یا قسمت!

اگرچہ میر یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں ؎

سخن غم سے آغشتہ خوں ہے ولیکن
نہیں لب سے آشنائے شکایت

لیکن میر کا کلام شکایت سے پاک نہیں۔ وہ جس شدت سے اپنی روداد بیان کرتے ہیں وہ شکایت کی حدود میں داخل ہوجاتی ہے ؎

زار رکھا، بے حال رکھا، بے تاب رکھا، بیمار رکھا
حال رکھا کچھ بھی ہم نے عشق نے آخر مار رکھا

شکستہ پائی و لب تشنگی پر اب کی نہ جا
چمن میں شور سرا اب تلک ہے بے پر کا

اور یہ شکایت اکثر گلے شکوے تک بھی پہنچ جاتی ہے ؎

جب گیا میں یاں سے تب کس کا گھر کس کے پاس
آفریں صد آفریں اے مردمانِ روزگار

اب بیاباں در بیاباں ہے مرا شور و فغاں
گو چمن میں خوش کی تہ تھی مری جائے نالہ زار

ہے مثل مشہور یہ عمرِ سعند کوتاہ ہے
طالع برگشتہ بھی کرتے ہیں اب امداد کار

اک پرافشانی میں بھی ہے یہ وطن گلزار سا
سامعوں کی چھاتیاں نالوں سے ہو دیں گی فگار

منہ پر آویں گے سخن آلودۂ خونِ جگر
چونکہ یارانِ سفر سے چاک ہے دل جوں انار

میر اس شکایت میں اتنا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ ؎

لب سے لے کر تا سخن ہیں خوں چکاں شکوے بھرے
لیکن ہے اظہار ہر ناکس سے اپنا ننگ و عار

میر نے اپنی جس غریب الوطنی کا رونا مندرجہ بالا اشعار میں رویا ہے بالکل اسی طرح ناسخ کو بھی وطن سے نکلنا پڑا۔ بلکہ ناسخ کو جن حالات کا سامنا رہا وہ میر سے زیادہ شدید تھے۔ میر تلاشِ معاش میں گھر سے نکلے تھے۔ مگر اس کے برعکس ناسخ کو جبراً "ملک بدر" کر دیا گیا۔ لیکن جہاں میر سراپا درد ہیں وہاں ناسخ اپنے غم کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

ہاں ہنسی ہے لب پہ دل میں درد ہے
راز رکھتا ہے نہاں جو مرد ہے

دورہا او غربت، وطن نزدیک ہے　　مرغِ جاں خوش ہو چمن نزدیک ہے

شکر افلاس میں عریاں نہ کسی نے دیکھا　　کاہشِ غم نے چھپایا مجھے چادر کے عوض

گر اٹھا کر شہر سے صحرا میں بٹھلاؤ گے تم　　بس وہیں شکلِ درخت اپنا وطن ہو جائے گا
کیوں سنبھلتا ہے نہیں ناسخ فراقِ یار کا　　ایک دن ناداں فراقِ روح و تن ہو جائے گا

غیبیت کی زندگی سے اس طرح کا مجموعہ تو دنیا داری کا دوسرا نام ہے۔ لیکن اس سے یہ اندازہ کر لینا غلط ہو گا کہ ناسخ پردیس میں بھی اتنے ہی مسرور ہیں جتنے کہ لکھنؤ میں تھے جسے وہ اپنا وطن سمجھتے تھے۔ ملاحظہ ہو:-

غم غلط ضعف کے باعث ہوا غفلت میں　　ہجر میں خواب کی جا غش مجھے اکثر آیا
دردِ سر مجھ کو جو غربت میں ہوا لائے تعجب!　　بدلے صندل کے وہیں جیخ سے پتھر آیا

چشمِ عاشق میں برابر ہے ولا گھر باہر　　ایک سا جلوۂ معشوق ہے اندر باہر

یہ سارے حیلے غم غلط کرنے کے ہیں۔ ورنہ ؎

کر دیا ہے قضا نے افتراق　　جان میں ہوں اور تن ہے لکھنؤ

کنایہ یہ ہے کہ میرؔ اور ناسخؔ دونوں کی طبائع بالکل مختلف ہیں۔ اوّل الذکر غم کی شدت سے مجبور ہو کر صبر و سکون کا دامن چھوڑ دیتے ہیں لیکن آخر الذکر اپنے طوفان کے سامنے وضعداری کا بند باندھ کر اس میں ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیتے ہیں ؎

حیرت سے اشکِ چشم کے باہر نہ ہو سکے　　دریا بھرے رہے پہ مژہ تر نہ ہو سکے

ناسخؔ نے اپنی محرومیوں کا بیان بہت کم کیا ہے مگر جہاں کیا ہے وہاں اگر میرؔ کے برابر نہیں تو نزدیک ضرور پہنچ گئے ہیں ؎

دست خالی ہی ملا ہے ہمیں ساغر کے عوض　　پیتے ہیں خونِ تمنا مئے احمر کے عوض!

بیٹھے بیٹھے کروٹیں تجھ بن جو گھبراتا ہوں میں　　نام لے لے کے ترا زانوں کو چلاتا ہوں میں

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو　　صدمہ شیشے کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں　　خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

ہر گل ہے اس چمن میں گریزاں برنگِ بو　　سروِ چمن ہے کون جو سرو رواں نہیں

کروں کیا احتیاطِ جسمِ خاکی　　غبارِ توسنِ عمرِ رواں ہے

اس چمن میں ہے برنگِ گل بقائے آفتاب　　بے ثباتی میں ستارے یاسمن سے کم نہیں

ہے غلط فہمی سے ہر کوئی گرفتارِ دوئی　　عین دریا ہے جو اٹھ جائے ابھی پندارِ موج

اس قبیل کے اشعار کی خاصی تعداد ناسخؔ کے ہاں بھی موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود ناسخؔ میرؔ سے زیادہ سوداؔ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ میرؔ کی

یا ردیف قافیہ میں غزل کہہ لینے سے تقلیدِ میرؔ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے گدازِ طبیعت اور دردمند دل کی ضرورت ہے۔

مسئلہ وحدت الوجود اور دنیا کی بے ثباتی کے مضامین کا ذکر حافظؔ اور ناسخؔ کے ضمن میں آ چکا ہے۔ یہ سرمایہ اردو کے بیشتر شعرا میں مشترک ہے۔ اس لئے ان مسائل کے بیان سے کوئی دو شاعر ہم آہنگی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ روایت کی پابندی میں مماثلت سے طبائع کے اشتراک کا ثبوت فراہم نہیں ہو سکتا۔

میرؔ اور ناسخؔ دونوں مصوری کی کوشش کرتے ہیں مگر یہاں بھی دونوں کا عمل مختلف ہوتا ہے۔ میرؔ مشاہدہ سے پیدا شدہ اپنی کیفیات کی مصوری کرتے ہیں جبکہ ناسخؔ تجریدی تصورات کی بجائے مشاہدے کی براہِ راست تصویر بناتے ہیں۔ یہ بھی ناسخؔ کی طبعی لطف اندوزی کے تقاضے کے نتیجے میں ہے۔

میرؔ کے بعد ناسخؔ اردو کے جس استاد سے متاثر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ سوداؔ ہیں۔ اور یہ دعویٰ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ ناسخؔ طبعاً سوداؔ سے زیادہ نزدیک ہیں۔ سوداؔ کی طبیعت حسن و جمال کی طرف زیادہ راغب تھی۔ ان کے ہاں "جمال" کی تعریف میں اشعار کثیر تعداد میں موجود ہیں محبوب کے حسن کا حسنِ فطرت سے مقابلہ بھی سوداؔ کا مرغوب موضوع ہے اور اس میں بھی ناسخؔ ان کے شریک ہیں۔ محبوب کے مختلف اعضا اور حرکات و سکنات کا بیان بھی سوداؔ کی غزل میں موجود ہے اور ناسخؔ نے اس امر کی بھی تقلید کی ہے۔ کہنا یہ ہے کہ حسن کا ردِ عمل سوداؔ اور ناسخؔ پر یکساں ہوتا ہے اور دونوں اس کیفیت کے بیان میں کیف اور سرور محسوس کرتے ہیں۔ لیکن سوداؔ کے مقابلے میں ناسخؔ حسن کی مصوری میں زیادہ مشتاق ہیں بلکہ جزئیات کے بیان میں زیادہ فن کاری کا ثبوت دیتے ہیں۔ سوداؔ کے اس قبیل کے اشعار کا نمونہ یہ ہے:-

چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا پردے میں تھا آفتاب دیکھا

سرسبز ہوا باغ ترے حسن کا خط سے گرد رخِ آئینہ زنگار سلامت

زلف دیکھو یا کمر یا چشم یا ابرو کی سمت آتی راہیں دل کے گم ہونے کی تو کیدھر کو ہیں

سنبل و زلفِ سیاہ کاکل و شب چاروں ایک غمزہ ناز و ادا جنبشِ لب چاروں ایک

ناسخؔ:-

ڈھلک آتے ہیں ترے رخساروں سے جو قطرے پسینے کے گھر بنتے ہیں دریا کی طرح چاہِ زنخداں میں

سبزیِ رخسارِ جاناں عکس افگن ہو اگر آئینہ مثلِ زمردِ پیشِ جاناں سبز ہو

خدا نے کیا دیا ہے رنگ اس کے روئے گلگوں کو کہ ہے اس کے پسینے سے خجالت قطرۂ خوں کو

شاخِ گل ہے قد و قامت برگِ گل رخسار پر خندۂ گل جنبشِ لب، بوئے گل تقریر ہے

حسنِ محبوب اور حسنِ فطرت کے تقابلی مطالعے کے نمونے یہ ہیں:-

سوداؔ:- دیکھے جو ٹک آن ترا سروِ خوش خرام قمری نہ دیکھے پھر کبھی شمشاد کی طرف!

ناسخؔ:- تو وہ گل ہے کہ گذرا باغ میں جب جب خیاباں سے تو آوازِ شکستِ رنگ سے گل نے پکارا ہے

گر ترے دستِ حنائی دیکھ پائے عندلیب　　شاخِ گل کو آہِ سوزاں سے جلائے عندلیب
اس گل کی بو جو باغ میں کل لے گئی نسیم　　ہر موجِ بوئے گل ہوئی بوئے دماغِ گل

سوداؔ :- گے بولیں عقیق اور کہہ نگینِ لعل ٹھہراویں　　یہ نا شاعر ترے ہونٹوں کو کیا کیا نام دھرتے ہیں
تبسم یوں نمایاں ہے مسی آلودہ دنداں سے　　نمود ابرِ سیاہ میں اس طرح بجلی کی اچپلیاں

ناسخؔ :- یہ تصور ہے لبِ یاقوت رنگِ یار کا　　دل ہمارا ان دنوں کانِ بدخشاں ہو گیا
گل کو جب دیکھا وہ گلگوں پیرہن یاد آ گیا　　یاسمن کو دیکھ کر اس کا بدن یاد آ گیا!
ماہِ نو ہے مثلِ ابرو لیکن اس کا رو نہیں　　ماہِ کامل صورتِ رُو ہے مگر ابرو نہیں
کیا چنبیلی میں ہے جو اس گل کے دنداں میں نہیں　　لعلِ خنداں میں ہے جو گلہائے خنداں میں نہیں

حسن کی تاثیر اور معجزوں کو دونوں اساتذہ بیان کرتے ہیں۔ حسن کے اثرات مختلف چیزوں پر مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ مظاہرِ قدرت بھی حسن کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ پرندے اور درخت تک متاثر ہوتے ہیں:-

سوداؔ :- باغ میں جس دم خرام اس سرو قامت نے کیا　　نعرۂ حق سرۂ قمری نے بھر کر جی دیا
چمن میں کس کے صبا رُخ سے اُٹھ گیا ہے نقاب　　کہ گل مجھے نظر آتے ہیں آفتاب زدہ
آتے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب　　پروانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے

ناسخؔ :- تو اپنے منہ سے جو اُلٹے نقاب دریا میں　　ہر اک بھنور ہو وہیں آفتاب دریا میں
شب ترے پرتو سے لبریزِ لطافت تھا چمن　　ہر گلِ شبو سے ہماری نور کا فوارہ تھا
سروِ آزاد سے ہیں سشر مندہ　　سرنگوں ہیں جو بار دار درخت
نہیں جنبش ہوا سے یہ اے گل　　تیرے غم میں ہیں بے قرار درخت
ہر روش پر ترے ہی مجرے کو　　ہیں کھڑے باندھ کر قطار درخت

محبوب کو پھول، سرو یا بہار کے نام سے اکثر شعراء نے یاد کیا ہے۔ گلشن کی لطافت و نزاکتِ محبوب کی یاد دلانے اور سوتے ہوئے جذبات کو جگانے کا بہانہ ہے۔ شاعر کی حساس طبیعت عارضِ گل اور عارضِ محبوب دونوں کو ایک ہی سمجھتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں مجاز کے اس پہلو کا استعمال ملاحظہ ہو:-

سوداؔ :- عارضِ گل پہ نہیں شبنم عرق ہے شرم کا　　دیکھ کر میرا جنوں، یار و لجاتی ہے بہار
یہ جانئے کہ کس گل و بلبل کا راز ہے　　غنچہ کی رکے ہی ہے دہن پہ جو آئی بات

ناسخؔ :- ہیں قطرۂ شبنم لبِ گل برگ کے ہمراہ　　کس حسن کی آتش سے ہے گلزار میں گرمی
صبح کہتا تھا خیر گلزار کی پیکِ نسیم　　ہے گلِ تر تو کہاں برگِ خزاں ملتا نہیں
حالِ غیر اگر میں کرتا ہے حسنِ یار سے　　گل کی ہم تعریف سنتے ہیں زبانِ یار سے

سوداؔ اور ناسخؔ دونوں اپنے محبوب کو آفاقی شے تصور نہیں کرتے۔ ان کا محبوب اسی عالمِ سفلی میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ وصل کا تصور بھی دونوں کا یکساں یعنی عیش و طرب ہے:-

سوداؔ:-	حاصل تو ہوا وصل میں رات پہ افسوس	یک پل میں شبِ عیش و طرب ہو گئی آخر
ناسخؔ:-	وصل کی شب جب کہ آئی اُس نے میرے گھر میں قدم	صبح خندہ رُو ہوئی حاضر مبارکباد کو

اب تک بحث کا رُخ اس طرف رہا ہے کہ ناسخؔ نے اُردو اور فارسی کی قدیم شعری روایت سے کس حد تک تاثر قبول کیا اور اس کے کلام میں کن اساتذہ کے تجربات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ انسانی شخصیت کی تعمیر میں مطالعہ بڑا اہم عنصر ہے اور یوں بھی بعض تجربات کسی دوسری شخصیت سے ہم آہنگ بھی ہو سکتے ہیں۔ پھر ہر ماحول اور معاشرے کی اپنی الگ خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی فطانت کی وجہ سے پورے معاشرے کو اپنا معتقد بنا لیتی ہیں۔ اس لئے اس امر میں تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ ناسخؔ مختلف چشموں سے سیراب ہوتے ہیں اور ان تمام لطافتوں کو جو انہیں مختلف ذرائع سے حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے ناظرین تک پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ناسخؔ کی ایک اپنی شخصیت ہے جو دوسروں سے منفرد ہے۔ اس کا اپنا مزاج ہے اور سب سے بڑھکر اس کا اپنا نظریۂ حیات ہے جس کا کھوج لگانا ہمارا فرض ہے۔

کہا گیا ہے کہ ناسخؔ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لکھنوی دبستانِ شاعری کے بانی ہیں۔ دہلویت اور لکھنویت کے فرق کی اساس زبان کے معمولی فرق پر رکھی جاتی ہے حالانکہ زبان وقت کے ساتھ ہر جگہ بدلتی رہتی ہے۔ بعض الفاظ جو لکھنؤ میں متروک ہوئے وہ اسی عہد میں دلّی میں بھی متروک ہو گئے تھے۔ میرؔ، انشاؔ اور غالبؔ۔ ذوقؔ۔ شاہ نصیر وغیرہ کی مستعملہ زبان میں بنیادی فرق موجود نہیں۔ فارسی تراکیب کا رواج اور ہندی الفاظ کا اخراج دونوں جگہ یکساں کارفرما نظر آتا ہے اور یہ بات اس قدر عیاں ہے کہ مثالیں پیش کرنے کی حاجت نہیں۔ زبان میں محض علاقائی فرق کی بنا پر شعری دبستانوں کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

پھر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ لکھنوی شاعری میں "تصوف"، "قناعت"، "صبر"، "توکل" اور "استغنا" کا فقدان ہے۔ اس میں درویشانہ، صوفیانہ یا زاہدانہ شان کا کوئی مقام نہیں (دیکھئے دلّی کا دبستانِ شاعری۔ نورالحسن ہاشمی ص۲۸۱) لیکن یہ بیان محتاجِ توجہ ہے۔ خود ناسخؔ کے ہاں تصوف کا عنصر غالب ہے۔ اُردو کے بیشتر شعرا خود صوفی نہ تھے اور ناسخؔ بھی قطعاً صوفی نہ ہوں گے۔ مگر جہاں تک "تصوف برائے شعر گفتن" کا تعلق ہے۔ ناسخؔ اس میں ہرگز پیچھے نہیں ہیں۔ ان کے اس مضمون کے اشعار حافظؔ اور میرؔ کے ذکر میں دیئے جا چکے ہیں۔ دیوان میں مزید مثالیں بھی موجود ہیں۔ دوسرا فرق۔ المیہ۔ اور۔ طربیہ۔ شاعری کا ہے۔ یہ اصطلاحات جن معانی میں ہاشمی صاحب نے اپنی مذکورہ کتاب میں استعمال کی ہیں ان معانی میں بھی درست نہیں کیونکہ سوداؔ اور میرؔ میں بھی یہ فرق موجود ہے۔ حالانکہ دونوں دلّی سے متعلق ہیں اور پھر آتشؔ اور ناسخؔ میں بھی یہ فرق موجود ہے حالانکہ دونوں لکھنؤ سے متعلق ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو المیہ شاعری کو مرثیہ گوئی کی وجہ سے لکھنؤ ہی میں عروج حاصل ہوا۔

تیسرا فرق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دہلوی شاعری میں امرد پرستی کا چرچا زیادہ ہے۔ لیکن لکھنؤ میں نسوانی رنگ جھلکتا ہے (کتاب مذکور صفحہ ۲۸۱-۲۸۲) امرد پرستی اردو شاعری میں امرِ واقعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ روایت کی حیثیت سے داخل ہوئی اور اس روایت کے تحت ناسخؔ کے ہاں بھی بے شمار اشعار موجود ہیں۔ غالباً "سبزۂ خط" اور "خطِ سبز" کا مضمون اس کثرت سے کسی اور شاعر کے ہاں

نہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

روئے جاناں پہ ہوا خطِ معنبر پیدا ۔۔۔ ہو گئے حسن کے پرواز کو شہپر پیدا

آتشیں رُخ پہ ہوا خطِ معنبر پیدا ۔۔۔ بدلے پانی کے ہوا آگ سے عنبر پیدا

نہیں ہے سبزۂ خط عارضِ محبوب کے لب پہ ۔۔۔ جُٹے ہیں جمع پروانے یہ آکر شمع روشن پہ

تاثیرِ زلف سے خطِ لبِ یار سبز ۔۔۔ کرتا ہے جسم کو اثرِ زہرِ مار سبز

خطِ سبز آیا جو منہ پر کم ہوئی زلفِ دراز ۔۔۔ راہِ ظلمت معجزے سے خضر نے کوتاہ کی

خط نکلتا ہے کہاں خطِ شعاع ۔۔۔ آپ کا سورج گہن نزدیک ہے

اِن اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی امرد کی تعریف میں ہیں۔ جس کے حسن کو خط کا آنا خراب کر رہا ہے اور ایسے اشعار ناسخ کے تینوں دیوانوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ لہذا اس بنا پر انہیں کسی دبستانِ شاعری کا بانی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس محبوب کا عورت ہونا صرف لکھنؤ سے مخصوص نہیں۔ ولی کے ہاں بے شمار ایسے اشعار موجود ہیں جن میں محبوب کو عورت سمجھا گیا ہے۔ مثلاً:۔

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا ۔۔۔ ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف ۔۔۔ اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

تجھ مکھ پہ اے نازنیں یوں نقاب ۔۔۔ جھلکتا ہے جیوں مطلعِ آفتاب

دیکھا ہوں دریائے جنوں تجھ آشنائی میں بپا ۔۔۔ ہے پردۂ چشم پری کشتی کو میری بادباں

ظاہر ہے کہ ان اشعار کے باوجود ولی کا لکھنوی شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔

متقدمین کے کلام میں نہ صرف یہ کہ خارجی متعلقاتِ حسن کا بیان ہوا ہے بلکہ رعایتِ لفظی کا اہتمام بھی موجود ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جس بنا پر ناسخ کو "لکھنوی دبستانِ شاعری" کا بانی کہا جاتا ہے یا اردو شاعری کو دو مختلف دبستانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ وہ بنیاد مضبوط نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تمام خصوصیات جو متقدمین کے کلام میں موجود تھیں وہ ناسخ کے ہاں بھی موجود ہیں اور وہ تمام ایجادات جو ناسخ کے ذمے لگائی جاتی ہیں۔ ان سے پیشتر اردو شاعری میں کم و بیش ہر شاعر کے ہاں موجود ہیں۔ انشا اور مصحفی، جرأت اور رنگین تو ناسخ سے چند قدم آگے ہی ہیں پیچھے ہرگز نہیں۔ فرق صرف طرزِ ادا اور زبان کا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس فرق کو بھی کسی شاعری کے دبستان کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

زبان کی اصلاح ایک تدریجی اور اجتماعی عمل ہے۔ ہم کسی شخص کے ذمے نہیں لگا سکتے کہ اس نے چند قوانین وضع کئے اور زبان کو ان کے تابع کر دیا۔ زبان کے تغیر کا عمل ہمیشہ پہلے ہوتا ہے اور قوانین بعد میں بنتے ہیں اور یہ عمل ہر زندہ زبان میں جاری رہتا ہے۔ قواعد دان صرفی اور نحوی اس عمل کا جائزہ لیتے اور اسے مربوط کرتے رہتے ہیں۔ نہ تو شاعری کی بنیاد لسانی حدبندیوں اور صرفی قواعد پر ہوتی ہے اور نہ ہی ان بنیادوں پر شعری دبستان استوار کئے جاتے ہیں۔ شعر ایک جذباتی کیفیت کا نام ہے اور لسانی قانون سازی ایک ذہنی عمل ہے۔ ہر شخص اظہار و ابلاغ

کے لئے وہ زبان استعمال کرتا ہے جو اس کے تحت الشعور میں موجود ہے۔ ہر تجربہ ایک مخصوص خیال کی تحریک کرتا ہے۔ اس خیال کی تصویر مخصوص الفاظ میں بنتی ہے اور یہ الفاظ وہ ہوتے ہیں جو شاعر کے سرمایۂ لغت میں کارکنوں کی فوج کی حیثیت سے موجود ہوتے ہیں۔ یہ سپاہی اپنے مناسب مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شاعر کا ذوقِ ترتیب انہیں آراستہ کر دیتا ہے۔

ناسخ کسی دبستان کے بانی نہیں بلکہ اردو کی اس شعری روایت کے علمبرداروں میں سے ایک ہیں جو فارسی کے راستے اردو میں داخل ہوئی۔ دکنی، میر، سودا اور ان کے معاصرین و متعلقین کی روایت لکھنؤ پہنچی۔ ہر شخص کے ذاتی تجربات اور ذہنی رجحانات، اجتماعی اور سماجی پس منظر، مجلسی اور ادبی تحریکات ہر چیز اس پر اثر انداز ہوئی اور اس طرح اردو شعری سرمایہ کا جو مجموعہ تیار ہوا ناسخ کا کلام اس مجموعے کا ایک حصہ ہے اور بس!

لیکن اس اجتماعی خصوصیت کے باوصف ہر شاعر کی کچھ انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ناسخ کی ان خصوصیات کا پتہ لگایا جائے۔ میر کے ضمن میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ناسخ زندگی سے ایک سمجھوتے کے قائل ہیں، اور وہ سمجھوتہ اس قسم کا ہے جو ہر وضعدار دنیادار کیا کرتا ہے۔ جذبے کے طوفان کو مصنوعی بندشوں سے روکنا اور دبیز غلافوں کے نیچے چھپانا پڑتا ہے۔ اسی سے زندگی میں ایک توازن اور ٹھیراؤ ہے۔ سیمابی کیفیتیں جذبات کی رو میں بہہ جاتی ہیں مگر اہلِ دل سوز کو چھپا کر بحرِ غم کو تلاطم نہیں ہونے دیتے۔

دل اگر ہوتا ہے نالاں میں سمجھتا ہوں غنا — سازِ عشرت جانتا ہوں طائرِ ناساز کو

غمِ افلاس کہاں دل ہے تو انگر اپنا — زرد چہرہ نہیں فاقوں سے یہ ہے زر اپنا

علامہ اقبال مرحوم بادِ مخالف کو اونچی پرواز کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ناسخ غم سے مہمیز کا کام لیتے ہیں۔ ٹھوکریں جہاں تجربہ کار بناتی ہیں وہاں قوتِ عمل بھی تیز کر دیتی ہیں ۔

تیری نوک اے خارِ غم دیکھیں تو کتنی تیز ہے — توسنِ عمرِ رواں کو حاجتِ مہمیز ہے

مشکلات مانعِ رفتار نہیں ہو سکتیں بلکہ رفتار کی تیزی کا بہانہ بنتی ہیں ۔

مانعِ رفتارِ مجنونِ وحشی کو کیا ہو خارِ دشت — تیز رو کرنا فرس کو کام ہے مہمیز کا

غم کو سینے سے لگا کر اس سے راحت حاصل کرنا مردانِ خدا کا کام ہے اور گریبان چاک کر کے دولتِ غم کو رسوائے بازار کرنا شیوۂ کم ظرفاں ہے۔ ناسخ کے کلام کی یہ خصوصیت انہیں اردو شعرا میں ممتاز بنا دیتی ہے کہ وہ آہِ بے تاثیر کو اپنی غیرت کے منافی سمجھتے ہیں ۔

ضبط میں کرتا نہیں آتی ہے غیرت دوستو! — کیا بھلا منہ سے نکالوں آہِ بے تاثیر کو

برنگِ گل مجھے کیا چاہیے گریباں چاک؟ — کہ مثلِ غنچہ ہزاروں ہیں دل میں پنہاں چاک

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود چشمِ گریاں کی فضیلت سے کوئی منکر نہیں۔ صرف احتیاط یہ ہے کہ چشمِ گریاں اور ابرِ باراں میں ایک فرق ہے جو ملحوظ رہنا چاہیئے۔ نہیں تو خندۂ عالم کا سبب بننا پڑے گا ۔

برق اس پہ ہنستی ہے روتا ہے اس پر اک جہاں — ابرِ باراں اور ہے اور چشمِ گریاں اور ہے

ناسخ کے ہاں رجا اور امید کے اسباق کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ زندگی کی قدر کرتے ہیں اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ یہ ان کے مزاج کی خصوصیت ہے۔ ارادے کی پختگی سے ہم کنارِ کامیابی ہونے کی خواہش اردو شاعری میں جنسِ کمیاب کا درجہ رکھتی ہے ۔

وہ بحرِ حسن مجھ ثابت قدم سے کیوں گریزاں ہے؟ — نکل سکتا ہے کب آپ رواں آغوشِ ساحل سے؟

نہ داغِ یاس سے گھبرا، بر آئے گی امید　　گلوں کے بعد ہوا کرتے ہیں ثمر پیدا
شگفتہ غنچۂ امید کر سدا اے گل!　　خزاں میں ساتھ نسیمِ بہار لیتا جا!

ناسخ کے ہاں زندہ دلی کی تحریک اور شعور بہت نمایاں ہے اور یہ مشہورِ عالم شعر بھی انہی کا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے　　مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں؟

لیکن زندہ دلی ایک عادت کا نام ہے جو مشق سے پختہ ہوتی ہے۔ ہار کی چوٹ دل پر کھا کر مسکراتے رہنا ناپختہ ذہنوں سے ممکن نہیں ؎

شاد ہیں باغِ فنا میں وہ گل　　اپنی ہستی پہ ہنسا کرتے ہیں

اپنے مزاج کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کے لئے مناسب صحت اور توانا خون کی ضرورت ہے۔ دیکھئے ناسخ کے خیالات کس قدر صحت مند ہیں ؎

بجز رنگیں مزاجی زندہ دل ہونا نہیں ممکن　　کہ رنگِ زندگانی ہے بدن میں جب تلک خوں ہے

دوسروں کے خیالات کا احترام تمدن کی جان ہے۔ ایک چیز ہماری نظر میں خوب اور دوسرے کی نظر میں زشت ہو سکتی ہے۔ قوتِ برداشت زندگی میں خوشگواری کا باعث ہوتی ہے ؎

ناسخ ہر ایک ملک کی ہوتی ہے اور رسم　　آزردہ وضع دہر میں ہم بے سبب رہے
ہیں جو سالک جانتے ہیں اپنے دشمن کو بھی دوست　　آبلوں کو فائدہ کرتی ہے کاوش خار کی

زندگی کے متعلق حسین تصورات کا اس وقت تک پیدا ہونا ممکن نہیں جب تک کہ اس کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہی نہ ہو۔ زندگی کی ساری رونق اس کے زوال پذیر ہونے میں ہے۔ فنا کا احساس عمل میں تیز روی پیدا کرتا ہے۔ یوں دنیا کے ہنگاموں میں رونق ہے لیکن زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جبکہ ہم اپنے اور ساتھیوں کے متعلق سوچتے ہیں۔ اور ہمیں دنیا کی بے ثباتی اور سب سے بڑھ کر اپنی بے بسی کا خیال تکلیف دہ ہونے لگتا ہے ؎

اس باغ میں ثبات ہے گل کو نہ خار کو　　اسفل رہے جہاں میں نہ عالی نسب رہے
انسان دل میں کتنے ہیں حسرت سے مرتے دم　　تنہا عدم کو ہم چلے دنیا میں سب رہے
ہر موجِ بوریا رگِ خوابِ گراں ہوئی　　راحت میں عمر بھر مرے پائے طلب رہے
کی ہے خیالِ زلف میں سب زندگی بسر　　گویا کہ ہم جہان میں بس ایک شب رہے

اس مسئلہ سے غالب نے رونقِ ہستی کا پیغام حاصل کیا ہے ؎

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ناسخ بھی اسی سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ؎

کسی سے فارغ نہیں ہر چند ہوں سیر اہلِ حرص　　ہے دہن لبریز نعمت سے زباں گردش میں ہے
آواز یہ آتی ہے لبِ آبِ بقا سے　　مرنا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا

لیکن انسان کی فنا پذیری کے باوجود اس کے اشرف المخلوقات ہونے میں کوئی شک نہیں۔ رونقِ عالم کا باعث یہی ذاتِ شریف ہے ناسخ اسے "اکسیر" کا نام دیتے ہیں ؎

ہے بشر گو خاک کا پتلا نہ جانو غافلو   ایک ہی صورت ملی ہے خاک کو اکسیر کی

انسان اگرچہ من حیث النوع اشرف المخلوقات ہے مگر اس شرف میں بھی حفظِ مراتب کا خیال ضروری ہے ؎

بظاہر سب مساوی ہیں مگر ہے فرق باطن میں   نہ ہر سینے میں حکمت ہے نہ ہر خم میں فلاطوں ہے

مدارج کے لحاظ سے کوئی جتنا بلند ہوتا ہے اس کے طرزِ عمل میں سکون اور ٹھہراؤ اسی قدر زیادہ ہوتا ہے ؎

کم بضاعت جتنے ہیں رکھتے ہیں وہ جوش و خروش   زور ہوتا ہے کسی دریا میں کب طوفان کا

برائی سے گریز بھی ایک طرح کی نیکی ہے۔ بروں کی صحبت باعثِ نقصان و ذلت ہوتی ہے ؎

قابلِ قرب نہیں ہے اذلوں کی صحبت   دور رہ ان سے دلا جن کو ترا پاس نہیں

جانور اچھے کہیں ناسخ برے انسان سے   شہر سے وحشت ہوئی مانوس ویرانہ ہوا

لیکن اس میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ خواہ مخواہ کی فرعونیت اور دوسروں کی طرف چشمِ کم سے دیکھنا طبعی رذالت کی علامت ہے ؎

چشمِ کم سے خلق کی جانب نظر کرنے لگا   اپنے رتبے سے ورا جب کوئی انسان بڑھ گیا

اور یہ اخلاقی سبق بھی ناسخ کے کلام میں موجود ہے ؎

انساں کو انساں سے کینہ نہیں اچھا   جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا

رات دن غافل بدوں سے ہی کیا کر نیکیاں   کیا برا ہے اس میں کچھ تیرا بھلا ہو جائے گا

خیریت چاہے تو سیدھی چال چل او بادہ مست   گرتے ہیں نشے میں چلتے ہیں اگر مے خوار کج

ہرزہ گوئی سے کہیں بہتر ہے خاموشی دلا   عاشقوں کو آہِ بے تاثیر کی حاجت نہیں

ہے شرارت نشانِ سختیِ دل   نرم پتھر میں بھی شرار نہیں

ترکِ اسباب پہ آمادہ جو ہے اے ناسخ   تیرے نزدیک یہ کیا عالمِ اسباب نہیں

اگرچہ پند و نصائح کی شاعری اپنی عظمت کھو بیٹھی ہے مگر کہیں کہیں کانٹے سے انسانی ذہن کی راہنمائی کر دینا افادے سے خالی نہیں۔

ناسخ کی خصوصیات میں سے اہم ان کا مقامی رنگ ہے۔ اردو شاعری پر ایسے بجا اعتراضات ہوئے کہ اس میں غیر ملکی ماحول کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ناسخ کے ہاں ہمیں مقامی مناظر کا ذکر ملتا ہے جو غنیمت ہے ؎

کب تک وہ ہم کنار رہتے مجھ سے کنارِ گنگ   ہے آج سیلِ اشک برابر کنارِ گنگ
کب لکھنؤ سا شہر ہے کوئی کنارِ گنگ   مل جائے گومتی میں تو ہے افتخارِ گنگ
دن بھر جو پھول بہتے ہیں تو رات بھر چراغ   فردوس میں بھی یاد رہے گی بہارِ گنگ

اشکِ خونیں رنگِ لالہ راگ ہے   واہ کیا خوش رنگ اب کا پھاگ ہے

تیرے پرتو نے کیا گنگا کو دریا نور کا　　جس نے دیکھا لہر کو سمجھا وہ شعلہ طور کا

آتی ہے جا بجا بدلی　　ساقیا جلد آ ہوا بدلی

ناسخ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت مصوری ہے۔ ناسخ انسانی کیفیات کی مصوری میں جواب نہیں رکھتے۔ یہ تصویر کشی کہیں جذبات کی ہے کہیں کیفیات کی اور کہیں مناظر کی۔ لیکن جہاں کہیں بھی ہے مکمل ہے

ایک جگہ ایک حرماں نصیب کی حالت بیان کی ہے ؎

منہ ہے زرد، اشک ہیں سُرخ اور ہے دم پر سرد آہ　　حالِ دل ہے عیاں اس کو بیاں کیا کیجئے

دوسری جگہ ایک منتظر کی حالت بیان کرتے ہیں۔ دل اور آنکھوں کی کیفیت ملاحظہ ہو ؎

کر کے وعدہ شب کے آنے کا نہیں آیا ہے وہ
بیقراری دل میں ہے اور انتظار آنکھوں میں ہے

بعض جگہ دو تصویریں اکٹھی بناتے ہیں۔ ایک محبوب کی، دوسری کسی اور شے کی جس سے محبوب کو تشبیہ دینی مقصود ہو۔ اور پھر اس سے محبوب کی فضیلت ثابت کرتے ہیں ؎

ماہِ کامل صورتِ رُو ہے مگر ابرو نہیں　　ماہِ نو ہے مثلِ ابرو لیکن اس کا رُو نہیں

انخلاطِ گل سے رنگیں قطرۂ شبنم نہیں　　رنگ اسے کہتے ہیں تم نے عرق منہ پر شہاب

محبوب کی حرکات کی نہایت عمدہ تصویریں ناسخ پیش کرتے ہیں۔ محبوب کے پسینہ پونچھنے کا ذکر ناسخ کو زیادہ مرغوب ہے ؎

پسینہ یار نے پونچھا ہے جب دستِ حنائی سے　　دُرِ غلطاں نظر آتے ہیں مجھ کو دستِ مرجاں میں

ڈھلک آتے ہیں رخساروں سے جو قطرے پسینے کے　　گُہر بنتے ہیں دریا کی طرح چاہِ زنخداں میں

پسینہ اپنے ماتھے کا نہیں جھاڑا ہے انگلی سے　　یہ اُس بے تدرسنے توڑا ہے سلکِ دُرِ مکنوں کو

ناسخ تشبیہات کا بادشاہ ہے۔ محبوب کے حسن سے اسے بے حد حسین اشیاء کا تلازمہ ہوتا ہے اور اس طرح وہ اتنی خوبصورتی سے جمالیاتی کیفیات کو نمایاں کرتا ہے کہ انسان عش عش کر اُٹھے ؎

شاخِ گل ہے قد و قامت برگِ گل رخسار ہیں　　خندۂ گل، جنبشِ لب، بوئے گل تقریر ہے!

شاخِ مرجاں موجِ عکسِ دستِ رنگیں سے نہیں　　پرتوِ رُخ سے ہوئے روشن کنول تالاب میں

بدن گورا گورا اور چہرہ ببھبوکا سا　　لگایا ہے گلِ لالہ خدا نے شاخِ شبّو میں

گل کو جب دیکھا وہ گل پیرہن یاد آگیا　　یاسمن کو دیکھ کر اس کا بدن یاد آگیا

ناسخ کے خلاف کہا جاتا ہے کہ وہ مجاز اور تمثیل کے استعمال میں بہت اونچا اڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنے ہی زور میں گر جاتے ہیں

ناسخ کا مطالعہ اگر صرف عیب جوئی کی غرض سے کیا جائے تو اس دعویٰ کی تائید میں خاصا مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن کسی فنکار کے مطالعہ میں اگر ہمدردانہ رویہ پیدا نہ ہو سکے تو اس قدر سختی بھی روا نہیں۔ کیوں نہ ان کامیاب نمونوں کو دیکھا جائے جو فی الحقیقت اُردو ادب میں نادر اضافے ہیں۔

اپنی مصیبت کی کیفیت کو پھولوں سے تشبیہ دی ہے اور پھر فصلِ گل میں ؎

گلوں کا اور میرا فصلِ گل میں ایک عالم ہے — پھنسے ہیں خار پاؤں میں گریباں پارا پارا ہے

دل شکستہ گلشنِ عالم میں ہوں میں رشکِ گل — صورتِ شاخِ شکستہ کیوں نہ پیلہ خشک ہو

چشم بے نور ہو گئی پُر نور — کیا وہ یوسف جمال آ پہنچا

یہ ضبطِ گریہ میں عالم ہے بیقراری کا — کہ برق کوندتی ہے بارشِ سحاب نہیں

ناسخ کا سارا دیوان تلمیحات، تمثیلات اور استعارات و تشبیہات سے بھرا پڑا ہے۔ اگرچہ رطب و یابس سے پاک نہیں مگر قابلِ توجہ ضرور ہے اور ماہرِ انتقادیات کی آرار کچھ زیادہ دلخراش ہیں۔ ناسخ کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے ؎

کہتے ہیں مارا گیا بے جرم تیغِ ناز سے
کوچۂ قاتل میں ناسخ نام جو بیچارہ تھا

○

ناسخ کے چند اشعار

جنوں نواز ہوا ہے مجھے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

○

پژمردہ ایک ہے، تو شگفتہ ہے دوسرا
باغِ جہاں میں فصلِ بہار و خزاں نہیں

○

دل میں خوش آئی ہیں صحرا کی ببولیں پُرخار
اب کسی سرو و گل اندام سے کچھ کام نہیں

○

گلبن ہوں اگر تو ہوں بے برگ
بلبل ہوں اگر تو بے نوا ہوں

سید یوسف حسن

مشرقی بنگال میں اُردو

(تحقیق کی روشنی میں)

اس طرف چند سال کے اندر بنگال اور مشرقی بنگال کے اردو ادب کے متعلق کئی کتابیں اور بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مستند کتاب اقبال عظیم صاحب کی "مشرقی بنگال میں اردو" تصور کی جاتی ہے۔ خود اقبال صاحب کو اس کے مستند ہونے کا دعویٰ ہے۔ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے قارئین کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشرقی بنگال میں اردو کس حد تک مستند ہے۔

اقبال صاحب اپنی کتاب "مشرقی بنگال میں اُردو" میں مرزا محمد عسکری عیش کے بیان میں لکھتے ہیں۔

"سخنِ شعرا، مصنفہ نساخ کے علاوہ تذکرۂ گلزارِ ابراہیم" اور "گلشنِ ہند" میں عیش کا بے حد مختصر ذکر موجود ہے۔ لیکن ان تمام تذکروں کا لبِ لباب کچھ نہیں حتیٰ کہ سنِ پیدائش اور سنِ وفات کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ چار شعر اور ملتے ہیں۔

وہ اگر آوے سرِ بام کہیں — میں بھی کر لوں اسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرۂ نصرہ مے ساقی — ایک بار ہی تو بھر کے جام کہیں
اس شبِ وصل کی سحر اے چرخ — بیجا مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش ہے تصدقِ سوز — مجھ سے ہوتی ہے انصرام کہیں"

مندرجہ بالا چار شعروں کے متعلق اقبال صاحب لکھتے ہیں

"یہ شعر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنی ریڈیائی تقریر میں نقل کئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے نقل کئے ہیں۔ یقیناً کسی دفعہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بھی یہ شعر حکیم صاحب ہی سے پائے ہوں گے۔" ڈاکٹر شادانی کے دئے ہوئے عیش کے مندرجہ بالا شعروں کے متعلق اقبال صاحب نے دلچسپ قیاس آرائی فرمائی ہے۔ ان کے لئے یہ مسئلہ بے حد پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ یہ چار شعر سخنِ شعرا کے علاوہ نہ تو تذکرۂ "گلزارِ ابراہیم" اور نہ "گلشنِ ہند" میں ملتے ہیں تو پھر ڈاکٹر شادانی نے کہاں سے نقل کئے۔ آخر میں وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یقیناً ڈاکٹر شادانی نے یہ شعر حکیم حبیب الرحمن سے پائے ہوں گے۔ حیرت اس پر ہے کہ اقبال صاحب نے "گلشنِ ہند" بھی حوالہ دیا ہے۔ اور "گلشنِ ہند" میں عیش کے یہ چاروں شعر نہایت نمایاں طور پر موجود ہیں۔ لیکن اقبال صاحب کی نظر سے نہیں گزرے اور وہ حیران ہیں۔ کہ ڈاکٹر شادانی کو یہ اشعار کہاں سے ملے۔ غالباً ہمارا یہ قیاس بے بنیاد نہیں۔ کہ اقبال صاحب نے "گلشنِ ہند" کا مطالعہ ہی نہیں فرمایا۔ محض حکیم صاحب کے نوٹ پر اکتفا کی۔

اقبالؔ صاحب سید شرف الدین شرفؔ حسینی کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

"سید محمود آزاد جب کبھی مرزا غالبؔ سے ملنے دلّی تشریف لے جاتے تو سید صاحب بھی
ان کے ساتھ جاتے تھے اس طرح انھوں نے دِلّی کی ادبی مجلسیں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھیں چنانچہ
سائلؔ دہلوی اور بیخودؔ دہلوی کو بہت قریب سے جانتے تھے......"

سید شرف الدین حسینیؔ کا سنِ پیدائش ۱۲۹۵ھ ہجری ہے۔ مرزا غالبؔ کا سنِ وفات ۱۲۸۵ھ ہے۔ تو گویا سید شرف الدین حسینی صاحب اپنی پیدائش سے تقریباً دس برس قبل سید محمود آزادؔ کے ساتھ مرزا غالبؔ سے ملنے دلّی جایا کرتے تھے۔ اقبالؔ صاحب کی یہ تحقیق فی الواقع بیسویں صدی کے عجائبات میں شمار کرنے کے لائق ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور مثال پیش کی جاتی ہے۔ اقبالؔ صاحب حافظ اکرام احمد ضیغمؔ کے بیان میں لکھتے ہیں :۔

"ضیغمؔ کے سنِ پیدائش کے متعلق کہیں ذکر نہیں ملتا لیکن شرفؔ صاحب (سید شرف الدین حسینی)
فرماتے ہیں کہ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۰ سے زیادہ تھی۔ ان کا انتقال ۱۲۸۶ھ میں ہوا ہے۔
شرفؔ صاحب کی شہادت اس معاملے میں اس لیے معتبر ہے کہ وہ نواب سید محمد آزاد ہی کے گھر
میں پلے بڑھے جبکہ اُن کے بچپن میں حافظ ضیغمؔ اتالیق کی حیثیت سے نواب صاحب کی ڈیوڑھی
سے وابستہ تھے۔ گھر کے اور بچوں کے ساتھ شرفؔ صاحب نے بھی حافظ صاحب سے تعلیم
حاصل کی ہے۔"

غور فرمائیے کہ حافظ اکرام احمد ضیغمؔ نے ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔ سید شرف الدین حسینی صاحب ۱۲۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ یعنی شرفؔ صاحب ضیغمؔ کے انتقال کے نو برس بعد پیدا ہوئے۔ مگر اقبالؔ صاحب لکھتے ہیں کہ شرفؔ صاحب نے بھی حافظ صاحب سے تعلیم حاصل کی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ سید شرفؔ صاحب نے پیدا ہونے سے برسوں پہلے حافظ ضیغمؔ کی شاگردی کس طرح اختیار کی۔

—— اقبالؔ صاحب نے مولوی عبدالرحمٰن کو "مولد صمدانی" (مطبوعہ مطبع غوثیہ کلکتہ ۱۸۹۴ء) کا مصنف بتایا ہے۔ (مشرقی بنگال ...دو صفحہ ۱۵۶) مگر مجھے حکیم حبیب الرحمٰن کے کتب خانہ میں "مولد صمدانی" کا ایک نسخہ ملا ہے جس کے مصنف مولوی عبدالاوّل ہیں اور جو مطبع ...کلکتہ سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ کتاب اقبالؔ صاحب کی نظر سے نہیں گذری اور انھوں نے بڑی فیاضی کے ساتھ مولوی عبدالاول کی متاع مولوی عبدالرحمٰن کی جھولی میں ڈال دی۔

—— اقبالؔ صاحب اپنی کتاب میں صفحہ ۱۳۱ پر مولانا عبیداللہ العبیدیؔ کی تصنیفات کے متعلق صرف اتنا لکھتے ہیں کہ صاحبِ دیوان تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ایک اور تصنیف "مفتاح الادب" بھی ہے جو تین حصوں میں ہے۔ حالانکہ "مفتاح الادب" اور "دیوان" کے علاوہ ...عبیدی کی مختلف موضوعات پر کئی تصنیفات ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہیں جن میں ان کی مشہور کتاب "علومِ مسلمانان" بھی ہے۔ ۱۸۷۵ء میں تصنیف ہوئی تھی۔ جبکہ مولانا عبیدیؔ گورنر جنرل کی کونسل میں مترجم تھے۔

اقبالؔ صاحب نے آغا احمد علی کی جن تصنیفات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے (صفحہ ۴۲) ان میں "مختصر الاشتقاق" کے سوا سب فارسی ...میں ہیں "مختصر الاشتقاق" کے متعلق خود تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ان کی نظر سے نہیں گذری ("مختصر الاشتقاق" حکیم حبیب الرحمٰن کے کتب خانہ

میں موجود ہے۔ اقبال صاحب کو اصولاً "مشرقی بنگال میں اردو" جیسی کتاب میں فارسی کی کتابوں کے متعلق لکھنے سے پرہیز کرنا چاہئے تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب میں اکثر جگہوں پر فارسی اور عربی کتابوں کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے وہ اُردو کی کتابیں ہیں۔ آغا احمد علی کی تصنیفات کے سلسلے میں انھیں اس بات کی وضاحت کرنی چاہئے تھی کہ مصنف کی کون سی کتاب فارسی میں ہے اور کون سی کتاب اُردو میں ہے۔ صرف اس طرح گول مول الفاظ میں لکھنے سے کام نہیں چلتا کہ "آغا کی بیشتر تصنیفات فارسی میں ہیں۔" اقبال صاحب نے اپنی کتاب میں آغا احمد علی کی مشہور کتاب "شمشیرِ تیز تر" کو "تیغ تیز تر" بتایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال صاحب نے آغا احمد علی کی تصنیفات کو پڑھا نہیں۔ بلکہ حکیم حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے نامکمل نوٹس میں دیئے ہوئے ناموں کو اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔

سب سے زیادہ دلچسپ مثال احمد حسین واقر کے ناٹک کی ہے۔ "مشرقی بنگال میں اُردو" میں صفحہ ۲۰۱ پر حکیم حبیب الرحمٰن کے مندرجہ ذیل اقتباس سے اس بات کا صاف اظہار ہوتا ہے کہ احمد حسین واقر نے جو ناٹک تصنیف کیا تھا اس کا نام انھوں نے "بہارِ بلبل" تجویز کیا تھا۔

"ڈھاکہ میں کیا ہندو، کیا مسلمان دونوں میں ناٹک دیکھنے اور ناٹک کھیلنے کا شوق ایک زمانے میں جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ ہر ایک محلّہ میں اس کا چرچا تھا۔ خود اردو شاعری اس کی پشت پناہی کرتی تھی۔ واقر مرحوم کی جوانی اُن کو اس طرف بھی لے گئی اور انھوں نے ایک اچھا ناٹک بہت کم زمانے میں لکھ کر اپنے محلے والوں کو دے دیا۔ چنانچہ "بہارِ بلبل" اس زمانہ میں بھی اسٹیج ہوا۔ اور اس کے بعد بھی کئی بار کھیلا گیا۔ بلکہ اب تک کبھی کبھی کھیلا جاتا ہے۔ دیباچہ میں کہتے ہیں کہ جہاں زبان کی خامی نظر آتی ہے وہ قصداً ضرورت ناٹک کی بنا پر کی گئی ہے۔ ورنہ مصنف اس خامی کو دور کرنے پر قادر رہے۔"

اقبال صاحب خود اپنی کتاب میں واقر کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"ماسٹر سید احمد حسین واقر جہانگیر نگری، باشندۂ ڈھاکہ تھے اور مدرسۂ محسنیہ ڈھاکہ میں معلّم تھے جب نساخ ڈھاکہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کے دم سے یہاں شعر و سخن کا بازار گرم تھا۔ واقر مرحوم بھی شریک بزم رہتے تھے۔ وہ بنگلہ۔ انگریزی۔ فارسی۔ اُردو۔ ہندی ہر زبان میں شعر کہتے تھے۔ اردو اور فارسی میں نساخ سے انھیں شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ عنفوانِ شباب میں خواجہ عبدالرحیم صبا کی پوتی سے اُن کی شادی ہوئی۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد دیوانگی کا دورہ شروع ہوا۔ آخر میں ڈھاکہ کے پاگل خانے میں داخل کر دیئے گئے وہیں معتبر شہادتوں کے مطابق ۱۹۴۰ء میں ان کا انتقال ہوا..... واقر مرحوم کو شعر و شاعری کے علاوہ ڈرامے لکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ چنانچہ "بہارِ بلبل" ان کا مشہور ڈرامہ ہے جو ڈھاکہ اور اس کے نواح میں قبولِ عام حاصل کر چکا ہے........ واقر مرحوم کا ذکر مصنف "تواریخ ڈھاکہ" مولوی رحمٰن علی طیش نے بھی کیا ہے۔ لیکن سنِ پیدائش و سنِ وفات ہر دو حضرات میں سے کسی نے نہیں دیا۔ حکیم صاحب نے یہ اشارہ ضرور کیا ہے کہ نساخ کے زمانے میں وہ کمسن تھے اور یہ بھی کہ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہوا۔ جب ان کی عمر زیادہ نہ تھی۔ ۱۸۶۷ء میں "بہارِ بلبل" شائع ہوئی اور یقیناً یہ بات ان کے جنون سے پہلے کی ہے....... یہ کتاب ۱۸۶۷ء میں مطبع محمدی، ڈھاکہ میں چھپی، اس کا حجم صرف ۸۰ صفحات ہے۔"

اگر ہم اقبال صاحب کی دی ہوئی تاریخ یعنی "بہارِ بلبل" کا سنِ اشاعت ۱۸۶۷ء تسلیم کر لیتے ہیں تو اس حساب سے واقر کے اس ڈرامہ کو بائیس برس کی عمر میں لکھنے پر ان کی پیدائش کا زمانہ تقریباً ۱۸۴۵ء ہونا چاہیئے۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ واقر نے ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔ اس حساب سے واقر نے تقریباً پچانوے برس کی عمر پائی۔ مگر اس طرح حکیم صاحب کا یہ بیان غلط ہو جاتا ہے کہ نساخ کے زمانے میں وہ کمسن تھے اور یہ بھی کہ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہوا جبکہ ان کی عمر زیادہ نہ تھی۔

دوسرا اہم سوال ناٹک کے نام کا ہے۔ حکیم حبیب الرحمٰن کے اوپر دیئے ہوئے اقتباس میں "بہارِ بلبل" کا نام آیا ہے اور اقبال صاحب نے تو متعدد بار "بہارِ بلبل" کے نام کو دہرایا ہے۔ مگر مجھے ڈھاکہ کے مختلف کتب خانوں کو کھنگال لینے کے بعد حکیم حبیب الرحمٰن کی کتابوں میں واقر کا صرف ایک ناٹک "بیمارِ بلبل" ملا ہے جس کا حجم ۴۲ صفحات ہے اور جو ۱۸۸۰ء میں تصنیف ہوا اور اسی سال مطبع محمدی ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ واقر اپنے ناٹک "بیمارِ بلبل" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"...... شیخ احمد حسین متخلص بہ واقر شاگرد جناب مولوی عبد الغفور صاحب بہادر متخلص بہ نساخ ارباب فن و اصحاب شعور کی خدمت میں عرض رسا ہے کہ فقیر اس ناٹک مسمی بہ "بیمار بلبل" کو لکھ کر استادی کا دم نہیں بھرتا نہ شاعری کا دعویٰ کرتا ہے۔ جو کچھ لکھا خاص فرمائش سے دوستوں کے کلام اس کا ہنروران سخن اور شاعرانِ نو دکھن کے نزدیک جیت نہیں بلکہ سست نظر آوے گا۔ کس واسطے کہ اردو زبان میں آج تک اس طرز کی کتاب چھپی نہیں ہے۔ دیگر جنہوں نے عام انگریزی دستگاہ حاصل کی ہے وہ بجو نسن اور شکسپیر وغیرہ کے ڈرامے بغور ملاحظہ کئے ہیں وہ البتہ اس کتاب سے حظ اٹھائیں گے کیونکہ یہ ہو بہو انگریزی طرز پر لکھی گئی ہے۔ صرف شناسوں کے نزدیک اس کے اکثر الفاظ غلط نظر آئیں گے۔ اس لئے وہ یہ نہ سمجھیں کہ خود مصنف اردو کی اصطلاح اور محاورے سے ناواقف اور ناآشنا ہے بلکہ سمجھیں کہ اکثر جگہ عبارت اس کی قصداً غلط لکھی گئی ہے۔ کیونکہ ناٹک اس کو کہتے ہیں کہ جس کی جو زبان ہو ہو بہو ویسا ہی کلام ہو۔ اس میں فصاحت و بلاغت کو ذرا بھی دخل نہیں۔ اس کتاب میں اکثر جگہ مذکر کو مؤنث اور مؤنث لوٹا کر لکھا گیا ہے ... "

واقر کے دیباچہ اور حکیم حبیب الرحمٰن کے بیان کو سامنے رکھ کر ملاتے ہیں تو اس بات کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ حکیم صاحب نے "بیمارِ بلبل" ہی کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور "۱۸۶۷ء" کے چھپے ہوئے "بہارِ بلبل" کا دراصل کوئی وجود ہی نہیں ہے[1]۔ میرا خیال ہے کہ اقبال صاحب نے حکیم صاحب کے مسودہ میں لفظ "بیمار" کو "بہار" پڑھا اور ۱۸۶۷ء کے ایکٹ کو ناٹک کا سنِ اشاعت تصور کر لیا۔ یہاں پر اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ اقبال صاحب نے نہ تو واقر کے ناٹک "بیمار بلبل" ہی کو پڑھا اور نہ رحمٰن علی طیش کی کتاب "تواریخ ڈھاکہ" کا مطالعہ کیا۔ بلکہ انہوں نے حکیم صاحب کے "مسودہ" پر ہی اکتفا کر کے واقر کے ناٹک پر اپنی رائے قائم کر لی جس کا اندازہ خود ان کے مندرجہ ذیل بیان سے ہوتا ہے۔ وہ اپنی کتاب میں "ثلاثہ غسالہ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

---

[1] حکیم حبیب الرحمٰن نے اپنی کتاب "ڈھاکہ پچاس برس پہلے" میں واقر کے ناٹک "بیمار بلبل" ہی کا ذکر کیا ہے۔

"اس کتاب (مشرقی بنگال میں اُردو) کا حصہ افسانہ و ڈش جسے موضوع کا عطر بھی سمجھنا چاہیئے اسی تاریخی دستاویز کا نچوڑ ہے۔"

احمد حسین واقرؔ نے اپنے ناٹک "بیمار بلبل" کو جسے انہوں نے "اُپیرا" OPERA بھی کہا ہے ۱۴ مارچ ۱۸۸۰ء میں جان نثار نے کے نام انتساب کیا اور ۱۸۸۰ء ہی میں ڈھاکہ کے مطبع محمدی سے شائع کرایا۔ اس ناٹک میں مصنف نے ڈرامائی انداز میں ایک سولہ سال کی لڑکی ماہ لقا معروف بہ بیمار بلبل کے کردار کو پیش کیا ہے۔ بیمار بلبل ناٹک کی ہیروئن ہے اور اسی کے پہ ناٹک کا نام رکھا گیا ہے۔ یہ کوئی چمن میں بلبل کے نغموں کی بہار والی بات نہیں۔ کتاب کے آخر میں "بیمار بلبل" کے سن تصنیف کی بھی لکھی گئی ہے۔ سید محمود حسین سیفؔ لکھتے ہیں:۔

مرتب ہوا ناٹک بے مثال	لکھا جس کو استاد نے غور سے
کئی شاعروں نے بہت داستاں	بھلا دیکھوں ایسا تو کوئی لکھے
مجھے فکر تاریخ ہجری کی تھی	بیا ناب یہ آئی ندا غیب سے
کہو سیفؔ تم دل سے اک آہ بھر	مضامین بیمار بلبل چھپے ۱۳۲۰ھ

احمد حسین واقرؔ خود لکھتے ہیں:۔

ہو مشتہرہ بر اں صفحہ	لکھا ہے میں نے اک ناٹک بے نظیر ۱۸۸۰ء
کہ جس سے جوانوں کو ہووے مزا	اور بڈھوں کو عبرت ہووے انتہا

اقبالؔ صاحب حاجی عبداللہ آشفتہؔ اور خواجہ عبدالغفار اخترؔ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"یہ کہ آشفتہؔ نساخؔ کے ہم عصر تھے ثابت ہے، لیکن ان کا سنِ پیدائش، سنِ انتقال یا مجموعہ کلام کسی طرح نہ مل سکا۔"

"اخترؔ کا سنِ پیدائش اور سنِ وفات کسی نے نہیں لکھا۔ بہرحال یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ نساخؔ اور حیدر شائقؔ کے ہم عصر تھے اور عمر میں شائقؔ سے بڑے تھے۔"

اقبالؔ صاحب کو مشرقی بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ لکھنے سے قبل نساخؔ کی تصنیفات کا مطالعہ کر لینا چاہیئے تھا کی ایک اہم تصنیف "ارمغان" میں حاجی عبداللہ آشفتہؔ اور خواجہ عبدالغفار اخترؔ کی وفات کی تاریخیں موجود ہیں۔ آشفتہؔ نے ۱۲۹۰ھ میں انتقال کیا اور اخترؔ نے ۱۲۹۶ھ میں۔

اخبارات اور رسائل کے سلسلے میں اقبالؔ صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"مشرقی بنگال کی پچھلی تاریخ کے اوراق میں خالدؔ بنگالی کے ماہنامہ "اختر" حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کے ماہنامہ "مشرق" اور ماہنامہ "جادو" کے علاوہ کوئی دوسرا اخبار یا رسالہ نہیں ملتا جن میں سے پہلے دو رسالوں کا صرف ایک ایک شمارہ نکل سکا۔"

ماہنامہ "مشرق" حکیم حبیب الرحمٰن کے زیرِ ادارت ایک زمانے تک نکلتا رہا

...ب کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ "مرشد آباد" "مشرقی بنگال میں اُردو" میں غلط نام، غلط تاریخ اور غلط بیانی کی بے شمار مثالیں ملیں گی ... میں تفصیل سے لکھوں گا۔

...تاب کے بیشتر صفحات غیر بنگالی ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہیں۔ ان میں بعض تو مشرقی بنگال کے کسی حصہ میں محض چند روز ...ستان یا مغربی پاکستان واپس چلے گئے۔ اقبال صاحب کو خود بھی اس کا اعتراف ہے۔

"معترف ہوں کہ اس کتاب کے بیشتر صفحات دورِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہیں جبکہ
دورِ رفتہ کی تفصیل نسبتاً کم ہے۔"

...ادیبوں اور شاعروں کے حصہ میں بھی مولانا محمد شاہ ... رامپوری اور مولانا ... جونپوری وغیرہ جیسے غیر بنگالی ادیبوں کو ... نظروں میں اقبال صاحب کی دیانت داری اور خلوصِ نیت پر شک ہو جاتا ہے۔ اقبال صاحب اپنی کتاب کے دیباچہ

"یہ تذکرہ جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اس بات کا مدعی تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسے
اپنے محاسن کے اعتبار سے اسے ان تمام تذکروں پر فوقیت حاصل ہے۔ البتہ جہاں تک خلوصِ نیت
کا سوال ہے اسے دعویٰ کا حق ضرور پہنچتا ہے کہ وہ کسی سے پیچھے بھی نہیں۔"

...صاحب کو تذکرہ نویسوں کی دانستہ تنگ نظری، مقامی تعصب، جانب داری اور لاعلمی سے شکایت ہے۔ مگر وہ خود بھی آگے ... لکھتے ہیں:-

"تذکرہ امروز میں ایسے حضرات کے تذکرے سے دانستہ ضرور گریز کیا گیا ہے جو ہنوز پاکستانی نہیں
ہیں ..."

...ہے کہ "مشرقی بنگال میں اردو" جیسے موضوع پر لکھی ہوئی کتاب میں مشرقی بنگال کے اردو ادیبوں اور شاعروں کی ایک ... اس بنا پر جگہ نہ پا سکی کہ وہ مصنف کی نظر میں پاکستانی نہیں تھی۔ اگر اردو ادیب بننے کے لئے اقبال صاحب کی کسوٹی یہ ...ی شرط لازمی ہے تو فطری طور پر ایک سوال اٹھتا ہے کہ پاکستان سے باہر نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، فراق ... بیدی، کرشن چندر، احتشام حسین، عصمت چغتائی، جذبی، ساحر، مخدوم، جعفری وغیرہ جیسے [illegible] ...ل صاحب کی نظر میں کون سی زبان کے ادیب و شاعر ہیں؟

...یخ میں [illegible] نے اپنے تذکرہ ... ہے تو تذکرہ [illegible] کیا ہے۔ دوسرے ... اپنی تصنیف کی [illegible] اپنے وقار کو ...

...بیدار ہیں
... یہ ہے وہ چالیس چور
اور میرے شہر کے کوچے نہیں
جانے کس بغداد کے بازار ہیں

ساقی فاروقی

میں اور میں

میں ہوں میں
وہ جس کی آنکھوں میں جیتے جاگتے درد ہیں
درد کہ جن کی ہمراہی میں دل روشن ہے
دل جس سے میں نے اِک دن اِک عہد کیا تھا
عہد کہ دونوں ایک ہی آگ میں جلتے رہیں گے
آگ کہ جس میں جل کر جسم ہوا خاکستر
جسم کہ جس کے کچّے زخم بہت دُکھتے تھے
زخم کہ جن کا مرہم وقت کے پاس نہیں ہے
وقت کہ جس کی زد میں سارے سیّارے ہیں
سیّارے جو قائم ہیں اپنی ہی کشش پر
اور کشش کے تانے بانے ٹوٹ چلے ہیں!!
"کون تماشائی ہے؟" "میں ہوں!" "اور تماشا؟"
"میں ہوں میں!"

قمر جمیل

بغداد کے بازار

بستیوں سے جنگلوں کے راستے
اس طرح ملتے ہیں جیسے ہم نفس
رات کی تاریکیوں میں دور سے
لے کے آئے ہوں قیامت کی ہوس
اور یہ کہ آسمانوں پر چلے
چاند اپنی کجکلاہی کا قفس

یہ زمیں ، یہ آسماں کی سرد آنچ
یہ ہوا، یہ رات، یہ جنگل کا ناچ
یہ طلسمی لوگ پتھرائے ہوئے
سو رہے ہیں اپنے ارمانوں کے ساتھ

ناچتے ہیں بستیوں میں، شہر میں
جنگلوں میں کچھ تمناؤں کے مور
یوں طلسمِ آب وگل کی لہریں
گم ہوا جاتا ہے پھر سم سم کا شور
جیسے اب بھی غار میں بیدار ہیں
ہاں علی بابا کے وہ چالیس چور
اور میرے شہر کے کوچے نہیں
جانے کس بغداد کے بازار ہیں

جون ایلیا

اجنبی

گم ہے تنہائیوں میں پہنائی
اُف یہ تنہائیوں کی تنہائی
دُھند سی چھا رہی ہے جھیلوں پر
اُڑ رہے ہیں پرند ٹیلوں پر
سب کا رخ ہے نشیمنوں کی طرف
وادیوں اور گلشنوں کی طرف
اپنے گلّوں کو لے کے چرواہے
سرحدی بستیوں میں جا پہنچے
دلِ ناکام! میں کہاں جاؤں؟
اجنبی شام! میں کہاں جاؤں؟

اسلم انصاری

خوشبو کا سفر

ساغرِ رنگ سے چھنتی ہوئی خوشبو کی کرن
شاخِ لرزاں کے سیفنے سے اُتر آئی ہے
شب کے گل پوش دریچوں سے گذر آئی ہے

کتنی یخ بستہ بہاروں کا لہو ہے اس میں
کتنے بے نام شگوفوں کے سسکتے ارماں
اس کی پامال اداسی میں سمٹ آئے ہیں

کتنے ایوانوں میں محصور رہے اس کے قدم
کتنی زنجیروں کے دہکے ہوئے بازو لپکے
زندگی اپنے گناہوں کی سزا ہو جیسے
تجربہ لذّتِ ہستی کا خطا ہو جیسے

ہر قدم زخمِ کفِ پا کا اضافہ گویا
اور مسافت ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے

ضیا رومانی

انتظار

ہزار بار تو مجھ سے ملی ہے جانِ بہار!
زفرق تا بقدم بار بار دیکھا ہے
یہ گیسوؤں کے اندھیرے یہ عارضوں کی شفق
یہ ہنستی جاگتی باہیں یہ کھلتے ناچتے لب
ہزار بار یہ ترشا ہوا گداز بدن!
پگھل پگھل کے مرے بازوؤں میں چھلکا ہے

کسے بلندیٔ قسمت میں کوئی شک ہے مگر
جو جاں پہ بیت رہی ہے کہی نہیں جاتی
کہ تجھ سے مل کے بھی مجھ کو تری تلاش رہی
ترا وصال برنگِ فراق اترا ہے
یہ بد نصیبیٔ قلب و نگاہ کیا کہیئے
چڑھا ہے چاند مگر تیرگی نہیں جاتی

اک عمر سے تو مرے ساتھ ساتھ ہے لیکن
اک عمر سے میں ترا انتظار کرتا ہوں
کبھی تو آ مری تخئیل کے حسیں پیکر
کبھی تو مل مرے حسنِ خیال کی تصویر
نہ جانے کب سے ترا انتظار ہے مجھ کو
نہ جانے کب سے تری دید کو ترستا ہوں

احسن احمد اشک

جال

کان بجتے ہیں مرے رات کے سناٹے میں
آشنا قہقہے، سرگوشیاں، جلتی سانسیں
گونجنے لگتی ہیں ماضی کی کئی آوازیں
موند لیتا ہوں میں آنکھوں کو تو تاریکی میں
آپ ہی آپ یہ آئینے چمک اُٹھتے ہیں
جانے پہچانے سے کچھ چہرے جھلک اٹھتے ہیں
سانس لیتا ہوں تو احساس کے ویرانے میں
چاند اُبھر آتا ہے کچھ کہہ کر سرک جاتی ہے
ادھ کھلی کلیوں کی اک شاخ لچک جاتی ہے
زندگی وقت کی شاخوں میں اُلجھی ہی رہی
ریشمی یادوں کا دامن نہ کبھی چھوٹ سکا
ماضی و حال کا رشتہ نہ کبھی ٹوٹ سکا

راجہ مہدی علی خاں

پنجاب کے دیہات میں اُردو

دو بھائی

میں ماراں گا۔ منع کر اس کو بے بے — جبا لا مجھ پہ تھوکیں سُوٹتا ہے

مہمان نوازی

بہت سے روغنی ہیں نان اور شوربہ ہے ککڑ کا — اٹھے اُلّو دے پٹھے ما حضر آ کر تناول کر

غم زدہ حسینہ

کیوں بُجھاتے ہو دیا اُلفت کا پھوکاں مار کے — چاہتا ہے جی مرا۔ روؤں میں کوکاں مار کے

ڈنگوری اور بے بے

ڈنگوری نے کے پیٹ اِس کو ابّا — مری بے بے نے چوچا مار سٹیا

چچی اور بھتیجی

لگا ہے میز پر کھانا۔ تکلّف مت کر آ چاچی — مرا کہنا نہیں منتی تو جا کھسماں نوں کھا چاچی

اللہ رکھا اور چارپائی

منجی دا پاوا ابیتھوں۔ ٹُٹیا نہیں ہے اتّی — کل اس پہ اللہ رکھا۔ تشریف رکھ گیا تھا

عذرِ گناہ بدتر از گناہ

سَوں رب دی مام دین میں کل رات باغ میں — ملتی ضرور۔ پر مجھے چیتا نہیں رہا

محاورہ اور روزمرّہ

تیری گلی کے کتّے ٹانگوں پہ واڑتے ہیں
اُوپر سے تو بھی مجھ کو گالی نکالتی ہے!

ضرورتِ چشمہ

اے جی چشمہ اب تو لا دیجئے مجھے
سوئی میں دھاگا بھی اب پِتیا نہیں

دیہاتی عشق

کہاں جاتی ہے رانی خاں کی سالی؛
تیری پسلی کمر پر ڈانگ ماروں!

ڈاکو کی محبت

اللہ میں قربان جاؤں اپنے ڈاکو یار کے
جس نے ڈولی میں بٹھایا مجھ کو ٹھڈے مار کے

اے بسا آرزو کہ...

وہ آئے تھے گھر میں سویرے سویرے،
رہے مجھ سے لیکن پرے سے پرے سے

بندے دا پتّر

کتنے دا پتّر کہا کرتے ہو کیوں ابا مجھے
ماں تو کہندی تھی، نہیں کتّے دا پتّر توں نہیں

دلدار اور کتّا

وہ کمبل اوڑھ کے دالان میں دلدار سُتا ہے
گھرائے یار دا تھا میں تو اِبہ سمجھی کہ کُتا ہے

مُنہ زور بھینس

بھاگی ہے میری بھینس تڑا کے کِلّا
لاحول ولا قوۃ الّا بلّا!

عشق اور جنون

جنونِ عشق میں اپنا گریباں پھاڑ دیتا ہوں
وہ ظالم مسکرا کر وہ تڑپے مار جاتی ہے

دعوت نامہ

اکیلی گر نہیں آتی مِرے بلانے پر
کھسم کے ساتھ چلی آ غریب خانے پر

یونس جاوید

رات کی اونچی فصیل

مسسز سنہا نے میری بات سن کر عینک اتاری اور میز پر رکھ کر یوں میری جانب دیکھنے لگیں جیسے تسلی آمیز الفاظ کا انتخاب کر رہی ہوں مگر انہوں نے کچھ بھی نہ کہا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد مجھے کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ضرور کیا۔ لیکن میں چپ چاپ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔

انہوں نے دوبارہ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم لوگ کتنی جلدی گھبرا جاتے ہو۔ ایسے موقعوں پر گھبرانے کی بجائے سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیئے .. اس وقت اپنی گھبراہٹ مجھ پر مسلط کر دو گے۔ تو میں کچھ نہ کر سکوں گی۔ بس ایک منٹ بیٹھ جاؤ ـــــــ بیٹھو نا !"

میں بیٹھ گیا تو وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور ایک کراہتے ہوئے مریض کا معائنہ کرنے لگیں اچھی طرح دیکھ بھال کر انہوں نے اس مریض کو انجکشن دیا۔ اور دوسرے مریضوں سے آدھ گھنٹے کی اجازت لے کر اور معذرت کر کے وہ بہت جلد میرے پاس آگئیں اور مسکرا کر کہا ـــــــ "آؤ ـــــــ چلو"

باہر نکلتے وقت انہوں نے ایک لحظہ رک کر ڈسپنسری سے ادویات کی کچھ چھوٹی چھوٹی شیشیاں لیں اور اپنے بیگ میں رکھ لیں۔

دروازے سے باہر اپنی پرانی "آسٹن" کا دروازہ بھی انہوں نے اپنے ہاتھ سے کھولا۔ بیگ اندر رکھا اور پھر مجھے بٹھا کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

ہیڈن روڈ کا موڑ کاٹ کر انہوں نے پوچھا "رضیہ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"اس وقت تو ٹھیک نہیں تھی" میں نے نوڑا کہا۔ میرا دل اس وقت بیٹھا جا رہا تھا۔ اور بات پوری طرح ادا نہیں ہو رہی تھی۔ میری نظریں تو سپیڈ میٹر کی سوئی دیکھ رہی تھیں جو تیزی سے اوپر نکل کر لوٹی تھی اور اب بیس پہ آکر تھم سی گئی تھی۔ میرا اضطراب ابھی تک کم نہ ہوا تھا میرے دو تین بار گھڑی دیکھنے کے بعد ایک بار مسسز سنہا نے مجھے پریشان پریشان نظروں سے گھورا اور پھر رفتار پہلے سے کچھ تیز کر دی یوں بھی اب ہم کشادہ اور کھلی سڑک پہ آگئے تھے۔

"صبح تم نے کیا کھایا تھا" مسسز نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

میرا ذہن فوراً صبح کے ناشتے کی طرف مڑ گیا۔ مگر فوراً پلٹ آیا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے ذہن کو معروف رکھ کر میری پریشانی کا علاج کر رہی ہیں۔ یہ تو ان کی عادت تھی کہ مریض کو پریشان دیکھتیں تو ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں پوچھتیں جن کے متعلق خود کبھی انہوں نے نہ سوچا ہوگا۔

"میں نے پوچھا تھا . . . . . ." "میں نے کیا پوچھا تھا بھلا؟" وہ بڑبڑائیں میں جھنجھلا سا گیا۔ مجھے ان کا احترام لازم نہ ہوتا۔ تو یقیناً ان سے اُلجھ پڑتا۔ بچپن سے آج تک وہ میری ڈاکٹر رہی تھیں۔ بارہا میں بیمار ہوا۔ اور بارہا انہوں نے . . . . . . ان کی باتوں نے مجھے بیماری سے نجات دلائی۔ مگر آج تو ـــــــ اب تو اُن کی باتیں مجھے زہر لگ رہی تھیں شاید اس لئے کہ میں بیمار نہ تھا ـــــــ میرا بچہ بیمار تھا۔

جب پرانی آسٹن چھوٹے سے کوٹھی نما مکان کے سامنے بڑ کے تناور درخت کے نیچے رک گئی۔ تو میں نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول کر اپنے آپ کو باہر گرا دیا۔

مسسز سنہا مجھ سے پہلے کار سے اتر چکی تھیں۔ اور میرے دروازے تک پہنچنے تک ، برآمدہ طے کر کے اندر داخل ہو رہی تھیں۔

اور رضیہ چپ چاپ آنسو بہانے میں مشغول تھی۔ امجد چھوٹے سے پلنگ پر چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ اور سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔ بچے کی موت رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اور میں نے ملتجی نظروں سے مسز سنہا کی طرف دیکھ کر صرف اتنا کہا۔ "مسز؟" مسز نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اپنا کان بچے کی ناک کے قریب لے کر سانس کی آواز سننے لگیں پھر چھاتی ٹٹولتے اور نبض دیکھتے ہوئے ان کے لبوں سے ایک لفظ ٹپکا۔ "نمونیہ" سٹیتھسکوپ انہوں نے کانوں سے نکال کر کرسی پر رکھ دیا اور پھر بیگ سے سرنج نکال کر دوا بھرنے لگیں انجکشن تیار کر لینے کے بعد انہوں نے ننھے منے اور گورے گورے بازو میں لگا دیا۔ اور چھوٹے سے پلنگ کی پائنتی پر ہی بیٹھ گئیں۔

دو ایک منٹ کے بعد بچے نے بازوؤں کو اوپر نیچے حرکت دی۔ رضیہ چونک کر چپ ہو گئی۔ میری آنکھوں میں دوبارہ روشنی ہو گئی اور مسز بچے کو جھک کر غور سے دیکھنے لگی۔

بہت
مجھے یقین آ رہا تھا کہ بچے کی زندگی واپس آ رہی ہے۔ مگر یہ یقین اتنا دیر رہنے کا کھوکھلا ثابت ہوا بچے کا بازوؤں کو حرکت دینا غالباً موت کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تھی جو تیز تر ہوتی گئی بالآخر بچے کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ پتھرا گئیں اور منہ کھل گیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اس موت پر بھی ڈرامے کا شبہ ہو رہا تھا۔ پھر چند لمحوں کے اندر جب میرے منتشر حواس پلٹ آئے تو میرا دل غوں ہو گیا۔

میں چیخنا چاہتا تھا۔ مگر آواز حلق میں نہیں تھی رضیہ دہشت زدہ ہو کر اندر بھاگ گئی تھی۔ اور مسز سنہا بچے کی لاش کو جھک کر گھور رہی تھی جیسے ابھی بچے کی موت کے بارے میں کوئی شک ہو۔

اور جب وہ پائنتی سے کپڑا اٹھا کر لاش کو اوڑھا رہی تھیں تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ مسز سنہا ڈاکٹر تھیں۔ . . . . مسز سنہا رو رہی تھیں۔

میں انہیں اپنی پتھریلی آنکھوں سے تکتا رہا۔ گھورتا رہا۔ حتیٰ کہ میرے دونوں ملازم یکے بعد دیگرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور روتے ہوئے باہر چلے گئے میں نے ان کی طرف بھی پلک اٹھا کر دیکھا۔ شاید اس لئے کہ مسز سنہا کے آنسو بہانے اور ملازموں کے رونے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ملازم تو اپنے آقا کے دکھ پر رویا ہی کرتا ہے۔ دکھ محسوس کرے نہیں۔ آقا کو خوش کرنے کے لئے مگر مسز سنہا تو ڈاکٹر تھیں۔ میری ملازمہ تو نہیں تھیں۔ وہ روئے جا رہی تھیں اور میری آنکھیں نم بھی نہ ہوئی تھیں۔ مسز سنہا کس کو خوش کرنے کے لئے رو رہی تھیں۔ شاید وہ اپنی خوشی کے لئے رو رہی تھیں۔ وہ میرے پہلے بچے کی موت پر بھی جی بھر کر روئی تھیں۔ مجھ سے زیادہ اس دن سے ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ دکھ برداشت نہیں کر سکتیں شرط یہ ہے کہ دکھ دوسروں کا ہو۔

میرا ذہن کتنی ہی دیر گم سم اور سویا سویا سا رہا جب میرے حواس کسی قدر بجا ہوئے۔ تو میرا جی بھرا بھرا محسوس ہونے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مسز مجھے روتا دیکھ کر یکایک چپ ہو گئیں۔ اور نڈھال ہوتی ہوئی رضیہ کو سنبھالا دیکر کرسی پر بٹھا دیا۔ اور خود اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کھڑی ہو گئیں۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔

میں نے اپنی گیلی گیلی پلکوں کو اٹھا کر ان کی طرف غور سے دیکھا ان کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ایک بار رضیہ کو شانے پر تھپکی دی اور کہا۔ بس بس۔ زیادہ رونے سے بچہ واپس تو نہیں آئے گا۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ مگر تم اتنا غم کیوں کرتی ہو۔ ابھی تو تمہارے ہاں بہت ـــــ بہت بچے ہوں گے۔ عمر کیا ہے ابھی تمہاری۔ خود بچہ ہو۔ مگر اب بچہ نہ بنو نا ـــــ بس اب چپ ہو جاؤ اب رونا نہیں بالکل نہیں رونا ـــــ!

پھر وہ سسکیاں بھر بھر کر روتی ہوئی رضیہ کو چھوڑ کر میرے پاس آ گئیں۔ اور مجھے رضیہ سے کچھ دور لے جا کر کہا ـــــ "میں اس بات کی معذرت

ضرور کرتی ۔ کہ میرے دیر سے پہنچنے کی وجہ سے بچہ مر گیا ۔ میں نے دیر ضرور کی تھی اور جس مریض کے لئے کی تھی ۔ وہ بے پناہ کرب میں مبتلا تھا ۔ اس کی چیخیں تو تم نے اپنے کانوں سے سنی ہیں ۔ اس حالت میں ، میں اُسے چھوڑ کر کیسے آسکتی تھی گو میرے وقتی علاج سے اس کی جان بچ سکے گی نہ مرض ہی ختم ہوگا ۔ تاہم اس کا کرب اس کی تکلیف ——— تو کچھ دیر کے لئے ختم ہو گئی تھی ۔ یہی میری کوشش بھی تھی ——— وہ زندہ رہا ہے تو اپنی تقدیر سے ۔ میں اس کا علاج نہ بھی کرتی ——— تو وہ زندہ رہتا ۔

اسی طرح میں یہاں جو دیر سے پہنچی ہوں تو بچے کی موت کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے ——— میں اس کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری بھی کرتی تو بھی بچہ مر جاتا اس کی زندگی ہی اتنی تھی ۔ تو . . . . وہ رک گئیں ۔ اتنا کچھ وہ ایک سانس لے کر کہہ گئی تھی ۔ رُک کر انہوں نے دو تین لمبے لمبے سانس لئے جیسے ہانپ رہی ہوں ۔ پھر تھوک نگل کر کھانسا اور کھنکارتے ہوئے بولیں ۔ " تم بھی تو کچھ بولو نا ——— چپ کیوں ہو بولو ۔ ایسے کام نہیں چلے گا ——— ایسے کام نہیں چل سکتا " ان کی آنکھوں میں دکھ اور درد مندی کے احساس سے چمک سی آگئی تھی ۔ انہوں نے ہونٹ سمیٹ کر ایک منٹ تک چھت کو گھورا ——— اور پھر شفقت سے اپنا ٹھنڈا اور بھاری ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مسکرانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں ۔

" تم نے تو ابھی زندگی کی اونچ نیچ دیکھی ہی نہیں مسٹر ۔ یہ تو ابتدا ہے ہمت ابھی سے ہار بیٹھے تو ان مشکلات کا مقابلہ کس طرح کرو گے جو مرتے دم تک تمہیں پیش آئیں گی بچپن سے لے کر تم نے شادی تک بڑی خوشگوار زندگی گذاری ہے ۔ میں تم سے بھی زیادہ جانتی ہوں ۔ اور اب تک تم نے دو بچوں کی موت دیکھی ہے صرف ۔ اور دماغی توازن کھو دینا چاہتے ہو ——— میں جانتی ہوں ——— لختِ جگر کا غم ——— بہت بڑا غم ہے لیکن تم تو مرد ہو ——— " میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے انہوں نے رک کر میرا جواب سننے کی آرزو کی ۔ جب میں بدستور پتھر بنا رہا ۔ تو انہوں نے ہاتھ سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور اسی لہجے میں بولیں ۔ " دیکھو میں عورت ہوں ——— مجھے ہر روز لوگوں کو مرتے دیکھنا پڑتا ہے ۔ میں انہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی ۔ یہ دیکھتی ہوں نہیں دیکھنا چاہتی ۔ مگر مجھے دیکھنا پڑتا ہے تم سمجھتے ہو گے ۔ کہ دوسروں کی موت پر کسی کو دکھ ہوتا ہے ؟ کیوں نہیں ——— ہسپتال کا کوئی مریض مرتا ہے تو میں سمجھتی ہوں میرا اپنا بچہ مرا ہے ۔ کیا ہوا ۔ اگر میں نے شادی نہیں کی تو ۔ تم لوگ میرے بچے ہی ہو ——— خدا پر بھروسہ رکھو ——— خدا کو یاد کرو ۔ وہ اپنے بندے کو امتحان میں ڈال کر اسی قدر تکلیف دیتا ہے جتنی اس کی برداشت میں ہو ——— "

" کس خدا کی بات کر رہی ہیں آپ " میں نے جھنجھلا کر کہا ۔

" ہش ——— " انہوں نے مجھے بات بڑھانے ہی نہ دی ۔ " یہ تم کیا کہہ رہے ہو ۔ خدا کے متعلق ایسے الفاظ ——— زبان روکو ——— تمہارا بچہ مرا ہے ضمیر تو نہیں مرا ۔ اتنے جذباتی کیوں بن رہے ہو ——— " انہوں نے زبان کی نوک اگلے دانتوں میں ایک سکینڈ تک دبائے رکھی اور پھر چھوڑ دی ۔ اس کے بعد وہ یوں خاموش ہو گئیں ۔ جیسے گہری سوچ میں غرق ہوں چہرہ دونوں ہاتھوں سے اٹھائے زمین پر نظریں گاڑے وہ جتنی دیر بھی بیٹھی رہیں ان کے چہرے پر ——— تقدس اور معصومیت کا نور پھیلا رہا شاید وہ خدا کے وجود اور اس کی اہمیت پر غور کر رہی تھیں کیونکہ خدا سے متعلق میں نے جو رسمی سے الفاظ استعمال کئے تھے یوں لگتا تھا جیسے سسٹر نے انہیں شدت سے محسوس کیا ہے ۔

اسی شدت سے کہ شاید وہ اب ہمدردی کا ایک لفظ بھی مجھ سے کہنا پسند نہ کریں گی اور واقعی وہ اپنے چہرے کی ساری معصومیت اور تقدس لئے اٹھیں اور چپ چاپ دروازے سے نکل گئیں ۔ دو گھنٹے بعد جب میرا ذہنی توازن بحال ہوا تو مجھے اس خیال سے بڑی ندامت ہوئی کہ سسٹر ناراض ہو کر چلی گئی ہیں ۔ شاید میں اس وقت ان کے پیچھے انہیں مناتے چلا جاتا ۔ مگر بچے کے کفن دفن کا انتظام کرنا تھا ۔ باہر کیونکر جا سکتا تھا !

دوسرے دن میں گھر پر ہی تھا اور سوچ رہا تھا کہ سسٹر کے ہاں کب اور کیسے جایا جائے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور اس کے فوراً بعد سسٹر

اندر آ گئیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ اندر آ کر پہلے مجھے خدا پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دیں گی پھر ڈانٹ پلائیں گی اور بعد میں مجھے پیار سے گلے لگا لیں گی۔ مگر وہ اندر آ کر چھوٹتے ہی بولیں۔ "تم یقیناً آج نہیں نہائے ——— بھئی آج تو تمہیں گرم پانی سے نہانا چاہیئے تھا ——— اور نہیں نہائے نا ؟"

میں نے جواب دینے کی بجائے خاموشی سے ان کی طرف دیکھا شاید وہ کل والی بات بھول چکی تھیں۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ میرے سامنے پڑی ہوئی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔ اور کہا ——— "جو بات پوچھی جائے اس کا فوراً جواب دینا چاہیئے جانتے نہیں میں تمہاری بہن ہوں اور پندرہ برس سے تمہاری ڈاکٹر ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور بولیں۔ "ارے رضیہ کدھر ہے ؟ طبیعت تو اچھی ہے اس کی ؟ بلاؤ اسے ذرا ——— کہاں ہے وہ میں اسے ذرا دیکھنا چاہتی ہوں اور ہاں سنو ——— وہ کرسی گھسیٹ کے قریب لے آئیں "دیکھو ——— انہوں نے اپنا منہ میرے کان کے قریب کر کے کہا۔ "رضیہ کو جس قدر جلد ہو سکے کسی دوسری جگہ بھجوا دو۔ طبیعت بہل جائیگی۔ اس کی۔ آخر وہ ماں ہے ——— بچے کا غم اسے زیادہ ہوگا۔" میں نے بے جان اور بے زار نظروں سے انہیں دیکھا۔ شاید میری چپ سے انہیں وحشت ہونے لگی تھی بولیں "تم کیسے مرد ہو کہ خواہ مخواہ خاموش رہ کر اپنے غم کا پرچار کر رہے ہو۔ تمہاری ہمت ، قوت اور مردانہ صفات کہاں چلی گئیں آخر ——— ؟ مرد تو سارے دکھوں غموں سے ٹکراتا اور خطرات سے کھیلتا آیا ہے اس نے تو زندگی کی روح ہی ایسی چیزوں میں دیکھی ہے ——— تم ایک بچے کی موت نہیں سہار سکے ——— اُف ——— نہاؤ اور میرے ساتھ چلو ——— تم دونوں ایک ہفتہ تک میرے مہمان ہو۔ سمجھے ؟"

میں ساکت بیٹھا رہا۔ تو انہوں نے زور زور سے میرا کندھا جھنجوڑا بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کنپٹیوں کو سہلایا مگر میرے جسم کی حرارت تو جیسے برف میں دب گئی ہو۔ صرف کان تھے جن میں مسسز سنہا کی آواز گونج رہی تھی اور ذہن انہیں کسی حد تک قبول بھی کر رہا تھا۔

میں نے نظریں ان کی آنکھوں میں ڈبو دیں مسسز کی آنکھوں میں خلوص تھا۔ گہری یگانگت تھی۔ محبت اور دردمندی تھی۔ التجا اور اپنائیت غرض سبھی کچھ تھا جو ایک زخمی انسان کے لئے مرہم ثابت ہو سکتا ہے۔

میرے کندھے کو بار بار تھپتھپا کر انہوں نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ اور پھر یکایک جیسے انہیں رضیہ کا خیال آ گیا ہو۔ وہ اٹھیں اور اپنے مخصوص چال چلتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

جب میں اکیلا رہ گیا تو مجھے واقعی ان کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ اور پھر اس احساس نے کچھ اس قدر شدت اختیار کی کہ مجھے اپنی خاموشی پر ندامت اور افسوس ہونے لگا۔ وہ میری بچپن کی ڈاکٹر تھیں۔ مجھے ان کا کچھ تو احترام کرنا چاہیئے تھا انہوں نے اپنی اولاد کی طرح میرا اور میرے بچوں کا مفت علاج کیا تھا۔ اور اپنے بے پناہ پیار کی وجہ سے وہ میرے گھر کا فرد بن کر رہ گئی تھیں۔ اس پیار میں بہن کا پیار تھا ماں کی شفقت تھی۔ باپ کا وقار تھا، گویا مجھے سب سہارے یکجا مل رہے تھے۔ اور پھر میں نے بھی تو اس سے پیشتر ان کے سامنے ایسی طویل خاموشی نہ اپنائی تھی۔ کبھی ان کی بات کو غیر اہم نہ سمجھا تھا ——— مگر شدتِ غم سے مغلوب ہو کر آدمی بڑی سے بڑی شے کو اہمیت نہیں دیتا۔ کچھ ایسی ہی حالت میری تھی۔

جب وہ رضیہ کو کندھے سے لگائے میرے کمرے میں واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں بلی کا ایک بچہ بھی تھا رضیہ کو صوفے پر آہستہ سے گرا کر انہوں نے بلی کے بچے کا سر سہلانا شروع کر دیا۔ جانے کیسے مجھے اس وقت مسسز اور وہ بلی کا بچہ بے حد پیارا لگا۔ غیر ارادی طور پر میرے ہاتھ بچے کو گود لینے کے لئے تڑپ کر اٹھے۔ اور مسسز نے بچہ میری جھولی میں ڈال دیا۔

صوفے کی پشت پر ہاتھ رکھ کر جھک کر انہوں نے کہا "سنو میری بات تم دونوں اس بری طرح غم کے جنگل میں پھنس رہے ہو کہ مجھے تمہارے پاگل ہو جانے کا اندیشہ ہے اس لئے تم لوگ ابھی اسی وقت میرے ساتھ چلو اب میں تمہیں ایک منٹ یہاں نہ رہنے دوں گی۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ

پھر بولیں۔ اس گھر سے یقیناً تمہارا جی اکتا گیا ہوگا۔ یہ ویرانی۔ خاموشی۔ سناٹا۔ چپ چاپ تمہیں کیسے پسند آ سکتی ہے بھلا خنک کمروں میں بیٹھ کر کتنے ہی گرم آنسو بہاؤ مگر یہ زخم مندمل نہ ہوگا۔ ان زخم کو تو وقت کا مرہم درکار ہے سمجھے — میں تم دونوں سے مخاطب ہوں۔ میرے ساتھ آؤ

ان کی آنکھوں سے کچھ اس قسم کے جذبات جھلک رہے تھے کہ مجھے ان کی اس آرزو کا احترام کرنا پڑا۔ میں اسی طرح غیر رسمی کپڑوں میں اٹھ کھڑا ہوا۔ رضیہ بھی یہاں سے چلنے پر رضامند نظر آتی تھی تاہم وہ اسی طرح چل رہی تھی۔ جیسے گاؤں کی کوئی گنوار لڑکی اونچی ایڑی کی جوتی پہن کر چل رہی ہو۔

ہم سسٹر کی آسٹن میں آ بیٹھے۔ کار میں بیٹھنے کے بعد کسی نے کوئی بات نہ کی۔ سسٹر چپ چاپ کار ڈرائیو کرنے لگیں۔ رضیہ اگلی سیٹ پر ان کے ساتھ سہمی سی بیٹھی تھی اور میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا سوچ رہا تھا "سسٹر سنجانا کتنی عجیب اور مخلص عورت ہیں۔ پھر بھی وہ کہیں میری اس طویل خاموشی سے برا نہ مان لیں ان کے احساسات و جذبات کی نزاکت اور ان کے ارادوں کی پختگی میں اچھی طرح سمجھتا ہوں　　　اس بے ربط سوچ کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب کار کو یک لخت بریک لگی۔ اور میں بیٹھا بیٹھا اگلی سیٹ کی پشت پر جا گرا۔ سسٹر دروازہ کھول کر جلدی سے نیچے اتریں رضیہ کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی میں نیچے اترا تو سسٹر سنجانا ایک زخمی پلے کو اٹھا رہی تھیں۔ سڑک کے ایک کنارے پر ایک کتیا اور ایک دوسرا پلا حیران نظروں سے سسٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ زخمی پلا چلا رہا تھا اس کی پچھلی دونوں ٹانگیں بری طرح کچلی گئی تھیں۔ سسٹر نے اسے اٹھا کر سڑک کے کنارے رکھا تو وہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگا کتیا اس کا زخمی حصہ چاٹنے لگی دوسرا پلا ایک پل کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے زخمی بھائی کو سونگھا۔ اور پھر دو گز پرے جا کھڑا ہوا۔ سسٹر نے اپنی نم آلود پلکیں اٹھائیں اور خون آلود ہاتھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولیں: "ماں پر کیا بیت رہی ہوگی بے چاری منہ میں اٹھا کر سڑک پار کرا رہی تھی۔ مگر اس کی یہ کارروائی بھی کسی کام نہ آ سکی۔ ایک کو سڑک کے دوسرے کنارے پر پہنچا کر یہ واپس بھی نہ پلٹی تھی کہ یہ دوسرا خود ہی بھاگ کر سامنے آ گیا" کار سے بیگ نکال کر انہوں نے جلدی جلدی پٹی، روئی اور دیگر اشیا نکالیں۔ اور پلے کے زخم صاف کرنے لگیں مگر وہ چند منٹ بھی جی نہ سکا پلا مر گیا۔ تو وہ مجرموں کی طرح گردن جھکائے کچھ دیر سڑک کے کنارے کھڑی اسے تکتی رہیں پھر یوں واپس چلنے لگیں جیسے جوان بیٹے کو لحد میں اتار کر پلٹی ہوں کار میں بیٹھ کر انہوں نے ایک بار اداس نگاہوں سے کتیا کی طرف دیکھا اور جلدی سے منہ پھیر لیا۔ جیسے انہیں کتیا سے آنکھ ملانے کی تاب نہ ہو"

سسٹر کا مکان آ گیا۔

انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے رضیہ کو بازو سے پکڑ کر یوں اتارا۔ جیسے نئی نویلی دلہن کو اتار رہی ہوں۔　　گیٹ کے اندر ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ شاید اس لئے سسٹر نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہا "دیکھنا تین ہیں" مجھے اس بات پر ہنسی آ گئی میں ہی نہیں رضیہ بھی اکثر اوقات یہاں آ چکی تھی۔ اور ہم جانتے تھے کہ برآمدے کی سیڑھیاں تین ہیں۔

ہم ڈرائینگ روم میں داخل ہو گئے۔

کمرے کی فضا کافی حد تک گرم اور مانوس تھی۔ آتشدان میں کوئلوں کی بجائے ہیٹر رکھا تھا جو دہک رہا تھا۔ آتشدان کے دائیں طرف ایک چھوٹی سی خوبصورت میز رکھی تھی اس پر ایک سبز شیڈ کا لیمپ جل رہا تھا جس سے فرش پر چاندنی سی بکھر گئی تھی ہم میز کے گرد رکھی ہوئی گدے دار کرسیوں پر جا بیٹھے۔

سسٹر دو منٹ کی اجازت چاہ کر اندر گئیں تو میں نے کارنس کی تصویروں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میں ان تصاویر کو بارہا دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود میں انہیں بغور دیکھنے لگا۔

ایک طرف سسٹر کی بچپن کی تصویر رکھی تھی ایک چھوٹی سی بچی گلے میں رومال باندھے کتابوں کو سینے سے لگائے مسکرا رہی تھی اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت اور بوڑھے مرد کی تصویریں علی الترتیب رکھی تھیں کارنس کے درمیان میں ایک خوبصورت سا چراغ جل رہا تھا جس کے چاروں طرف تازہ،

تازہ پھول رکھے تھے۔

سسٹر واپس آگئیں۔ اور بولیں۔" مادام کو دیکھنے گئی تھی کل سے ان کی طبیعت بھی کچھ مضمحل ہے"۔

"انہیں بھی ساتھ لے لیا ہوتا سسٹر ——— میں نے کہا۔ اب کیسی ہیں مادام؟

"ٹھیک ہیں۔ اب کچھ ٹھیک ہیں۔ ابھی سب ان سے جا کر ملیں گے۔"

سسٹر مسکرائیں۔ اور کارنس پر رکھی ہوئی تصویروں کے پاس چلی گئیں پھر انہوں نے بوڑھی عورت کی تصویر کو ہاتھ میں لیا۔ پھونک مار کر اس پر پڑی ہوئی گرد کو صاف کیا اور کہنے لگیں۔" یہ تصویر دیکھی ہے تم نے۔ بالکل تازہ ہے پندرہ دن ہوئے میں نے اپنے ہاتھ سے اتاری تھی۔

"کیسی ہے۔؟"

"اچھی ہے بہت اچھی ہے" میں نے اور رضیہ نے تقریباً ایک ہی بات کہی۔

"پہلی سے بھی اچھی ہے نا" انہوں نے مزید پوچھا۔

میرا ذہن پہلی تصویر کی طرف چلا گیا۔ وہ تصویر بھی مادام کی ہی تھی۔ تاہم کچھ پرانی تھی۔ میں نے کہا " اس تصویر سے تو یہ بہت زیادہ اچھی ہے"۔

سسٹر چہک کر ہنس پڑیں۔ "وہ پہلی بھی تو میں نے ہی اتاری تھی"۔

انہوں نے میرے ہاتھ میں تصویر تھما دی۔ اور کارنس پر رکھی ہوئی باقی دونوں تصویریں بھی اٹھا لائیں۔ اور انہیں میز پر ایک نادیے سے سجا کر بولیں

"تم نے آج تک ان تصاویر کے بارے میں کوئی سوال نہیں پوچھا؟"

مجھے یوں لگا۔ جیسے وہ مجھے بولنے پر اکسا رہی ہوں۔

" ایک تصویر تو آپ کی اپنی ہے اور دوسری ———"

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا ہاں مگر اس کے بارے میں یہ تو پوچھا جا سکتا ہے نا۔ کہ کب اتری۔ کس نے اتاری۔ یہ مادام نے اتاری تھی۔ میں اس وقت چھ برس کی تھی ——— ہوں ——— اچھا تو دوسری تصویر؟

وہ آپ کے ڈیڈی کی ہے شاید! میں نے فوراً کہا۔ جو زندہ نہیں ہیں۔

سسٹر نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا۔ کہ میرے ذہن سے غم کی ساری کلفت دھل گئی۔ چہکتے ہوئے انہوں نے بوڑھے آدمی کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا:" میں نے ٹھیک کہا تھا نا ——— کہ تم نے کبھی کوئی سوال نہیں پوچھا ——— اس سے میری مراد یہ تھی۔ کہ تم اس تصویر کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ارے بھائی یہ تو میرے ماموں ہیں۔ ابھی زندہ ہیں۔ اور کیلی فورنیا میں ہیں"!

تو آپ کے ڈیڈی کی تصویر کہاں ہے پھر؟

رضیہ نے اچانک سوال کر دیا۔

سسٹر کے چہرے پر پھیلی ہوئی تمام شگفتگی آہستہ آہستہ سنجیدگی کی تہہ میں دب گئی انہوں نے کرسی گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے کہا:" وہ اس قابل ہی کہاں تھے۔ کہ ان کی تصویر کو اپنی ماں کی تصویر کے ساتھ کارنس پر جگہ دی جا سکتی۔"

رضیہ کچھ بولی نہ میں۔ ہم نے تجسس سے بھری ہوئی نگاہیں سسٹر کے چہرے پر جما دیں۔

وہ پہلے مسکرائیں پھر کچھ دیر خلاؤں میں گھورتے ہوئے کھو سی گئیں۔ اور پھر بڑے ہی دھیمے لہجے میں گویا ہوئیں:" وہی تو ایک شخص ہے ———

جس نے مادام کی پھولوں بھری زندگی میں انگارے پھیلائے ہیں ۔

عورت کی زندگی کے وہی لمحے تو حسین اور اُجلے ہوتے ہیں جو وہ شوہر کے ساتھ گذار کر خوشی محسوس کرے ۔ بقیہ زندگی تو انہی لمحوں کی یاد میں بھی بسر ہو سکتی ہے وہی لمحے ڈیڈی نے میری ماں کو دکھ دینے میں گنوائے ہیں ۔ یوں جیسے انتقام لے رہے ہوں ۔ ان باتوں کی بنیاد کوئی بھی نہیں تھی ۔ بس یہی ——— کہ میں مرد ہوں ——— اور تم عورت ! میں ان باتوں کا ذکر کرنا نہیں چاہتی ۔ اور نہ ہی انہیں دہرا کر تمہارے اور اپنے دکھ کو بڑھانا چاہتی ہوں ۔ بس تم اتنا جان لو ۔ کہ جب ماں نے ان کے بے پناہ مظالم سے تنگ آ کر علیحدگی اختیار کر لی ۔ اور مجھے ان کی بعض وہ باتیں بھی بتائیں جو میں اس سے پہلے نہیں جانتی تھی ۔ تو مجھے دنیا بھر کے مردوں سے نفرت ہو گئی ۔ میں نے زندگی کا ایک حصہ مردوں سے نفرت کرنے میں گذارا ہے اور پھر شادی نہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے یہ نفرت میرے اندر جڑ پکڑ گئی اور نفرت کے اس درخت کی کونپلوں نے مجھے ڈھانپ کر اس دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور علیحدہ کر دیا ۔ یا پھر شاید مجھے وہ زندگی پسند نہ تھی ۔ جسے میری ماں نے محکوم بن کر گذارا تھا ۔ تم ہی کہو ۔ میں کیسے ایک مرد کو زندگی بھر کا ساتھ دینے کے لئے منتخب کر لیتی ؟ ہر مرد کا ذہن بنیادی طور پر تقریباً ایک ہے ۔ ماں نے زندگی سے سیندور مانگا تو اسے راکھ ملی ۔

کلیوں کی آرزو میں خزاں کے زرد پتے اس کے گلے کا ہار بنے ۔ اور روشنی کی ان کرنوں کو جسے انہوں نے مستقبل میں حاصل کرنے کے خواب دیکھے ۔ اندھیروں کے اژدھا چاٹ گئے ۔ پھر تم ہی کہو نا ۔"

رک کر انہوں نے ایک منٹ تک توقف کیا ۔ اور پھر تھوک نگل کر بولیں :

پھر میں نے اپنے آپ سے یہ عہد بھی تو کر رکھا ہے ۔ کہ مادام کے دکھوں کی تلافی کرنے کے لئے ہر قسم کی قربانی دوں گی اور اس کمی اور خلا کو پُر کرنے کی کوشش کروں گی جو مادام کی زندگی کا المیہ ہے شادی نہ کرنا بھی تو ایک قربانی ہی ہے نا ۔ ؟ انہوں نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میری رائے معلوم کرنا چاہتی ہوں ۔

"بہت بڑی قربانی سسٹر" میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا ۔

انہوں نے اس چھوٹے سے جملے پر زیادہ توجہ نہ دی ۔ بلکہ ٹیبل لیمپ کے سبز شیڈ پر انگلی سے الٹی سیدھی لکیریں کھینچتے ہوئے بولیں :

"بعض اوقات مجھے یہ جان کر خوشی ہوتی ہے ۔ کہ میں ابھی تک اپنے آپ سے کئے ہوئے اس عہد کو ثابت قدمی سے سرانجام دے رہی ہوں ۔ خدا کرے یہ زندگی اسی عہد کو پورا کرتے ہوئے تمام ہو ۔ میں اپنی ماں کی بیٹی ہوں ، بیٹا بھی ، خاوند بھی ، چاہنے والا بھی ۔ ان سب رشتوں کو نبھاتے ہوئے مجھے ان کی پامال اور ادھوری آرزوؤں کو پورا کر کے ایک انجانی اور ان مٹ خوشی ہوتی ہے ۔ اس وقت میں اپنے آپ میں وزن محسوس کرتی ہوں ۔ اور مجھے اپنے آپ پر رشک آنے لگتا ہے . . . . ."

"مادام بلا رہی ہیں" ملازم نے دروازے کا ایک پٹ کھول کر صرف اتنا کہا تو سسٹر نے بات ادھوری وہیں چھوڑ دی ایک لمحہ کھڑے رہ کر انہوں نے کچھ سوچا ۔ پھر گھڑی دیکھی اور بولیں . . . . ."

"ممی چائے پر بلا رہی ہیں شاید ——— آؤ سب چلیں" ۔

ہم اُٹھے اور چپ چاپ ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے سے ہوتے ہوئے ایک خاص کمرے میں چلے آئے ۔ جہاں واقعی مادام بجے سوری پہیوں والی کرسی پر بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی تھی ۔

آداب کہہ کر میاں اور رضیہ ایک میز کے گرد رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔ مادام بجے سوری اپنی پہیوں والی کرسی کو آہستہ آہستہ چلاتی ہوئی ہمارے

...نے آئیں اور اپنی بچی بھی اور بے جان آنکھوں سے رضیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگیں - میری حالت تو تم سے چھپی ہوئی نہیں ورنہ ضرور تمہارے بچے کی تعزیت کرنے آتی - میری بچی - ! امید ہے تم اس بات کو نظر انداز کر دو گی - اور تم بھی - انہوں نے میری طرف اشارہ کیا - میرے دل میں آیا کہ میں کہوں - مادام آپ شرمندہ کر رہی ہیں - مسٹر نے آپ کی کسر پوری کر دی ہے - مگر میرے سینے میں جو مدوجزر پھیلا ہوا تھا اس نے مجھے کچھ بولنے نہ دیا - میں نہیں جانتا تھا - کہ میں کس طرح اُن کے محبت بھرے پُرخلوص جذبات کا جواب دوں شاید میرے پاس کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں - میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا -

جب ملازمہ چائے کی ٹرے لئے اندر آئی - تو اس نے چائے میز پر رکھنے سے پہلے مسٹر سے کہا : ڈاکٹر بروج اور رنجنا آرہے ہیں :

ڈاکٹر بروج سے میں پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا اور اس کی لڑکی رنجنا سے تو سر راہ اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی ملازمہ کے واپس جانے سے پہلے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے - اور مادام جے سوری کی مزاج پرسی کرنے کے بعد مجھ سے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا اور خالی کرسیوں پر بیٹھ گئے -

مادام جے سوری نے کوئی بات کرنے سے پہلے ہی انہیں میرے بچے کی موت سے آگاہ کر دیا ڈاکٹر بروج نے اظہار غم کیا - رنجنا نے کچھ سوالات پوچھے اور خاموش ہو گئی - ان کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے میں اُن کے جذبات کا اندازہ بخوبی لگا سکتا تھا -

چائے پیتے ہوئے بھی کسی نے کوئی بات نہ کی - بس چپ چاپ چائے پیتے رہے اور اس کے بعد بھی کسی نے کوئی ایسی بات نہ کی جس میں مزاح اور شگفتگی کا عنصر ہو - آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے لہجوں میں زندگی اور موت کے فلسفے پر گفتگو ہوئی مگر تفریح کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا - بات گھما پھرا کر میرے بچے کی موت پر آجاتی تھی اور سب کے چہرے لٹک جاتے تھے -

یہ محفل دیر تک قائم رہی - اور اس وقت برخاست ہوئی جب مسٹر کے ڈسپنسری جانے کا وقت ہو گیا -

میں اور رضیہ مسٹر کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے ہوئے ہال کمرے میں آپہنچے -

یہ کمرہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بالکل الگ نظر آتا تھا - کمرے کے بالکل درمیان ایک خوبصورت قالین بچھا تھا جس پر ایک منقش تپائی رکھی تھی - اور اس تپائی کے درمیان ایک سنہری چراغ جل رہا تھا - چراغ شیشے کی ایک چھوٹی سی چار دیواری میں رکھا تھا - اس الماری کے دونوں طرف لکڑی کے بنے ہوئے گلدان تھے جن میں زیادہ تر گلاب کے پھول رکھے تھے اور شیشے کی بنی ہوئی چار دیواری کے اوپر بھی سنہری تاروں سے بنا ہوا ایک ہار جگمگا رہا تھا چراغ کی مدوزرد روشنی کچھ تپائی پر اور کچھ قالین پر بھی پڑی ہوئی تھی اس کے علاوہ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا - بلاشبہ اس اندھیرے میں بڑا ہی تقدس تھا - آج سے دس برس پہلے مجھے اچھی طرح یاد ہے میں اس کمرے میں ماں جی کے ساتھ آیا تھا - تو بھی یہی چراغ اسی طرح جل رہا تھا - کمرے کی فضا وہی تھی صرف جھولتے ہوئے پردوں کا رنگ کچھ پھیکا ہو گیا تھا -

اس کمرے سے ملحق ایک چھوٹے سے کمرے کو لائبریری کا روپ دیا گیا تھا - اس کے بالکل ساتھ سونے کا کمرہ تھا -

رضیہ اس وقت سونا چاہتی تھی - میں نے اُسے سونے کے کمرے میں بھیج دیا - اور خود لائبریری میں آبیٹھا -

جب لائبریری میں آدمی تنہا ہو اور کتابوں سے تھوڑی سی دلچسپی ہو تو کتابوں کو اُلٹ پلٹ کرنے کے علاوہ اور کیا کرے گا -

میں نے بھی یہی کچھ کرنا شروع کر دیا - باری باری ہر الماری کو کھولا - ایک ایک کتاب کو ہاتھ میں لیا - ورق الٹائے اور پڑھا میری معلومات میں ایک یہ بھی اضافہ ہوا - کہ مسٹر کن کن کتابوں کا مطالعہ کر چکی ہیں - ایک ایک لائن کو غور سے پڑھا گیا تھا - نشانات اور جملوں پر تبصرہ ہر کتاب میں موجود تھا - تحریر مسٹر کی تھی - کیٹس - بائرن - شیلے سے لے کر اقبال - عمر خیام اور مثنوی مولانا روم تک کے نسخے موجود تھے پھر فلسفہ - تحقیق - تاریخ حتیٰ کہ انجیل اور قرآن کو بھی بڑے احترام سے رکھا ہوا تھا دنیا کی ہر شے اور ہر کتاب سے دلچسپی رکھنے والی مسٹر سنجانا..................

. . . . اس وقت مجھے کچھ اور بھی عجیب دکھائی دیں۔ کرسی سے ٹیک لگا کر میں نے آنکھیں موند لیں۔ میں اس وقت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

شاید میری آنکھ لگ گئی تھی۔ جب میں نے دوبارہ جاگ کر گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے۔ اور میں لائبریری میں ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کچھ لمحوں بعد ہی میں نے محسوس کیا جیسے کوئی سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہو۔

بیٹھے بیٹھے ہی نے گردن گھما کر ہال کمرے کی طرف دیکھا۔ سسٹر سنجاتا جلتے ہوئے خوبصورت چراغ کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔ اور سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھیں میں نے لائبریری کی بتی بجھا کر ہال کمرے کا پردہ اچھی طرح ہٹا دیا۔

سرگوشیاں آہستہ آہستہ آواز کا روپ دھارنے لگیں۔ پھر ان کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

"میں صرف تیری دی ہوئی عقل اور شعور سے ان کا علاج کر رہی ہوں۔ شفا دینے والا تو ہی ہے جس کا تو روپ ہے۔ جب تک تیری مرضی اور خوشی شامل نہ ہوگی۔ دوا کچھ نہ کر سکے گی۔ تو انہیں صحت دے۔ انہیں معاف کر دے بخش دے۔ وہ بے حد کرب میں مبتلا ہیں۔ سسٹر سنجاتا پہلے سے زیادہ جھک گئیں اور یوں گڑگڑانے لگیں جیسے اگر ان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ تو وہ ابھی رونے لگیں گی۔ میری نظروں میں تھوڑی دیر کے لئے یونان کے وہ قدیم حکماء گھوم گئے۔ جو مریضوں کو دوا دے کر رات بھر ان کی صحت کے لئے دعا کیا کرتے تھے لیکن وہ تو پرانا زمانہ تھا۔ اس دور اور اُس دور میں تو صدیوں کا فرق ہے یہ فرق ایک لمحے میں کیونکر مٹ سکتا ہے سسٹر اس صدیوں پرانی دیوار کو لمحوں میں کیسے پھلانگ رہی تھیں۔

میں اٹھ کر سونے کے کمرے میں چلا آیا۔ اور بغیر مزید کچھ سوچے سو گیا۔

صبح جس وقت سسٹر مجھے جگا رہی تھیں۔ سورج کی سنہری سنہری کرنیں روشندان سے اندر جھانک رہی تھیں۔ رضیہ مجھ سے پہلے اٹھ چکی تھی میں اس احساس سے کچھ شرمسار ہو گیا اور پھر اس لئے بھی کہ سسٹر خود مجھے جگا رہی تھیں۔ انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "تمہاری نماز تو سورج طلوع ہونے سے پیشتر ہوتی ہے۔ اور تم ابھی تک سو رہے ہو۔"

میں اس بات پر چونک سا گیا "دیکھو میرے ننھے بھیا . . . . وہ چارپائی پر ہی بیٹھ گئیں۔ تم سے تھوڑا سا اختلاف رکھتی ہوں۔ سنو . . . . تم تو مسلمان ہو۔ جو وقت خدا کو یاد کرنے کا ہوا سے ہاتھ سے مت جانے دو۔ سب مذاہب کسی نہ کسی طریق سے اس عظیم طاقت کی پرستش کرتے ہیں۔ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ کوئی خدا کہہ کر پوجتا ہے تو کوئی کرشن کہتا ہے۔ کسی کو وہ عیسیٰ کے روپ میں ملا ہے کسی کو آگ کے روپ میں۔ تمام مذاہب کی بنیاد تو ایک ہی ہے نا! حتٰی کہ لامذہب قسم کے لوگ بھی کسی نہ کسی صورت میں اس طاقت کا اعتراف کر لیتے ہیں میرے نزدیک تو لامذہبیت بھی ایک مذہب ہے۔ اور تم تو ایک واضح مذہب اور روشن نصب العین سے متعلق ہو، تمہیں اس عظیم خالق کو اس طرح نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ یاد رکھو۔ . . دکھ میں . . . . . سکھ میں ہر جگہ ہر گھڑی وہی تمہارا محافظ ہے اور وہی سب کچھ !"

وہ مسکرائیں تو میری پیشانی پسینے سے بھیگ گئی "آئندہ ایسا نہیں ہوگا" جانے میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا . . . . سنجاتا ہسپتال جا رہی تھیں وہ میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر کمرے سے نکل گئیں۔

ان کے بعد مجھے ان کی باتیں بالکل خواب معلوم ہو رہی تھیں۔ سسٹر سنجاتا خدا، مذہب، ایمان، اور عبادت کی اس قدر پابند ہیں مجھے غالباً پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا۔

کافی دیر گم سم رہنے کے بعد میں باہر نکلا تو رضیہ مادام جے سوری کے ساتھ چھوٹے سے لان میں بیٹھی دھوپ کھا رہی تھی۔

میں واپس آکر غسل خانے میں گھس گیا۔ مگر وہاں غسل کرنے کی بجائے میں نے یہ سوچنا شروع کر دیا۔ کہ مجھے مذہب کو کس قدر اہمیت دینی چاہیئے ——————
[illegible] صبح کے بعد پھر میرے اندر کے انسان نے یہی کہا۔ کہ مسسز سنجانا ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ آخر ہم لوگ مذہب سے کیوں انحراف کرتے ہیں۔ بار بار میرے ذہن میں [illegible] خدا مگر میں نے اس کے جواب میں کسی جملے کو ترتیب نہ دیا۔ کھڑ لینے کے ساتھ ہی سب سوال سب جیسے وہم سے غائب ہو گئے تھے۔

میں اور رضیہ کچھ روز وہاں رہے۔ مسسز سنجانا کی باتوں نے ہمیں بہت جلد بچے کے غم سے آزاد کرا دیا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس بھی اس وقت ہوا۔ دکھ [illegible] درمند دل کا ایک میٹھا بول بھی بہت بڑا مرہم ہے اور پھر یہاں تو دن رات ہی ان دردمندوں کے آسرے پر بیت رہے تھے جنہوں نے ہماری روحوں کو مانوس [illegible] تھا اور دل کی گہرائیوں میں جگہ دی تھی۔

مسسز نے جب ہمیں رخصت کرنے کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ تو ان کا چہرہ اداس ہو چکا تھا۔ رضیہ کو تو انہوں نے پہلے سہارا دے کر کار میں سوار کرایا [illegible] بیٹی کو ڈھلے میں اٹھا۔ رہی ہوں۔ پھر اگلی سیٹ پر آ بیٹھیں اور کار سٹارٹ کرنے کی بجائے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولیں: میں چاہتی تو یہی تھی۔ کہ تم لوگ ابھی تھوڑا۔ مگر رضیہ کا اصرار بھی ہے اور حالات کا تقاضا بھی۔ انسان کبھی ایک جگہ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ ڈاکٹر ہوں نا۔ ہر مرض کی تشخیص کرنے کے لئے بڑی احتیاط [illegible] تم لوگ جس مرض میں مبتلا تھے۔ اس کا علاج کرنے کو میں نے پوری پوری کوشش کی ہے۔ اور اب یہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آنا بھی تمہارے علاج [illegible] واحد ہے۔ ورنہ کچھ دن تو ضرور تمہیں مجبور کر کے روکتی۔ " کار سٹارٹ کرتے ہوئے انہوں نے ہارن بجایا اور کہا " ذرا پیچھے نگاہ رکھنا۔ کوئی پلا تو نہیں ..
[illegible] دن کے بعد میں اکثر سوچتی ہوں کہ آج تک کسی جانور نے مجھ سے، میری کار سے دکھ نہیں اٹھایا۔ جانے یہ پلا کیسے میری کار کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ میں ابھی [illegible] سے نہیں بھول سکی۔ وہ اکثر مجھے یاد آتا ہے۔ بے چارہ ۔!

گھر کے دروازے پر جب ہم کار سے اترے۔ تو مسسز ہمیں اندر تک چھوڑنے آئیں۔

اور پھر واپس ہوتے ہوئے بولیں۔ میں تھوڑی دیر ضرور یہاں رکتی مگر مادام بیمار ہیں۔ ان کی طبیعت اکثر ٹھیک نہیں رہتی۔ جیسا کہ تم جانتے ہو۔

خیر تم فکر نہ کرو۔ میں آؤنگی میں آیا کروں گی۔ روز آیا کروں گی پھر وہ رضیہ سے مصافحہ کر کے چلی گئیں۔

مسسز سنجانا کے قریب ہفتہ بھر رہ کر رضیہ نے مذہب کا اثر بڑی شدت سے قبول کیا تھا اور باقاعدہ اب نماز بھی پڑھنے لگی تھی۔ میں نماز تو نہیں پڑھتا تھا [illegible] ان مذہب کے بارے میں کچھ مطالعہ کرنے میں پہلے جو چیز مانع تھی۔ غالباً اس کا وجود تو پہلے بھی نہ تھا۔ تاہم کوئی غیر مرئی شے۔ فرار کی سی صورت میں میرے [illegible] موجود ضرور تھی۔ جواب نہیں تھی۔ میں اب مطالعہ ضرور کرنے لگا تھا۔ اور وہ بھی خالصتاً مذہبی کتب کا۔

دو تین مہینے گذر گئے۔ مسسز اکثر بیشتر آتیں۔ اور چلی جاتیں۔ ان کے آنے سے ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں حرارت سی آجاتی طبیعت شگفتہ اور بہلی بہلی سی رہتی اور جب وہ نہ ہوتیں تو ان کے آنے کا انتظار رہتا۔

پھر ایک دن اچانک مجھے دفتر میں فون پر اطلاع ملی۔ کہ مسسز سنجانا ہسپتال کی سیڑھیوں سے پھسل کر زخمی ہو گئی ہیں۔ دفتر سے نکلتے نکلتے۔ مجھے ایک گھنٹہ لگا۔ میں ہسپتال پہنچا تو مسسز بستر پر اوندھے منہ لیٹی تھیں مجھے دیکھ کر انہوں نے سیدھا ہونے کی کوشش کی اور کراہ کر رہ گئیں۔ بظاہر جسم کا کوئی حصہ [illegible] نظر نہ آرہا تھا۔ کوئی اعضا پٹی میں بھی نہیں لپٹا ہوا تھا۔ میں چپ چاپ پاس پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ گیا انہوں نے مجھے دیکھ تو بہت پہلے لیا تھا۔ مگر دیر بعد بولیں [illegible] جیسے کسی نے چاقو گھونپ رکھا ہو۔ جب سے گری ہوں۔ سیدھا لیٹ سکی ہوں نہ اٹھ کر بیٹھ سکی ہوں —————— یہ دیکھو۔ یہاں . . . " انہوں نے [illegible] میری انگلی پکڑ کر اپنی ریڑھ کی ہڈی پر ایک خاص جگہ رکھی ان کے لبوں سے آہ سی نکل گئی۔ مسسز نے مسکرانے کی کوشش کی تو ان کے چہرے پر کرب اور درد کے نشانات اور بھی ابھر آئے نچلے ہونٹ کو دو ایک بار دانتوں سے کاٹ کر انہوں نے پوچھا " رضیہ تو نہیں آئی ناں "؟

"نہیں . . . میں نے کہا۔ مگر سسٹر یہ سب . . . . میں نے مزید کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے مجھے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور بولیں . . " تم کچھ مت کہو۔ میں جانتی ہوں۔ تم کیا جاننا چاہتے ہو۔ تم یہ سب کچھ بعد میں پوچھ لینا۔ فی الحال جلدی سے گھر جاؤ اور رضیہ کو مادام کے پاس چھوڑ آؤ وہ بیمار ہیں تمہارا بڑا احسان ہو گا ــــــ"

سسٹر کی آواز ان کے بھینچے ہوئے ہونٹوں میں گھٹ کر رہ گئی ان کے ماتھے پر پسینے کے موتی پھوٹ رہے تھے جیسے کسی نے ان کی پیشانی پر سپیسے رکھ دیا ہو۔ میں رضیہ کو مادام کے پاس چھوڑ کر پھر ہسپتال چلا آیا۔ میرے آنے تک سسٹر کی کمر کا ایکس رے لیا جا چکا تھا۔ مگر ایکسرے کا رزلٹ فیصلہ کن نہ تھا ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق نہ تو ہڈی ٹوٹی تھی نہ گوشت پھٹا تھا۔ مگر آخر تھا کیا یہ کوئی بھی نہ کہہ سکا۔

ایک دن ــــــ دو دن ــــــ آٹھ دن!

مرض کی تشخیص ہی نہ ہو سکی تھی۔ صرف . . . . پلاسٹک لگانے سے اسقدر فائدہ ضرور ہوا تھا۔ کہ سسٹر سیدھا لیٹ سکتی تھیں۔ مگر اٹھ کر بیٹھنے میں پہلے دن کی طرح کا درد تھا۔

پھر جب ایک ماہ بیت گیا اور مرض اور علاج کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تو سسٹر مجھے اس روز بہت اداس دکھائی دیں۔ کہنے لگیں ــــــ "میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ کہ قدرت اس معمولی سی چوٹ پر اتنا بڑا پردہ کیوں ڈال رہی ہے" وہ یہ بات کہتے ہوئے بے حد سنجیدہ تھیں اور جب ایک منٹ بعد ہی نرس دوا لے کر آئی۔ تو سسٹر نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اُسے کہا "کس مرض کی دوا لائی ہو؟ بھلا موت کا بھی کوئی علاج ہے؟"

ان کے لہجے میں بلا انتہا مایوسی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے ان کے اندر زندگی کی امنگ سسک رہی ہو۔ زندہ رہنے کی امنگ مر رہی ہو۔ اس ایک ماہ کے اندر شاید وہ اس لئے زیادہ مایوس ہو گئی تھیں۔ کہ بیسیوں ایکسرے لئے جا چکے تھے۔ انجکشن لگائے گئے تھے خون ٹسٹ کیا گیا تھا۔ مگر سب بے سود، درد ایک جگہ، ایک نکتے پر کانٹے کھبنے کی طرح گڑا تھا پھر ایک دن مادام جب سوری اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر رضیہ کے ساتھ بڑھاپے اور بیماری میں ہسپتال آگئیں۔ اس سے پہلے کہ مادام کچھ پوچھیں اور سسٹر کچھ بتائیں سسٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اپنی تکلیف سے تو وہ ایک دن بھی نہ روئی تھیں۔ غالباً مادام کے چہرے پر بیٹی کا دکھ محسوس کر کے۔ جذبات کے سہارے جو تاثر منقش تھا سسٹر کے رونے کا سبب تھا۔

سسٹر روتی رہیں۔ ہم سب گہرے رنج میں ڈوبے خاموش بیٹھے رہے اور میں نے تو یہ بھی سوچا کہ کتنی معمولی بات کتنی بڑی بات بن جائے گی۔ اسی روز شام کو سسٹر ہسپتال سے گھر روانہ ہو گئیں۔

گھر آکر ان کی حالت اس حد تک سنبھل گئی تھی۔ کہ درد دن کے بعض حصوں میں کم ہو جاتا۔ اس وقت سسٹر کی آنکھوں میں زندگی کی چمک آجاتی۔ زندہ رہنے کی وہ امنگ جو تکلیف کی حالت میں دب سی گئی تھی۔ نیا روپ لے کر دوبارہ بیدار ہو جاتی ان کا چہرہ روشن ہو جاتا اور وہ مسکرا مسکرا کر اپنے دیرینہ مریضوں کی بابت پوچھنے لگتیں۔

سسٹر سنجانا کے بیمار رہنے کی وجہ سے اُن کے معاشی حالات بُری طرح متاثر ہوئے تھے۔ نوکری یوں ہاتھ سے گئی۔ اپنی پریکٹس آہستہ آہستہ تقریباً ختم ہو گئی گھر آنے کے بعد انہوں نے مشکل سے ایک ماہ صبر کیا اور پھر زندگی کے اس چکر کو جاری رکھنے کے لئے لیٹ کر پریکٹس جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میرے نزدیک یہ بات کسی صورت بھی قابلِ قبول نہ ہوئی۔ مادام بھی مجھ سے متفق تھیں۔

مگر سسٹر نہ مانیں انہوں نے ایک دن اپنی ذاتی ڈسپنسری میں بستر لگوایا۔ اور مکان سے ملحق ڈسپنسری میں بستر پر لیٹ کر مریضوں کو پھر سے دیکھنا شروع

رہا۔ مگر یہ سلسلہ پہلے کی طرح چل نہ سکا۔ کیونکہ مریضوں کی تعداد سسٹر کی غیر حاضری کی وجہ سے پہلے ہی کم ہو چکی تھی۔ اور اب سسٹر بعض دن تکلیف کے باعث انہیں نہ دیکھ سکتیں۔ اس سلسلے کو بھی آخر کار تیسرے ماہ بند ہی کرنا پڑا۔ حالانکہ سسٹر بضد تھیں کہ میں بیٹھ کر آسانی سے مریض دیکھ سکتی ہوں۔ مگر مریض ہوتے تو وہ نہیں دیکھتیں۔

یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ تو سنجانا سسٹر نے کار بیچ دی۔ اور حاصل شدہ رقم مادام ہتے یوری کے نام بنک میں جمع کرا دی۔

ڈاکٹر بروِنج دوسرے تیسرے دن آتے تھے۔ کبھی کبھی رنجنا بھی آتی تھی۔ اس کے علاوہ سسٹر کا حلقۂ احباب مختصر سا تھا جو چند ایک بوڑھی پارسی عورتوں پر مشتمل تھا۔

ڈاکٹر بروِنج نے ایک روز مجھے علیحدہ لے جا کر کہا میں سنجانا کے لئے کچھ وظیفہ مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ مگر میرا خیال ہے بلکہ میرا یقین ہے کہ وہ خوددار قسم کی عورت یہ بات کسی صورت بھی تسلیم نہ کرے گی۔

کیا تم سنجانا کو منا سکتے ہو؟

"میں کوشش کروں گا" میں نے کہا۔

یہاں کوشش کارآمد ہو سکتی تو میں خود کوشش کرتا۔ کوشش نہیں کوئی ترکیب ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر بروِنج رازدارانہ لہجے میں کہہ رہے تھے۔ میں سر جھکائے سوچنے لگا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر خود ہی بولے "کیا سنجانا میرے مکان پر ہر روز ایک گھنٹہ مریض دیکھنے کے لئے آ سکتی ہے؟ اگر وہ یہ بات مان لے تو وظیفہ معاوضے کی صورت میں بدل جائے گا۔ اور ـــــ"

"مگر وہ تو بیٹھنے سے معذور ہیں" میں نے ڈاکٹر بروِنج کی بات کاٹ دی۔ "اس سلسلے میں میں نے سوچ لیا ہے۔" انہوں نے برجستہ کہا۔ "پہیوں والی کرسی جو مادام استعمال کرتی ہیں۔ وہ اس پر ایک طریقے سے آسانی سے آ جا سکے گی" وہ رکے اور پھر بولے۔ "اگر اس کی بغلوں میں چمڑے کی پیٹیاں ڈال کر اوپر کی طرف کس کر باندھ دیا جائے۔ اس کے علاوہ کرسی میں گدے بھی رکھے جائیں گے۔"

"کیا ایسا ممکن ہے؟" میں نے ڈاکٹر بروِنج کی طرف مسکرا کر تجسس انگیز نظروں سے دیکھا۔ "کیوں نہیں" ہر چیز ممکن ہے۔ آؤ آج ہی کوشش کر دیکھیں" وہ مجھے اندر لے آئے۔

ہماری یہ کوشش کسی حد تک کامیاب رہی تھی۔ کسی حد تک اس لئے کہ سسٹر کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک تو انہیں درد ہوتا تھا۔ دوسرے بے حد محتاط رہنا پڑتا تھا۔ پھر پیٹیاں لگائی جاتیں۔ گدے رکھے جاتے۔ اور ڈاکٹر بروِنج کے مکان تک پیدل جانا پڑتا۔ [illegible] بعض اوقات میں نہ ہوتا۔ تو سسٹر کا جانا قطعاً ناممکن ہو جاتا۔ میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر بروِنج سے کہہ کر ایک ملازم رکھوا دیا۔ جو سسٹر کو کرسی پر بٹھا کر ادھر سے ادھر پہنچاتا تھا۔

اس ملازمت کے صلے میں ڈاکٹر بروِنج نے پہلے مہینے سسٹر کو تین سو روپیہ دے دیا۔ سسٹر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ اور بقول ڈاکٹر بروِنج کے سسٹر میں زندہ رہنے کی امنگ تیزی سے ابھر رہی تھی۔ بروِنج اس بات سے خوش نظر آتا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں مریض کے اندر جب تک زندہ رہنے کی آرزو نہ ہو وہ صحت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔

دن جوں توں گذر رہے تھے۔

غالباً سسٹر سنجانا ڈاکٹر بروِنج کے ہاں سے واپس آ رہی تھیں ان کے ساتھ پہیوں والی کرسی دھکیل کر ڈاکٹر بروِنج کا ملازم آ رہا تھا کہ بیڈن روڈ سے

میکلوڈ روڈ کی طرف مڑتے ہوئے سسر کے اُوپر تیز رفتار تانگہ چڑھ آیا۔ حادثہ گو معمولی تھا۔ مگر سسر کے لئے اس سے بڑا حادثہ اور کیا ہو سکتا تھا اور پھر جب مجھے سسر کے پھوڑے کی طرح دکھتے ہوئے جسم کے اس حصے کا خیال آیا جس کی وجہ سے وہ تقریباً معذور ہو چکی تھیں۔ تو میرے لئے بھی اس حادثے نے بڑی بھیانک صورت اختیار کر لی۔ جب میں ان کے ہاں پہنچا تو ڈاکٹر بروچ ان کی چارپائی کے قریب کرسی پر بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ میرے آنے سے قبل وہ سسر کا معائنہ کر چکے تھے۔ سسر سنجانا ایک ہاتھ کو کمر کے نیچے رکھے درد سے چلا رہی تھیں۔ اور مادام ہے سوری سہمی سہمی سی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی کو گھور رہی تھیں۔ میں اتنا وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ کہ حادثے کی تفصیلات پوچھے بغیر چپ چاپ چارپائی کی پائنتی پر ہی بیٹھ گیا۔

ہم سب سراسیمگی کے عالم میں بیٹھے تھے کوئی کسی سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ - اب کیا ہوگا؟ سب کے چہرے اسی ایک بات کا جواب چاہتے تھے سسر کی کراہ میں ڈوبی ہوئی آواز میں ضرور شکایت تھی۔ انہوں نے پہلے کی طرح نہ میری انگلی پکڑ کر کمر پر لگائی۔ نہ مسکرائیں۔ اور نہ رضیہ کو مادام کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا۔ بس چپ چاپ روتی رہیں۔

ڈاکٹر بروچ نے ٹیکے لگانے کے بعد سسر کو مارفیا کے دو انجکشن دیئے۔ اس سے اسقدر فائدہ ضرور ہوا کہ سسر پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔

دوسرے دن میں رات کو دیر سے سسر کے ہاں پہنچا تو سسر ابھی جاگ رہی تھیں۔ لیکن ان کی حالت پھر بھی اچھی نہ تھی ریڑھ کی ہڈی کا درد لحظہ لحظہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پہلے ہی اس درد نے سسر کے لئے بے زاری مایوسی اور بے پناہ تکلیف کا سامان پیدا کیا تھا۔ اور اب یہ دوسرا حملہ تو پہلے سے کہیں زیادہ سخت معلوم ہو رہا تھا۔

مادام ہے سوری بھی پہلے سے کہیں زیادہ پریشان تھیں۔ شاید اس لئے کہ ان کی جوانی بھی دکھوں اور تکلیفوں میں بیتی تھی اور اب بڑھاپا بھی نئی راہ سے ہٹ کر بھیانک راستوں پر آنکلا تھا۔

میرا خیال تھا۔ کہ پہلے حادثے کے بعد جس طرح سسر کی طبیعت کچھ مدت بعد کسی حد تک سنبھل گئی تھی۔ شاید اس بار بھی ایسا ہی ہو مگر میرا خیال غلط نکلا سسر کو بستر پر پڑے روتے چلاتے دو ماہ گذر گئے لیکن وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہ سو سکیں۔ مسلسل کراہنے سے ان کے چہرے کے نقوش تک بدلے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ بعض اوقات تو وہ پہچانی ہی نہ جاتی تھیں۔ جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آنکھیں اندر ہی اندر دھنستی چلی جا رہی تھیں۔ اور بال یوں اُلجھے تھے جیسے ان میں سال ہا سال سے کنگھی نہ کی گئی ہو۔

کچھ دن اور گذر گئے۔

اسی دوران میں مجھے ایک ہفتے کے لئے باہر جانا پڑا۔ اصولاً مجھے ان دنوں نہیں جانا چاہیئے تھا۔ سسر کی حالت بے حد خراب تھی۔ پر کسی کی مجال ہے جو محکمہ کی کارروائی کے سامنے کچھ کہہ سکے۔ سو مجھے بھی مجبوراً یہاں سے جانا پڑا۔

گیا تو میں ایک ہفتے کے لئے تھا۔ مگر پانچویں روز ہی لوٹ آیا۔ گھر پہنچ کر میں نے سب سے پہلے رضیہ سے سسر کی خیریت ہی پوچھی۔ لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

رات کافی گذر چکی تھی۔ آسمان پر بادلوں کے دبیز دبیز ٹکڑے ٹھنڈی اور ریشمیں ہوا میں جھول رہے تھے۔

رضیہ کو تنہا چھوڑ کر میں سسر کے ہاں چلا آیا۔

سسر کی پہلی نگاہ سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی طبیعت پہلے سے بھی خراب ہے ان کی آنکھیں پتھرا کر بے نور ہو رہی تھیں چہرہ کرب سے اور زرد تھا۔

"کیسی طبیعت ہے سسٹر؟" میں نے فرش پر پاؤں کے بل بیٹھ کر سسٹر کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

سسٹر جواب میں کراہیں تو مجھے فوراً اور شدید احساس ہوا کہ مجھے یہ رسمی سوال بالکل نہیں پوچھنا چاہیئے تھا۔ سسٹر نے جواب دینے کی بجائے ہولے ہولے بے جان اور پھیکی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں اس وقت ان بے قرار اور پتھرائی آنکھوں کی تاب بھی نہ لا سکا۔ خود بخود میری نظریں جھک گئیں تو سسٹر ایک لمبا ہنکارا بھر کر بولیں۔

"حال پوچھتے ہو؟ کیا حال کہوں تم سے!"

وہ ایک پل رک کر چھت کو گھورتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ دھیمے لہجے میں بولیں: "پچھلے ساعتوں میں سے راتوں کو رو رو کر اس عظیم طاقت سے دعائیں مانگی ہیں۔ اس کے سامنے منتیں مانی اور التجائیں کی ہیں۔ اور آخر کار جب کچھ بن نہیں پڑا۔ تو میں برسوں سے گڑگڑا گڑگڑا کر اس کائنات کو بنانے والے سے موت مانگ رہی ہوں۔ مگر ——— مگر یوں نظر آتا ہے کہ مجھے موت کی بھیک بھی نہیں ملے گی بعض اوقات تو میرا ذہن یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہیں۔ اور اگر ہے تو وہ مجھے ایک رات کی نیند کیوں نہیں بخشتا۔ مجھے چند لمحوں کے لئے بھی سکون نہیں دے سکتا۔ کیوں؟ میری دعائیں .... التجائیں کیا ہوئیں؟ وہ رو رو کر اتنی سخت تکلیف میں، میں نے اس خدا کو یاد کیا ہے۔ پھر اس سے زندگی نہیں۔ موت مانگی ہے۔ اس نے میری استدعائیں اتنی بے دردی سے کیوں ٹھکرا دی ہیں۔ آخر کیوں۔ آخر کیوں —" وہ رک گئیں۔ ان کے آنسو آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے ان کے زرد زرد گالوں سے پھسلنے لگے۔ ان کی آواز سسکیاں بننے لگی۔ آنسو پونچھتے ہوئے وہ پھر گویا ہوئیں: "میں نے زندگی بھر کسی کا دل نہیں دکھایا۔ کسی کو ستایا نہیں۔ بلکہ میں نے تو زندگی کا بیشتر حصہ لوگوں کی تکلیفیں رفع کرنے کی کوشش میں گزارا ہے ——— پھر میں نے اس خدا کو، اس عظیم قوت کو ——— اس خالق کو ——— رنج میں، دکھ میں، خوشی میں، پریشانی اور کسی بھی حالت میں دل سے جدا نہیں کیا۔"

سسٹر نے آنکھیں موند لیں۔ اس وقت ان کی سانس بڑی تیز تیز چل رہی تھی پیشانی پر بے شمار سلوٹیں ابھر اور مٹ رہی تھیں۔ اور ہونٹ انہوں نے دانتوں میں دبوچ لئے تھے۔

مادام جے سوری نے اپنے نحیف و نزار جسم کو جنبش دی اور آہستہ آہستہ کرسی سرکا کر سسٹر کے قریب ہو گئیں۔ سسٹر کی کلائی پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے کہا: "حوصلہ کرو میری بچی۔ تم آج بھی اسی خدا کو پکارو ..... جس سے تمام زندگی تم نے مدد مانگی ہے۔ اب بھی اسے ہی پیشِ نظر رکھو۔ وہی دکھ کو سکھ کی شکل دے سکتا ہے۔"

"نہیں ——— سسٹر کی آواز میں جوش تھا۔ میں اس وقت ایسی باتیں نہیں سوچ سکتی۔ مجھے تو اس وقت سرطان کے اس مریض کے الفاظ سنائی دے رہے ہیں۔ جس نے اپنی زندگی کی شمع بجھنے سے چند لمحے پہلے مجھے کہا تھا۔ "مجھے یہ سب کچھ ڈھونگ نظر آتا ہے۔ اول تو اس طاقت کا وجود ہی نہیں۔ اور اگر ہے۔ تو وہ آسمانوں زمینوں کو پیدا کرنے والا رحم دل نہیں۔ وہ تو پہاڑ جیسا دل رکھتا ہے۔ اس کے دل میں نہ رحم ہے نہ درد۔ میری حالت اس سے بھی تو نہ ہوگی۔ اگر وہ رحم دل ہے۔ تو مجھ سے زیادہ رحم کا مستحق کون ہو سکتا ہے ———" مادام جے سوری نے سسٹر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "وہ یقیناً سرطان کی وجہ سے پاگل ہو گیا تھا۔ تم تو پاگل نہیں۔ تم اس کے الفاظ کیوں دہرا رہی ہو۔ ہوش میں آؤ۔ اور خاموش رہو۔ میں چراغ لاتی ہوں۔ سامنے رکھ کر خدا سے معافی مانگو اس طرح کی باتیں تمہاری تکلیف کے ساتھ ساتھ میرے لئے بھی عذاب کا باعث ہوں گی۔ . . . بیٹیا ذرا بڑا چراغ اٹھا لاؤ اندر سے . . . . ." آخری جملہ انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا!"

میں چراغ لے آیا تو مادام جے سوری نے اُسے سامنے رکھ کر اُس کے چاروں طرف پھول رکھے۔ اور ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی رہیں۔ پھر آنکھیں کھول کر سیسٹر سے کہنے لگیں " تم بھی دعا کرنا " دیوتا تمہارے سامنے ہے " سیسٹر نے اُن کی بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ " میں پانی پیونگی۔ مجھے پانی پلاؤ "

میں پانی کا گلاس لے کر اندر آیا۔ تو انہوں نے اُٹھنے کی معمولی سی کوشش کی۔ بیمار ہونے کے بعد یہ پہلی کوشش تھی۔ جو سیسٹر اٹھنے کے لئے حد کر رہی تھیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو اُٹھ کر بیٹھ جانے کا احساس ہی انہیں رُلا دیتا تھا۔ مگر جانے اِن میں کون سی طاقت آگئی۔ کہ وہ میرے اور تکیئے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

مادام جے سوری کے ہونٹ مسرت سے پھیلتے جا رہے تھے۔ شاید وہ اِسے اپنی دعا کا کرشمہ سمجھ رہی تھیں۔

سیسٹر نے پانی کا گلاس خود ہاتھوں سے تھام کر لبوں سے لگایا۔ اور ایک سانس میں آدھا گلاس پی گئیں۔

پھر انہوں نے عجیب وحشتناک نگاہوں سے چراغ کو گھورنا شروع کر دیا۔ اِس چراغ کو انہوں نے آج تک دن رات پوجا تھا۔ اِس کے سامنے دُعائیں اور التجائیں کی تھیں۔ اِس آگ کو دیوتا مانا تھا۔ خدا کا رُوپ کہا تھا۔ بار بہلائے تھے۔ مکان کے ہر کمرے میں اُس کے رُوپ کو زندہ رکھا تھا جو خدا کا روپ اور زرتشت کی تعلیم تھا۔ اور جسے انہوں نے بچپن سے آج تک بُجھنے نہ دیا تھا۔ انہوں نے اِس بڑے سے چراغ کی سنہری لَو کو دو ایک بار ہاتھ سے چھُوا۔ اور پھر تڑپ کر گلاس کا بچا ہُوا پانی اُس پر گرا دیا۔

" تم سیاہ پردوں کو ہٹا کر حقیقت دیکھنا چاہتے ہو
مگر تمہیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوگی کہ حقیقت خود
سب سے زیادہ سیاہ پردہ ہے "
(دریسان)

رشید انور

محور

ماجو جب شاہ گنج سے چھاؤنی کے لئے دو سواریاں حاصل کر چکا تو اس کی ماند آنکھیں کچھ دیر کے لئے چمک گئیں اور ابھرتے ہوئے دن کی روشنی میں مسرت کے ہلکے ہلکے نقوش اس کے چہرے پر اُبھر آئے۔ شاہ گنج کے کلاک ٹاور سے بل کھاتی ہوئی سڑک پر اب زندگی جاگ اٹھی تھی جو اس جاگتی ہوئی زندگی سے بے نیاز آہستہ آہستہ چوک سے اُبھرنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں ساکت پیڈلوں پر جما دیئے تاکہ اسے بڑ پل کے چڑھاؤ پر زیادہ تھکن کا احساس نہ ہو لیکن بڑ پل کے چڑھاؤ نے اسے پسینہ پسینہ کر دیا اور جب وہ جوبلی پارک سے مڑتی ہوئی سڑک پر ہو لیا تو اسے یہ احساس شدت سے ہونے لگا کہ وہ رات سے خالی پیٹ ہے زور زور سے پیڈل مارنے کی وجہ سے اس کی سوکھی سوکھی پنڈلیوں میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور وہ اپنے ہونٹوں کو سکیڑ کر ان کی لذت ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ جب بھی وہ سواریاں پاتا تو فطری طور پر اس کی نظر سواریوں کا ناپ تول کرنے لگتی لیکن آج جب یہ دو مارواڑی اس کی رکشا پر آ بیٹھے تو ہوٹلوں کی فضا سے اٹھتی ہوئی چائے کی فرحت بخش اور توانا خوشبو نے اس کے دل و دماغ کو اسیر کر لیا اور وہ دونوں مارواڑیوں کے وزن کا ناپ تول کرنا نظر انداز کر گیا۔ شاہ گنج سے چھاؤنی تک مسلسل چڑھائی چڑھنے کے بعد وہ کبھی اس قابل نہ رہتا کہ جلد ہی دوسری سواریاں لے جا سکے۔ وہ اب مل کر ہموار سڑک سے گزر کر سلینڈ کالج کے داخلی چڑھاؤ پر ہو لیا تھا۔ اس کا سارا زور بڑ پل کی جان لیوا چڑھائی کی نذر ہو چکا تھا اس لئے پیڈل پر پیر رکھ کر اتر پڑا اور چل کر رکشا کھینچنے لگا دونوں مارواڑی سواریاں اپنے کوٹوں کے دامن پیروں کے درمیان اور ماتھوں کے آہنی جالے میں دبائے اونگھ رہی تھیں اور سامنے ہی چھاؤنی کی آبادی کے نقوش دھندلکے میں ڈوبے نظر آ رہے تھے۔ اس کے عقب میں کہر میں ڈوبے ہوئے دن نے جیسے اس کے پیروں میں جان ڈال دی اور اترائی پر جب اس کا رکشا پھسلنے لگا تو اس نے دونوں پیڈلوں پر جمتے ہوئے پیروں کو روک کر کھچڑی بالوں سے بھیگتے ہوئے پسینے اور جھریوں سے اٹے ہوئے رخساروں پر آئی ہوئی دھول کو کوٹ کے پھٹے اور چکٹ آستین سے صاف کیا۔ گاندھی چوک کے چوراہے پر سواریوں دیکھ کر اس نے رکشا اڈے پر لا کھڑا کیا اور اڈے کے سامنے والے 'ملباری کی ہوٹل' کی طرف قدم بڑھائے۔ ہوٹل کا ملباری مالک روزانہ کی طرح آج بھی کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا اور دو چار مل مزدور کرسی کے کنارے ادھر ادھر میزوں کے اطراف بیٹھے گڑ کی پھیکی چائے چسکیاں لے لے کر پی رہے تھے۔ اپنی بڑھتی ہوئی بھوک کو قابو میں رکھنے کی خاطر ماجو نے بھی ایک کپ چائے اپنے جلتے ہوئے پیٹ میں انڈیل لیا چائے کا ایک آنہ دے کر اسے باقی پیسے گھر پر دینے تھے کیونکہ کل شام سے اس کا چولہا ٹھنڈا تھا — — —

ماجو اگروال سیٹھ کی رکشا پر کام کرتا تھا۔ اس کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اگروال سیٹھ کے یہاں گزر رہا تھا۔ ماجو کا باپ ہارون بھی اگروال سیٹھ کا نوکر تھا۔ وہ بھی ماجو کی طرح بہت محنتی تھا اور بالکل ماجو ہی کی طرح اپنی اولاد کی بھلائی کے بارے میں سوچا کرتا تھا لیکن اسے موت نے قبل از وقت آن دبوچا اور ماجو کی کتاب درجہ تختی کا آدھا ٹانڈا طاق میں پڑا رہا اور اس پر گرد کی تہیں چڑھتی رہیں اور ماجو اگلے روز سے ہوٹل کے برتنوں اور میزوں کی گرد صاف کرنے لگا۔ رکشا چلانا شروع کرنے سے پہلے اُس سے آرام اور خوشی کا وہ رہا سہا اثاثہ بھی چھن گیا جو اس کے باپ نے اسے سونپا تھا۔ اور اب وقت کی راہ پر آوارہ گرد کی طرح بھٹک رہا تھا۔ گھر سے نیٹ (TARA) نکلے ہوئے صاحب لوگوں کو اپنی سوکھی ٹانگوں سے زور زور سے پیڈل مار کر وہ انہیں جب منزلِ مقصود پر جا چھوڑتا تو اسے کرایہ کے علاوہ کچھ نذرانہ بھی مل جاتا۔ اس دن تو بغیر دقت کے گزر جاتا لیکن جس دن اسے دن بھر کی تگ و دو کے بعد چند ٹکوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ ملتا تو اس کے بچے بھوکے سو جاتے

اس کی بیوی آہستہ آہستہ چڑچڑی رہتی اور وہ کئی رات تک کروٹیں بدلتا رہتا۔ اکثر ایسا ہی ہوتا آیا تھا اور برسہا برس بیت گئے تھے۔ گھر میں اس کی چڑچڑی بیوی اور تین بچے تھے۔ سب سے بڑی ہاجرہ، نو سال کا قمبر اور ننھی زینو۔ ماجو نے تین سال پہلے قرض کا اذیت ناک طوق اپنی گردن میں پہن کر اپنی بیٹی ہاجرہ کو بھیگی آنکھوں سے رخصت کر دیا۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ دین محمد تقی کے ہاتھ میں دے کر وہ بہت خوش تھا اسے اس بات کا شبہ تک نہ تھا کہ وہ اپنی عزیز بیٹی کا دامن ایسے کانٹوں میں اُلجھا رہا ہے جو اس کا دامنِ حیات لہو لہان کر دیں گے۔ اپنی ڈھائی سال کی گھریلو زندگی میں ہاجرہ کا شرابی شوہر اُسے کبھی سُکھ نہ دے سکا تو ماجو نے اُسے اپنے میکے کی طرح سمجھایا۔ لیکن بات جب بھی نہ بن سکی تو نوبت مار پیٹ تک آ پہنچی اور اب ہاجرہ چھ مہینوں سے اپنے شوہر کو چھوڑ کر باپ کے گھر بیٹھی ہوئی تھی اور اب پھر اس کے تیسرا بچہ ہونے والا تھا۔ ہاجرہ کی ڈبڈبائی آنکھوں اور اس کے بھوک سے بلبلاتے بچوں سے نظر چُرا کر ماجو جب اپنے اسکول جاتے ہوئے بچے قمبر کو اُس کے پھٹے اور میل سے اَٹے ہوئے کپڑوں کی جانب دیکھتا تو اُسے یہ احساس شدت سے ہونے لگتا کہ وہ اب تھک سا گیا ہے۔ زندگی کے عمیق سمندر میں اپنی کشتی کھینے سے اُس کے بازو جیسے شل سے ہو گئے ہیں۔ لیکن قمبر جب بڑے پیار سے اس کی گود میں آن دھمکتا اور اپنی مُڑی تُڑی کتاب سے یاد کیا ہوا سبق اونچی آواز میں سناتا تو ماجو کے دل میں ایک چنگاری سی بھڑک اٹھتی اور قمبر کے محور پہ گھومتی ہوئی ساری آرزوئیں اور امیدیں اُس کے دل میں نیا عزم پیدا کر دیتیں۔ . . . .

طباری سیٹھ کو پیسے دینے کے بعد بیڑی سلگا کر وہ باہر نکل گیا۔ اڈے پر بہت سے رکشا آ چکے تھے تھوڑی ہی دور رشید، کرم، بالم، کریما اور چھوٹو بیٹھے باتیں کر رہے تھے وہ آہستہ آہستہ چلتا ان میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اُن کی گفتگو کا موضوع "سرنگل" "مدھوبالا" "بین چلتی کوئی گھٹیا سی فلم تھی۔ ان کی گفتگو سے الگ تھلگ جب وہ بہت دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا تو بالم نے اُس سے پوچھا ——— "کیوں رے . . . چاؤ کھیل نہیں دیکھا تو نے۔ ؟" ماجو نے دم توڑتی ہوئی بیڑی کو پرے پھینکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ بالم نے اپنے اکھڑ لہجے میں کہا —— "تو تو اپنی سونے جیسی جندگی کھراب کر رہا ہے یار۔ سدا اُلٹی بھکریں مول لیتا ہے۔ دین محمد سے بے کار ڈ بیٹھا ہے اور اب اپنی بیٹی کو چھاتی پر لئے بیٹھا ہے ——— " بالم بمبئی سے دھندا کرنے کے بعد جب واپس آ گیا تو اُس میں پہلے کے مقابلے میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں۔ کمانا۔ کھانا اور ہاتھ دھو کر بیٹھ رہنا اور نہ ملے تو دوسروں کا مال کھا لینا یہ اُس کا نظریہ تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے گھٹنوں پر سر دیئے بیٹھا رہا۔ لیکن اڈے پر لگے ہوئے سینما کے بورڈ نے اُسے پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس نے بورڈ پر عُریاں سی تصویر کو دیکھ کر کریما سے کہا۔ ——— "پر یار کل رات تو اپن کا کھوپڑی ہو گیا ——— کیا ڈانس کرتی ہے سالی!! ۔ اس نے بورڈ پر بنی ہوئی تصویر کے نقوش کو اپنی نگاہوں میں بھر لینا چاہا ——— "قسم ہے نیلی چھتری والے کی تو اگر ایک بار دیکھ لے تو پاگل ہو جائے سالے اسی لئے تو اپن کی کل والی اگلی رات انجی بائی کے گھر گذری " اور وہ اپنے میلے دانت نکال کر زور زور سے ہنسنے لگا لیکن اس کی بھدی ہنسی میں اچانک بریک سے لگ گئے۔ ——— رات اُس کمینے نے جیب جھٹک لی یار ابھی اپن کے کھانے کا ٹکڑا ہے —— اور یہ سالا اپن کو بولتا ہے پیسہ دو چار روز سے بھوکا ہے۔ اپن کیا تمہارے باوا کا نوکر ہے جو پیسہ دیگا۔ —— ؟" اُس کے لہجے کی اچانک تبدیلی پر ماجو نے تعجب سے پوچھا —— "کیا ہوا رے بلمو ——— " بالم نے اڈے سے دور گھنے نیم کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— "وہ سالا اپن سے چار آنے اُدھار مانگتا تھا —— " اور اُس نے ایک بڑی سی گالی اگل دی۔ ماجو نے نظریں دوڑائیں نیم کے گھنے پیڑ سے لگے ہوئے بڑے سے پتھر پر گھٹنوں میں سر دیئے کوئی بیٹھا تھا۔ ماجو نے اپنی دھندلی دھندلی آنکھوں سے تھوڑی دیر تک نیم کے پیڑ کی طرف دیکھتا رہا پھر اُس کے دل میں رحم کی ایک چنگاری سی سُلگ اُٹھی اور اس نے بالم سے کہا ——— "یار تو تو سدا کا ڈاکو ہے۔ اُس بیچارے کو گڑ نہ دیتا پر گڑ جیسی بات ہی کر دیتا" بالم نے منہ پھیر کر پیچ سے پان کا پیک تھوکا —— "ارے جا جا —— بڑا آیا تو بھی اس کی طرفن لے کر۔ سالا اچھا اُس ایرانی سیٹھ کی ہوٹل میں کام کرتا تھا اُس پر چاتو نکال بیٹھا۔ پولیس نے بند کر کے وہ جوتے لگائے کہ بچو کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا —— " اس نے رک کر گلے میں بندھی ہوئی رسی کی گانٹھ مضبوط کی —— "پھر کے مرتے ہیں سالے پر رعب دکھاتے ہیں ——" ماجو اپنا خواب مردہ لئے اپنی کمزور آنکھوں سے چپ چاپ نیم کے گھنے پیڑ!

طرف دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے اس کے ذہن میں ایک تصویر رینگ آئی۔ صبح جب وہ بیڑ کل گیٹ پر سواریاں لے کر پہنچا تھا تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ رکشا روک کر تھوڑا سا پانی پی لے تاکہ بھوک سے چپکے ہوئے پیٹ میں اٹھتی آگ کی لپٹیں کچھ سرد ہو جائیں۔ اُس نے کل رات ہی سے کچھ نہ کھایا تھا۔ لیکن اُس لڑکے کا کیا حال ہو رہا ہوگا جو چار روز سے بھوکا ہے۔ —— پیڑ کے نیچے بیٹھے ہوئے لڑکے کو دیکھ کر اُس کے دل میں ہوک سی اُٹھی اور اُس نے بالم کے کندھے پر اپنا کھردرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا —— "بلمو کیسا ہے رے تو —— ؟ وہ لونڈا ادرک گیر تھوڑی ہے۔ ؟ ارے گریب تو سب ایک ہوتے ہیں ایک۔ بالم ماجو کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ لیکن ماجو کے جھریوں والے چہرے سے سنجیدگی جھانکتی رہی۔ —— "ارے اب تو ہنسی میں کیوں ٹالتا ہے دھنا سیٹھ کے رکشا والے بانکے نے جب اُس موڑ اسی سواری پر چاقو نکالا تھا تب تو نے ہی تو کہا تھا کہ سالا روپیہ پیسے کے معاملے میں لوٹ رہا تھا اچھا کیا جو بھونک دی۔ اب اگر اس ایمانی سیٹھ نے اُس کی محنت کے پیسے نہ دیئے ہوں تو اُس نے چاقو نکال کر کون سا برا کام کیا —— کیا وہ بھوکا مر جاتا —— ؟" ماجو آہستہ آہستہ بڑبڑاتا رہا۔ بیڑی کا کثیف دھواں چھوڑتا ہوا نیم کے گھنے پیڑ کی طرف چل پڑا۔ اور جب اُس نے قریب پہنچ کر اسے دیکھا تو ماجو کو یاد آیا کہ وہ ہمتی ہے ماجو نے اُسے شاہ گنج کے کئی ریسٹورنٹ میں دوڑ دوڑ کر کام کرتے اور چیخ چیخ کر بولتے دیکھا تھا۔ قریب بیٹھ کر جب ماجو نے اُس کی بے جان اداس سی آنکھوں میں نظریں دوڑائیں تو اس کے دل میں اُبھرتی ہوئی ہمدردی کا احساس پھیل کر اور وسیع ہوگیا۔ ہمتی کی آنکھیں خاموش خاموش سی تھیں لیکن اُن سے پھوٹنے والی روشنی میں زہر کا امتزاج تھا۔ اُس کے چہرے کے بھدے اور غیر مانوس خدوخال سے سدا ایک احساس جھلکتا محسوس ہوتا۔ جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اس کی ماں اُسے ہنستا کھیلتا اور خوش و خرم دیکھنا چاہتی تھی لیکن جیسے جیسے اُس نے رینگنا شروع کیا رینگ کر تتلانے لگا۔ اور ماں کی گود سے اُٹھ کر محلے کے بچوں کی صحبت کا دلدادہ ہوتا گیا۔ اُسے "حرامی" کا لقب ملا اور چند دنوں بعد وہ اس کا مطلب اچھی طرح جان گیا اور وہیں سے اُس کے دل میں نفرت کا جذبہ آگ پکڑتا گیا اور یہی جذبہ کھیل کود اور بچپن کی راہ سے ہٹ کر انگارہ بنتا گیا۔ اور بچپن کی معصوم زندگی کو پیچھے چھوڑ کر جب اُس نے جوانی کی پُرجوش زندگی میں قدم رکھا تو اُس نے اپنے دل میں ہر انسان کے لئے نفرت اور بغاوت کا جذبہ موجود پایا —— ایک دن اُس کی ماں نے بھی اپنی آنکھیں بند کرلیں تو وہ کئی دن تک روتا اور اپنا سر ٹکراتا رہا۔ اُن دنوں اس کا دل چاہتا کہ ہر اُس شخص کو کچا چبا ڈالے جو اس کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالے اور ایسے ہی وقت کئی ریسٹورنٹ کے مالک سے وہ معمولی سی بات پر الجھ پڑا اور اُس پر چاقو نکال بیٹھا اور پولیس اُسے دھر لے گئی۔ "کب آئے بھیا چھوٹ کر —— ؟" ماجو نے اسے پیار سے پچکارتے ہوئے پوچھا۔ ہمتی نے اپنے خزاں رسیدہ پتے کی طرح جھلسے ہوئے چہرے کو اوپر اُٹھا کر نحیف آواز میں کہا ... "کل شام" اور اپنے پیر کے انگوٹھے سے زمین کی مٹی کریدنے لگا —— "کام نہیں دیکھا تم نے کوئی —— ؟" اور پھر جیسے اُس کی ڈبڈبائی آنکھوں نے ماجو کے سوال کا جواب دے دیا وہ تلخی سے بولا ... "ہاں۔ اب یہ سالے مجھے کام بھی نہ دیں گے پولیس والوں کی کتاب میں کسی کا نام آجائے تو سالے اس سے ایسا ڈرتے ہیں جیسے وہ اس دنیا کا آدمی ہی نہیں ——" وہ بیٹھا تھوڑی دیر تک آہستہ آہستہ بڑبڑاتا رہا پھر اُس نے پتھر پر دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھے ہوئے ہمتی کا بازو پکڑ کر کھڑا کیا۔ اور اس کی کمر میں سہارا دیئے آہستہ آہستہ ملباری کی ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا۔

ملباری کی ہوٹل میں ہمتی کو کھانا چھوڑ کر وہ باہر چلا آیا۔ کیونکہ اُسے ابھی دوسری چکر کے لئے سواریاں ڈھونڈنی تھیں۔ اُس نے ایک سرسری نظر اڈے پر ڈالی۔ بہت سے رکشا اڈے پر آچکے تھے۔ بالم دو سواریاں لئے اسٹیشن روڈ کی طرف چل پڑا تھا۔ اور کریما اپنے رکشا میں ایک سواری بٹھائے دوسری سواری کے لئے چاروں طرف گہری گہری نظروں سے تاک رہا تھا۔ کبھی کبھار اُس کی آواز "ایک سواری ہے —؟ شاہ گنج .... شاہ گنج" اڈے کی طویل خاموشی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی۔ ماجو نے اپنی ختم ہوتی ہوئی بیڑی کا آخری کش لے کر ایک طویل انگڑائی لی اور اپنے رکشا کے قریب آ رکا۔ اُسی لمحے کریما گلی سے نکلنے والی مارواڑی سیٹھ کی طرف جھپٹا —— "کدھر جینگا سیٹھ —— گھنٹہ گھر —؟ پھول کٹرک —— چوک —— شاہ گنج —— ؟ ....." وہ رٹے رٹائے ناموں کی گردان کرنے لگا لیکن مارواڑی سیٹھ اُسے نظر انداز کر کے ماجو کے رکشا کی طرف بڑھ گیا اور کریما مایوسی سے سر کھجاتا آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ تمام رکشا والے اُس ٹکڑا، کرایہ دینے والے مارواڑی کی طرف جھپٹتے لیکن وہ سب کو مایوس چھوڑ کر ماجو کی طرف بڑھ جاتا۔ ماجو مارواڑی سیٹھ کو دو سال سے جانتا تھا۔ پہلی بار جب وہ اُس کے رکشا میں بیٹھا تو شہر پہنچنے تک بارش شروع ہو گئی اور جلدی میں مارواڑی سیٹھ اپنا بٹوہ رکشا میں بھول گیا۔ ماجو نے اُسے کھول کر دیکھا اُس میں بیس بائیس روپئے، رنگ سپیاری کے علاوہ حساب کتاب کے دو چار کاغذ بھی تھے۔ اُس نے وہ بٹوہ لے جا کر مارواڑی سیٹھ کی دکان پر واپس کر دیا۔ وہ اپنی ایمانداری پر اُس دن بہت خوش تھا۔ اُسے اس کا قطعی افسوس نہ تھا کہ مارواڑی سیٹھ نے بٹوہ واپس کرنے پر اُسے سوائے اپنی مسکراہٹ کے کچھ اور نہ دیا تھا۔ اور نہ اُسے اس بات کا ہی دُکھ تھا کہ اُس کی اس ایمانداری پر اُسے اپنے یار بالم کی بہت سی گالیاں کھانی پڑی تھیں

مارواڑی سیٹھ کو لئے اُس کا رکشا آہستہ آہستہ سمنٹ کی چکنی سڑک پر پھسلتا رہا۔ دھوپ کی چمک میں تیزی پیدا ہو گئی تھی۔ رنگ برنگے کپڑے پہنے گلوں میں بستے لٹکائے اسکول جاتے خوبصورت سے بچوں پر سے جب ماجو کی مسلسل دھندلائی آنکھیں گذرنے لگیں تو اُسے دور کہیں اپنی مشکلوں اور پریشانیوں کا حل نظر آیا ـــــ وہ اُس کا شبو تھا، ماجو کی دھندلی آنکھوں کا نور۔ جب وہ ترنم ریز آوازمیں "آم ۔ ۔ ۔ ۔ وہ آم ۔ ۔ ۔ ۔" سے لے کر "چندا ماموں دور کے" تک سناتا تو ماجو کو اپنے رگ و پے میں خوشیوں کی سرسراہٹ سی محسوس ہوتی۔ شبو چھاؤنی کے اسکول میں ابھی چوتھی میں پڑھ رہا تھا۔ ماجو کی بہت بڑی خواہش تھی کہ وہ کچھ پڑھ لکھ لے۔ شبو بہت محنتی اور ذہین تھا۔ جب اچھا خاصا اندھیرا چھا جاتا اور ماجو اگروال سیٹھ کے گھر رکشا چھوڑ کر تھکے تھکے قدموں سے گھر آتا تو گھر میں سب بچے آڑے ترچھے شطرنجا کے پھٹے ہوئے ٹکڑوں اور میلی کچیلی بوسیدہ سی رضائیوں کے نیچے پڑے سوتے رہتے لیکن شبو بیٹھا قندیل کی ٹمٹماتی روشنی میں اپنی کتابیں پڑھتا رہتا۔ اُسے پڑھتے دیکھ کر ماجو کی تمام تھکن دور سی ہونے لگتی اُس کی بوڑھی سی کمزور ہڈیوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی اُس کا جھرّیوں والا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھتا اور وہ چپ چاپ آ کر شبو کے پاس بیٹھ جاتا۔ شبو پڑھتے پڑھتے اُس کی طرف اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھ کر پوچھتا ـــــ "کھانا کھا لیا بابا ۔ ۔ ۔؟" "کھاؤں گا بیٹا ـــــ!" ماجو مسکرا کر جواب دیتا اور شبو نظریں جھکا کر پھر پڑھنے لگتا ـــــ "خوب محنت کر بیٹا!" اور بیٹا کتاب پر نظریں جمائے باپ کو یقین دلاتا ـــــ "ہاں بابا ضرور پاس ہو جاؤں گا ـــــ پر ایک بات پوچھوں ـــــ" وہ ماجو کی دھندلی آنکھوں میں دیکھنے لگتا ـــــ "ہاں ۔ ہاں ۔ کیا بات ہے ـــــ" اشتیاق سے ماجو تھوڑا اس کی طرف جھک جاتا ـــــ "میں جب بڑا ہو جاؤں گا۔ جب خوب پڑھ لکھ لوں گا۔ یہ بازو والے صاحب کی طرح،" ماجو کے ذہن میں اپنا پڑوسی پروفیسر رینگ آتا ـــــ "تو بابا ـــــ تو تم رکشا چلانا چھوڑ دو گے نا ـــــ؟" ـــــ اور وہ نیچی نظریں کئے پنسل سے زمین پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے لگتا اور ماجو اُس سے بڑے تعجب سے پوچھتا ـــــ "کیوں رے ـــــ یہ رکشا چلانے میں کیا برائی ہے" "برائی تو کچھ بھی نہیں ـــــ پر ماں اُس دن آپا سے کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر نے تم کو رکشا چلانے سے منع کیا ہے ـــــ کیونکہ جب تم رکشا چلاتے ہو تو تمہارے منہ سے خون گرتا ہے ـــــ گرتا ہے نا بابا ـــــ؟" ماجو اُس کے سوال کو نظر انداز کر کے چپ چاپ اُس کی طرف تاکتا رہتا ـــــ "اگو کے ابا بھی تو رکشا چلاتے تھے۔ اُن کے منہ سے بھی خون گرتا تھا ـــــ دو ماہ ہوئے وہ مر گئے ـــــ" وہ معصوم انداز میں اپنا ڈر بیان کر دیتا ماجو اُسے تسلی دینے کے لئے اپنے سوکھے بازو اکڑا اکڑا کر اُس کی آنکھوں کے سامنے کرتا۔ "دیکھو تو ابھی ان میں کتنا دم ہے ـــــ اور وہ اگو کا باپ تو سدا بیمار رہتا تھا ـــــ اور خوب تاڑی پیتا تھا ـــــ اور دیکھو بیٹا ـــــ" وہ جذباتی ہو جاتا ـــــ "برائی کا نبھاؤ دنیا میں زیادہ دن تک نہیں ہو سکتا ـــــ برائی جلد فنا ہو جاتی ہے ـــــ اور وہ بُرا تھا اس لئے مر گیا ـــــ لیکن بیٹا تجھے نیک اور اچھا بننا ہے۔ جیسے یہ بازو والا کالج کا ماسٹر ہے نا ـــــ!" اور وہ بہت دیر تک اگو کے باپ کی کمزوریاں اور کالج کے ماسٹر کی اچھائیاں بیان کرتا رہتا اور پھر ہاتھ بڑھا کر شبو کا معصوم سا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ـــــ "لیکن راجہ، جب تم خوب پڑھ لکھ لو گے اور کسی اچھی سی جگہ نوکر ہو جاؤ گے ـــــ تو میں سب کچھ چھوڑ دوں گا۔ بس مزے سے گھر میں بیٹھ کر حقہ گڑگڑایا کروں گا ـــــ" اور پھر جذبات سے بے قابو ہو کر وہ شبو کو اپنی گود میں بھینچ لیتا۔

جس دن شبو کامیاب ہوا ماجو کے نقرہ لعنت گندے گھر میں کچھ دیر کے لئے خوشیاں تھرکنے لگیں اور اس دن ماجو نے اپنا رکشا ہمتی کے حوالے کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ آج وہ صرف گھر رہ کر رہے، خوب باتیں کرے، خوب قہقہے لگائے کیونکہ اس کا بیٹا کامیاب ہو گیا تھا اس کے تاریک مستقبل میں ایک شمع اور جل اٹھی تھی۔ یہ شمعیں ایک دن ان مہیب اندھیاروں کو ضرور تسخیر کرلینگی جو اُن کی زندگیوں میں چھائے ہوئے ہیں۔ ان شمعوں سے ایک دن ضرور آسودگی کی کرنیں پھوٹیں گی ایک دن شبو ضرور انہیں زندگی کی تاریک پگڈنڈیوں سے اُجالے کی طرف کھینچ لے جائیگا۔ اور وہ دن ------ ہا! ہا! - وہ دن کیسا عجیب اور انوکھا ہوگا ؟؟

صبح سے لے کر شام تک سواریاں ڈھونڈنا ، اپنی سوکھی ٹانگوں سے زور زور سے پیڈل چلا کر انہیں اُن کی منزلِ مقصود پر پہنچا دینا اور دن بھر کے گاڑھے پسینے کی کمائی اگروال سیٹھ کے ہاتھ میں تھما دینا جیسے ماجو کی زندگی کا ایک مثلث بن گیا تھا اور اب وہ ہمتی کا بوجھ بھی اپنے کمزور کندھوں پر محسوس کرنے لگا تھا۔ ہمتی ماجو کا رکشا صاف کردیا کرتا اور اس کے ساتھ ملباری کی ہوٹل میں چنے کی اُبلی ہوئی دال اور کچے پکے چاول کھانے کے بعد بازار میں دوڑ دوڑ کر سواریاں ڈھونڈنے نکل پڑتا۔ اور جس روز ماجو حد سے زیادہ تھکن محسوس کرتا ہمتی اُس کا رکشا لے کر آس پاس کے اڈوں تک سواریاں چھوڑنے بھی چلا جاتا اور رات اڈے پر پڑا رہتا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے چند دنوں سے پھر اُس کے منہ سے پھر خون آنے لگا تھا۔ ایک دن جب وہ شاہ گنج سے سواریاں لے کر اڈے پر پہنچا تو دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے اور چکراتے ہوئے سر کو لئے وہ رکشا کا پہیہ تھامے گھڑی بھر دم لینے کے لئے بیٹھ گیا لیکن چند ہی لمحوں بعد وہیں بیٹھے بیٹھے اُس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا بالم سواریاں چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف جھپٹ پڑا۔ سر کے نیچے رکشا کی گدی رکھنے کے بعد اُس نے ملباری کے چھوکرے سے پانی منگوا کر ماجو کے چہرے پر چھینٹے دیئے اور تھوڑی دیر بعد ماجو کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اُس کی کمر میں ہاتھ دیئے آہستہ آہستہ چلاتا وہ اُسے ملباری کی ہوٹل میں لے آیا۔ کمزوری اور چکر ماجو کو تب بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے چکراتے ہوئے سر کو دونوں ہاتھوں کی ٹیڑھی میڑھی اُنگلیوں سے دبائے بینچ پر کہنیاں ٹیکے بیٹھا رہا۔ اُس بالم نے ہمدردی اور غصہ کے ملے جلے احساس سے اُسے گھور کر کہا ------ " سالے تو اسی طرح ایک دن مر جائیگا۔ اڈے پر دن بھر وہ سروں کو سسک پڑھاتا ہے اور گھر سالا ایسی بچے کے پیچھے بھاگتا ہے۔ جو ہم رکشا والوں کے مقدر میں نہیں ------ ارے یہ بھی کوئی غریبوں کے چھوکروں کے لکھنے پڑھنے کا کام ہے ------ ؟ اور تو ہے جو اپنی اور اپنے لونڈے کی جندگی برباد کرنا چاہتا ہے ------ " اُس نے رک کر بیڑی کا ایک گہرا کش لیا ------ " وہ کشمیر ہوٹل والا سیٹھ بولتا تھا۔ اسے ایک چھوٹے چھوکرے کی جرورت ہے۔ کل سے بھیج دے شبو کو۔ بارہ آنے روز دیگا۔ لونڈا کمانے بھی لگے گا اور تجھے اتنی محنت بھی نہیں کرنی پڑے گی۔"

اور باوجود برداشت کے ماجو کو بہت غصہ آیا ------ " ارے بدھو تو سالا نیچی بات کیوں سوچتا ہے ------ ؟؟ " اُس نے اپنے جھناتے ہوئے سر کی پرواہ کئے بغیر تیز لہجے میں کہا۔ اور بالم زور زور سے ہنسنے لگا ------ " ارے ان بڑے لوگوں کی باتوں پر نہ جا۔ تو نے اتنی دنیا دیکھی پر تو کچھ بھی نہ جان سکا۔ ہماری زندگی کبھی سدھر نہیں سکتی۔ سب بے کار ہیں تیرے یہ سپنے ------ " ماجو کا جی چاہا اپنی دوستی کو پسِ پشت ڈال کر ایک زناٹے کا تھپڑ بالم کو دے مارے پر وہ خاموش ہی رہا۔

وہ جب گھر پہنچا تو سب بچے کوڑے کرکٹ کی طرح پھیلے سو رہے تھے وہ کچھ دیر بیٹھا اُن کے چہروں کو تاکتا رہا اور پھر کوٹھری کے ایک کونے میں چپ چاپ جا پڑا۔ اُس رات سے پہلے جب کوئی بچہ بھوک کی تاب نہ لا کر بیچ اٹھتا تو اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھتی اُسے اپنی حالت پر بڑا دکھ ہوتا اور پھر آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے اُس کی لرزتی ہوئی پلکوں سے بہتے ہوئے جھریوں دار رخساروں پر ڈھلک پڑتے۔ لیکن اُس رات اُن کی دبی دبی کراہوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس رات اس کی بیوی ہمیشہ کی طرح آہستہ آہستہ بڑبڑاتی رہی۔ شبو اور نینو زمین پر ہاتھ پیر پٹختے رہے اس کی بڑی بیٹی بھوک سے تڑپ تڑپ کر اُٹھنے والی اپنی ننھی سی جان کو کھینچ کھینچ کر ماتا کی آغوش میں بھیجتی رہی۔ لیکن وہ اُن سب سے بے نیاز اپنے خیالات کے تانوں بانوں میں اُلجھا رہا اُس کے خیالات اُس رات شبو کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ اور ------ " اچانک بالم اُسے اُس خوبصورت دن کے تصور سے واپس کھینچ لایا ------ " سوچ کیا رہا ہے رے

تو ـــ بابو صاحب لوگوں کو اور اُن کی باتوں کو چھوڑ کر اپنی بات مان جا اور کل سے لونڈے کو بھیج دے ـــ" اور اُس کی تیز ہنسی ملباری کی گھٹی گھٹی سی ہوٹل میں زہر کی طرح پھیلتی چلی گئی اور ماجرہ وہاں سے چپ چاپ چلا آیا۔ اُس نے کئی روز تک بالم سے بات نہ کی اور چپ چاپ سا اپنی زندگی کے مثلث کے گرد بھاگتا رہا۔ لیکن اس دن وہ چونک پڑا اور اُس نے اپنی تمام خفگی چند ہی لمحوں میں بُھلا دی جب بالم نے اڈے پر آکر اُسے یہ خبر سنائی کہ کل سے تمام اڈوں سے بس گذرے گی اُن سب کے چہرے فق ہو گئے اور وہ سب کھوئے کھوئے سے سر جوڑ کر باتیں کرتے رہے۔ اُس روز ہمیشہ کی طرح اڈے پر رونق نہ تھی اُن کی نظروں سے بھری بھاری پیاری باتیں اور بے شرف فلمی گیت نہ تھے۔ اُن کے پُرہمت قہقہے اُن سے روٹھ گئے تھے اور وہ سب اُداس اور بجھے بجھے سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے ـــ اور دوسرے دن سے بس چلنے لگی۔ رکشا والے جہاں سواری کے چھ آنے لیتے وہاں بس میں ڈیڑھ آنہ پڑتا اس لئے رکشا کا دھندا ایک دم بیٹھ گیا۔ وہ اڈے پر کھڑے کسی بے جان مجسموں کی طرح بس کو تاکتے رہتے اور بس دن میں کئی مرتبہ اُن کے سامنے سے دھول اڑاتی گذر جاتی۔ اُن کی نظروں کے سامنے اپنے ننھے منے بچوں کے اداس اور زرد چہرے ناچتے رہتے، بچوں کی بھوک اور پیاس کا خیال اُن کے دل ودماغ پر تازیانے کی طرح پڑنے لگتا اور وہ بوجھل قدموں سے گھر کو واپس لوٹ آتے۔ جب انہوں نے اپنے چاروں طرف محیط تاریکی کو لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہی دیکھا۔ تو ماجرہ کے ساتھ وہ پروفیسر کے گھر کی طرف بڑھے اور پروفیسر اُن کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوا اُس کے مشورے پر اُن میں سے کچھ جذباتی رکشا والوں نے میونسپلٹی کو مرن برت رکھنے کا فیصلہ سنا دیا۔ بس کو شروع ہوئے پندرہ دن گذر چکے تھے اور ان گذرے ہوئے دنوں میں اُن کی زندگی کا رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا۔ ماجرہ دکھ اور پریشانی کے ایک جالے میں قید سا ہو گیا۔ ایک طرف بھوک سے بلکتے پکارتے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اور پیٹ کے درد سے چیختی اس کی بیوی تھی اور دوسری طرف ہمتی تھا جسے وہ بھوک سے تڑپتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ سہارے کے لئے بڑھاتے ہوئے اپنے ہاتھ کو وہ ہمتی کے ہاتھ سے اس بے دردی سے چھڑانا نہیں چاہتا تھا۔ اِن سب سے بڑھ کر اُسے شبو کی تشویش تھی جو اس کے لئے سوہانِ روح بن گئی تھی۔ فیس نہ لانے پر اُسے کلاس سے نکال دیا گیا تھا۔ بالم جس کا کام صرف باتیں کرنا تھا آٹھ دن سے بھوک اور پیاس سے ہم آغوش میونسپلٹی کے دفتر کے سامنے بیٹھا تھا اس نے [illegible] چھوڑ دی تھی۔ لیکن وہ اپنے مایوس ساتھیوں کو دیکھ کر مسکراتا رہتا اُسے اور اس کے دوسرے ساتھیوں کو دیکھنے دن میں کئی بار ڈاکٹر آتے اور ایک دن ڈاکٹروں نے اپنی رپورٹ میں معاملے کی نزاکت میونسپلٹی والوں کے سامنے رکھ دی اور اسی کی روشنی میں میونسپلٹی کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ بس بند کر دی گئی ماجرہ اس رات بہت دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ اُس رات وہ بہت خوش تھا۔ اور کل سے شروع ہونے والی اپنی نئی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا اور بازو کے کمرے میں اُس کی بیوی آہستہ آہستہ کراہتی رہی کل اس کی بیوی تیسرے بچے کی ماں ہو جائیگی کل سے ذمہ داریوں کا کچھ اور بوجھ اس کے کندھوں پر آپڑے گا لیکن اب وہ زیادہ پریشان نہیں رہیں گے خوشحالی اُن کی منتظر ہے اور کل کا سویرا اُن کے لئے کھوئی ہوئی زندگی اور خوشیاں لائے گا۔ کل سے وہ پھر پرانی رفتار سے اپنی مثلث زندگی کے گرد دوڑنا شروع کر دے گا۔ اور کل سے اس کا اپنا شبو پھر سے اسکول جانے لگیگا۔ اور اُس نے اپنے آس پاس بکھرے پڑے بے ترتیب بچوں کو چوم لیا آہستہ آہستہ ڈھلتی ہوئی رات کے ساتھ اُس کی بیوی کی کراہیں لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہیں اور اُس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوسرے دن تڑکے جب وہ بیدار ہوا تو صبح بہت دُھلی دھلائی سی اور ماحول بہت پرسکون تھا۔ اُس کی بیوی کٹھن مراحل سے گذر چکی تھی اور اُس تاریک سی کوٹھڑی میں ایک ننھی سی زندگی ہاتھ پیر مار رہی تھی ماجرہ نے اپنی کھردری انگلیوں سے بچے کے ملائم رخساروں کو تھپکی دی بے خبر پڑے ہوئے شبو کو پڑھنے کے لئے بیدار کیا اور اگروال سیٹھ کے گھر کی طرف چل پڑا تلسی کی پوجا میں مصروف اشلوک پڑھتے اگروال سیٹھ کو پیچھے چھوڑ کر اُس نے رکشا گیراج کی طرف تیز تیز قدم بڑھائے لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں رک سی گئیں۔ گیراج خالی پڑا تھا ـــ رکشا کے پہیوں کے تازہ نشانوں کو دیکھ کر اُس نے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور اسی لمحے آہستہ سے اگروال سیٹھ نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ چپ چاپ اُن کی آنکھوں میں دیکھتا رہا سب بیچارگی اور بے بسی کے اُس طوفان کا اظہار۔ وہ کر

کہہ سکتا تھا جو اس کے دل کی دیواروں سے بے تحاشا سر مار رہا تھا۔ اگروال سیٹھ کے ہمدردانہ الفاظ کے جواب میں وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ انہیں کیسے سمجھاتا کہ انہیں صرف ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے اُسے اپنی نوکری چاہیئے ـــــ اُس کے بغیر وہ کیا کرے گا۔؟ گھر پہنچتے ہی ایک پیسے کے لئے اُس کے پیروں سے لپٹ جانے والے بچوں کا کیا ہوگا۔؟ شبو کا کیا ہوگا۔؟ وہ اب بالم کو کس طرح بتا سکے گا کہ اُس کا بیٹا ہوٹل میں برتن دھو کر تاڑی پینے اور کتوں کی طرح زندگی گزارنے اس دنیا میں نہیں آیا ہے ـــــ کیسے ہوگا یہ سب ـــــ؟؟ اور وہ چپ چاپ اگروال سیٹھ کے گھر کی وسیع حد سے باہر نکل گیا۔ کسی زندہ لاش کی طرح چلتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو دیکھ کر سوچا ـــــ اب وہ اپنے بڑھاپے کو کیا کرے اور تندرستی کہاں سے واپس لائے۔ سیٹھ اس سے کہتا ہے کہ اُسے رکشا چلانے کے لئے کسی تندرست اور مضبوط آدمی کی ضرورت ہے۔ لیکن اُس نے سیٹھ کا کبھی نقصان تو نہیں کیا، اُس نے تو بہت محنت کی، اپنے منہ سے گرتے ہوئے خون کی پروا کئے بغیر چلچلاتی دھوپ اور سردی کی جان لیوا راتوں میں بھی اُس نے کام کیا اور سیٹھ کو ہمیشہ اچھے پیسے دیئے۔ پھر یہ سیٹھ کو اچانک کیا ہوگیا ـــــ؟ اور اُسی لمحے اس کے سامنے سے رکشا گزرا ـــــ اُس کا رکشا ـــــ اس کا ان داتا ـــــ جسے وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتا تھا ـــــ رکشا والے نے اُسے دیکھ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اُس نے دیکھا ـــــ وہ ہمتی تھا ـــــ اور رکشا ہر لمحے اس کی نظروں سے دور ہوتا گیا ـــــ

○

کھا کر جو تیر دیکھا کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

(حفیظ جالندھری)

مصنف: جان گالزوری　　مترجم: خیر الدین انصاری

شوقِ سفر

اس صبح رتھ لینڈ کی طبیعت ناساز تھی۔ جیسے ہی اس نے باس زیب تن کیا تو وہ کچھ مرجھایا مرجھایا سا نظر آنے لگا۔ اس کی وجہ شاید موسم بہار کے دنوں کی گرمی تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے کچھ پڑھنے کی کوشش کی کیوں کہ اسے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ گیارہ بجے کے قریب اس نے عدالت کی اکتاہٹ کو گھر کی تنہائی پر ترجیح دیتے ہوئے اپنے مجسٹریٹ بھائیوں کے پاس شہر میں جا کر بیٹھنا پسند کیا۔

اس کی عمر چالیس اور پچاس کے لگ بھگ تھی لیکن اتفاقیہ طور پر دیکھنے سے وہ صحت مند نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر مستقل لکیریں اس کے سنجیدہ ہونے کی دلالت کرتی تھیں۔ اس کی آواز بھی یہی کچھ بتاتی تھی۔ شہر کے لوگ اس کی دولت، سماجی اثر و رسوخ اور گھریلو زندگی کا ظاہری امن و سکون دیکھ کر اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لیکن رتھ لینڈ کی اپنے متعلق رائے ان سے مختلف تھی اور آج تو وہ خاص طور پر مایوس تھا۔ یہ مایوسی کئی سالوں سے اس پر اپنا بوجھ ڈالے چلی آ رہی تھی۔

وہ آسودہ حالات میں پیدا ہوا تھا۔ تیس بتیس سال کی عمر میں شادی کی اور چھ بچے پیدا کئے۔ سب کی سب لڑکیاں تھیں جن میں سے صرف تین زندہ تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس کی بیوی ایک تنگ نظر اور مضبوط ارادے کی عورت تھی۔ اور وہ زندگی کے ہر معاملے میں اس پر حکومت کرتی تھی۔ بیگم رتھ لینڈ اس سے اتنی ہی توقع رکھتی کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لئے جدوجہد کرتا رہے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے دو دفعہ پارلیمنٹ کی سیٹ کے لئے کھڑا ہوا۔ لیکن اسے دونوں بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ دوسری بار وہ نزدیکی شہر کا میئر بنا جہاں اس کی کافی جائداد تھی۔ یہ عہدہ اسے مصروف رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اس کی بیگم اپنے شوہر کو مجسٹریٹی پر متمکن دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اسی کی دعوت پر وہ مختلف مقامی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ وہ پھولوں کی نمائش کا افتتاح کرتا۔ اہم جلسوں کی صدارت کے فرائض سرانجام دیتا اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے لئے تحریکیں چلاتا —— یہ سب چیزیں رتھ لینڈ کو ذاتی طور پر ناپسند تھیں۔ لیکن ان سے زیادہ وہ گھر میں لڑائی جھگڑے کے سائے کو ناپسند کرتا تھا۔

اس کے جتنے بھی جاننے والے تھے سب اس کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس کے ایک دو پرانے دوست حیران تھے کہ اتنا پڑھا لکھا آدمی جو اپنے پرائیویٹ معاملوں میں دلچسپ گفتگو کرتا ہو کس طرح اس ناگوار زندگی پر قانع ہو گیا ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی دوست نوازی اور دریا دلی کا تعلق تھا سب کی رائے ایک سی تھی۔ اور بحیثیت ایک مجسٹریٹ کے اس کی نرم دلی ضرب المثل تھی۔

اس صبح جب وہ کمرہ عدالت میں داخل ہوا تو ایک فوجداری مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ یہ بظاہر ایک معمولی مقدمہ تھا۔ قیدی ایک پردیسی تھا۔ وہ اس شہر میں دیواروں پر نقش و نگار بنانے کا کام کرتا تھا۔ کوئی ایک یا دو گھنٹے بیشتر وہ اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ کہ ایک دفعہ اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی بے عزتی ہوتی دیکھ کر دامنِ صبر ہاتھ سے چھوڑ کر اس آدمی کو مار گرایا۔ اور فوراً اسے پولیس کے سپاہی

کے حوالے کردیا گیا ہو قریب ہی کھڑا تھا۔ رتھ لینڈ نے قیدی کو نظر بھر کر دیکھا اور فوراً اس نے اس کے بارے میں ایک عجیب دلچسپی محسوس کی اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا رنگ نہایت بھورا تھا۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور وہ ایک مضبوط شخص تھا۔

"اس کا نام کیا ہے؟" رتھ لینڈ نے اپنے ساتھی مجسٹریٹ سے پوچھا۔

"ہنری گنڈایو"

"گنڈایو ——— گنڈایو ———"

رتھ لینڈ حیران پریشان ہو گیا اور اس نے دوبارہ قیدی کو دیکھا۔ اس لمحہ اس نے گنڈایو کی آواز سنی۔ اس نے ایک سوال کا جواب دیا تھا۔ رتھ لینڈ نے اسے غور سے سنا۔ وہ صریحاً پریشان ہو گیا تھا۔

اسے تھوڑا سا جرمانہ ہوا۔ جس پر قیدی نے کہا کہ میری جیب میں تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ وہ اس شہر میں کل ہی وارد ہوا تھا۔ اس وقت بھی اس کی جیب خالی تھی۔ اور آج صبح اسے کام ملا تھا۔

"اس کا جرمانہ میں ادا کردوں گا۔" رتھ لینڈ نے کہا۔ "اور میں عدالت سے باہر اس کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو کروں گا۔"

رتھ لینڈ کے حکم پر اسے پرائیویٹ روم میں لے جایا گیا۔ گنڈایو یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ ایک مجسٹریٹ اس سے بات کرنی چاہتا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں" "کیا تم برو کیرسٹ کے سکول میں پڑھتے رہے ہو!"

"میں وہاں پڑھتا رہا ہوں" گنڈایو نے مجسٹریٹ کے چہرے پر نظریں ڈالتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے جواب دیا" میں نے اسے سن ... میں چھوڑا تھا۔"

"کیا تم میرے متعلق کچھ جانتے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میرا نام رتھ لینڈ ہے ——— ڈک رتھ لینڈ۔"

تیس سال قبل یہ دو آدمی ایک سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ اور ان میں گہرے تعلقات قائم تھے۔ وہ ملک کے دو مختلف حصوں سے آئے تھے۔ اور ایک دوسرے کے خاندانوں سے ناواقف تھے۔ ہنری گنڈایو ایک چھوٹے دوکان دار کا بیٹا تھا۔ اور اسے اپنی زندگی میں کچھ جمع کر لینے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس کے برعکس رتھ لینڈ کی زندگی کی راہ ہموار اور خوشگوار تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں گنڈایو کو ایک دفتر میں ملازمت کرنا پڑی جہاں جا کر وہ سست پڑ گیا۔ اور سولہ سال کی عمر میں سمندری سفر پر روانہ ہو گیا۔ اور اس دن سے وہ دھرتی کے سینے پر ایک خوش مزاج آوارہ گرد بنا ہوا پھرتا ہے۔

"آپ ضرور میرے ہاں تشریف لائیں" رتھ لینڈ نے چند منٹ کی گفتگو کے بعد کہا۔

"میں کئی دن سے گھر پر اکیلا ہوں میری بیوی اور بچیاں لندن گئی ہوئی ہیں۔ آپ یہاں سے میرے گھر آدھ گھنٹہ میں پہنچ سکتے ہیں۔ گھر کا راستہ کسی سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میں ڈیڑھ بجے گھر پر ہوں گا"

"میرے جرمانے کا کیا بنے گا۔"

"لعنت بھیجو اس پر۔ ہم جلد ہی اس کا تصفیہ کریں گے۔"

جب وہ گھر پہنچا تو آوارہ گرد پاؤں پھیلائے لان کے سایہ دار حصے میں پڑا تھا۔ مالی جیسا کہ اس نے بیان دیتے ہوئے کہا تھا اسے مشکوک سمجھتے ہوئے اس کی کڑی نگرانی کرتا رہا تھا۔

گڈ ایو نے پوچھا۔ "کیا یہاں قرب و جوار میں کوئی تالاب یا ندی ہے۔ جہاں کوئی شخص ایک آدھ غوطہ لگا سکے۔"

"نہیں! لیکن اگر آپ معمولی غسل سے نفرت نہ کرتے ہوں تو۔"

"ہرگز نہیں۔ جب مجھے کوئی بہتر طریقہ میسر نہ ہو۔"

وہ دونوں نیچے بیٹھ گئے۔ ان کے لباس میں غیر معمولی تفاوت تھا۔ لیکن دوسری نسبت سے وہ بے جوڑ ساتھی نہیں تھے۔ گڈ ایو نے ان تعیشات کی موجودگی میں کسی قسم کی شرم ظاہر نہ کی۔ اس نے اچھی طرح کھایا پیا اور ہنسی خوشی سے بیتے دنوں کو یاد کرتا رہا۔ اس کے میزبان نے اس اجنبی مہمان کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وہ دوبارہ سکول کے زمانے میں لوٹ گئے۔ اپنے استادوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ پرانے لطیفوں پر قہقہے لگائے گئے۔ اور فٹ بال اور کرکٹ کے میچ یاد کئے گئے۔ گڈ ایو اس کے اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کہ ان کے ساتھ کیا کیا بیت چکا ہے۔ وہ اس وقت اکیلے تھے اور آزادی سے گفتگو کر سکتے تھے۔

"گنبز چلا گیا ہے۔" رتھ لینڈ نے کہا۔

"اس کا باپ ناگوار حالات سے دوچار ہو گیا تھا۔ مجھے خدشہ ہے کہ بیچارے نے ——"

"آہ!" دوسرا چلایا۔ "میں آج سے دس یا بارہ سال قبل اس سے نیوزی لینڈ کے ایک شراب خانے میں ملا تھا —— وہ شراب پیش کر رہا تھا۔"

"اوہو ——"

"اور پاٹس —— ٹاوڈی پاٹس میں اس سے سماٹرا میں ملا تھا۔ وہ ایک مرچیں اگانے والے ڈچ کے پاس کلرکی کر رہا تھا اسے بخار ہو گیا تھا۔ اور کبھی کا مر چکا ہوگا۔"

"آپ نے اتنا سفر کیسے کیا؟" رتھ لینڈ نے پوچھا "کیا ایک جہاز ران کی حیثیت سے؟"

"عموماً اپنی سیاحت کے سلسلے میں —— لیکن ہمیشہ نہیں۔ خشکی پر میں نے ہر شے کے متعلق تھوڑی بہت سوجھ بوجھ پیدا کر لی تھی۔ میں ایک اچھا بڑھئی ہوں —— تمہیں یاد ہوگا۔ سکول میں میرے پاس کھلونے ہوتے تھے۔ میں نے کبھی کبھی درزی کا کام بھی کیا ہے۔ میں میزیں بنانے میں اچھی خاصی شہرت کا مالک ہوں اور فوٹوگرافی کے فن سے روزی کما تا رہا ہوں۔ صرف انگلستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں مجھے اپنی روزی کمانے میں دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اوہ! ہاں: میں بسا اوقات اپنے گاؤں واپس آجاتا ہوں حالانکہ یہاں میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ میں ہمیشہ بے گھر رہا ہوں اور اپنا ٹھکانا بنانے کے منصوبے بناتا رہا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے۔ کہ میں کبھی کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ پانچ ہفتے قبل میں بارہیارے ساؤتھمپٹن اترا —— میرا ایک پرانا دوست وہاں تمباکو کا کاروبار کرتا تھا۔ میں جیسا کہ اسے ملنے کے لئے گیا تھا۔ ہاں! جب میں خشکی پر اترا تو میرے پاس ایک یا دو ڈالر تھے۔ پس وہاں کا خوشگوار موسم دیکھ کر اتر گیا تھا۔ اور بعد میں وہاں سے چل پڑا تھا۔ یہاں میں نے مکانوں پر نقش و نگار بنانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ یہاں اس قسم کا کام ملنا مشکل ہے۔ تاہم مجھے معمولی کام پسند نہیں ہیں۔ پچھلی دفعہ، پانچ سال پہلے میں نے کینٹ کے نشیبی علاقے میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ یہ کام مجھے زیب

بنا تھا۔ اس لئے بہت جلد سمندر کی راہ لی۔"

"کیا زندگی ہے؟" سننے والے نے حیرت سے کہا۔

"لیکن اتنی بری نہیں ہے ——"

"آپ غلط سمجھے ہیں۔ میرا مطلب ہے کتنی شاندار زندگی ہے!" گڑابو "مجھے آپ پر رشک آرہا ہے۔ میں دل و جان سے آپ پر رشک کرتا ہوں۔"

"آپ کریں! ہاں، میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آپ ایسا آدمی جس کے پاس مکان ہو اور آزادی سے جہاں چاہے آ۔ جا سکتا ہو کس طرح مجھ پر رشک کر سکتا ہے؟"

"آزادی" یہ زبان چلایا "میری ظاہر حالت پر مت جاؤ۔ آپ دنیا کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ مجھ ایسا غلام شخص دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔"

وہ خاموش ہو گیا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ اس نے زیادہ بے تکلفی سے باتیں کی ہیں۔

"پرانے ساتھی، باہر باغ میں آجاؤ۔ دوسرا سگار سلگاؤ اور کچھ اپنی جیب میں ڈال لو۔"

اس سہ پہر کو اس کے پڑوس میں ایک گارڈن پارٹی تھی اور رتھ لینڈ نے ان سے پارٹی میں شرکت کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اگر وہ اس میں شرکت نہ کرتا تو دعوت دینے والوں کو پریشانی ہوتی۔ اور جنہوں نے ایک گھنٹہ قبل اس کی حاضری کا یقین کر لیا تھا وہ مایوس ہو جاتے۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ وہ اپنے دلچسپ ساتھی کو پڑوس کی دعوت دینے والی سوسائٹی کے لئے چھوڑنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ آخر کار اس نے ان سے کہا۔ کہ وہ وہاں جانے سے معذور ہے۔

اس کے دوست نے اپنی مہمات کا بیان جاری رکھا۔

"—— دوسرے دن ہم نے ہارن کو دیکھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنی ساری تکلیفیں بھول گیا۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ سکول میں ہم اس سے کس قدر باتیں کیا کرتے تھے —— ہارن کے اردگرد بیٹھ کر یقین جانو مجھے اس وقت تمہارا خیال آگیا تھا۔"

سات بجے جب سورج غروب ہو رہا تھا اور ہوا میں خنکی پیدا ہو رہی تھی۔ رتھ لینڈ اٹھ بیٹھا۔ تب کھانے کی پہلی گھنٹی بجی۔ گھنٹے منٹوں کی طرح گزر گئے۔

"ان باتوں کو چھوڑیئے مجھے کافی بھوک لگی ہے۔" گڑابو ہنسنے لگا۔

"نہ معلوم کیوں مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ برسوں کے بعد یہ پہلا موقعہ ہے کہ مجھے اس قدر بھوک لگی ہے۔ یہ سمندری ہوا کا اثر ہے۔ یہ زندگی ہے۔ کیا زندگی ہے! القصہ آپ رات بھر یہاں ٹھہریں گے۔ آپ کو خدا نے میرے لئے بھیجا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دوبارہ جوان ہو گیا ہوں اور میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا اور سر جھکا کر سوچتے ہوئے چلنے لگا۔

کھانے کے بعد وہ لائبریری میں چلے گئے۔ اور گڑابو الماریوں کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں یہاں سیاحت کی کتابوں کے سوا اور کچھ کیوں نظر نہیں آتا۔ رتھ لینڈ میں تمہیں سمجھ نہیں سکتا۔ اگر آپ نے بعد میں سفر کے بارے میں سوچا ہے جتنا سکول کے زمانے میں تو آپ گھر پر کیوں اس طرح ٹھہرے رہے؟ بیوی اور بچے؟ لیکن آپ ہمیشہ خوشحال رہے ہیں۔ کون سی

شتے آپ کو دوسرے لوگوں کی مانند سیر نہ کرنے سے روکتی رہی ہے"؟

حقیقت کیا ہے ؟ جب رتھ ریلینڈ محبت کی پینگیں بڑھا رہا تھا۔ تو وہ یہ سوچ کر خوش ہوا کرتا تھا کہ وہ اور اس کی بیوی دنیا کی شان و شوکت اور عجائبات عالم کا نظارہ کرنے کے لئے دور دراز کا سفر کریں گے۔ ان میں ہنی مون کیلئے مصر جانا بھی شامل تھا۔ لیکن بیگم رتھ ریلینڈ نے جلد ہی بتا دیا کہ وہ بیرونی ممالک کی سیر کا اتنا شوق نہیں رکھتی اور وہ اپس پہنچنے سے پہلے ہی گھر کو واپس ہو گئے۔ بچوں کی پیدائش سے جلد کے بعد دیگرے بڑی تیز رفتاری سے ہوتی رہی ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ دور دراز کے سفر کی ساری امیدیں کھو بیٹھا۔

انہوں نے اپنے سامنے ایک بڑا اٹلس کھولا اور رتھ ریلینڈ ان ممالک کو دیکھنے لگا جن کی سیاحت اس کا دوست کر چکا تھا۔ ان کے سر جڑے ہوئے تھے اور وہ بہت زیادہ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ گویا وہ دوبارہ بچے بن گئے ہوں۔ اس طرح وہ سکول کے بنچوں پر کئی بار بیٹھے تھے۔ نقشہ ان کے سامنے ہوتا تھا۔ ان دونوں ڈک رتھ ریلینڈ یہ جانتے ہوئے کہ اسے سفر کرنے کے مواقع حاصل ہیں۔ زیادہ پر امید اور ہوشیار تھا ہنری گڈ ایو محض خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ اب رتھ ریلینڈ امیر کبیر اور موٹا آدمی کو جو اپنی پشت پر تیس سالہ زندگی کا بوجھ لادے ہوئے تھا۔ محسوس ہوا کہ اس کا دل گڈ ایو کی کہانیوں اور خطرناک کہانیوں کو سن کر اندر ہی اندر جل رہا تھا جو گلوب کے ارد گرد دائرہ بناتی جا رہی تھیں۔

"آہ! زندگی تو تم نے گذاری ہے!" آخر کار اس نے کمرہ میں ٹہلتے ہوئے تعجب کا اظہار کیا۔ دولت مند تو تم ہو اور میں بیچارہ مفلس ہوں مغربوں میں ایک ضرب المثل ہے۔ "سفر فتح یابی کا دوسرا نام ہے" تم نے دنیا فتح کی ہے۔ جبکہ میں ایک چھوٹے سے کونے میں پڑا ہوں اور زندگی سے کھیل رہا ہوں۔ میں ایک طرف جا کر ایک بڑی کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں اور وہاں بیٹھا ہوا الو کی طرح دانا نظر آتا ہوں۔ اور شیطانوں کو دل میں بھگا رہا ہوں۔ یہ میری انتہا ہے۔ جس کو میں حاصل کر چکا ہوں۔ تم نے آدمیوں کے درمیان زندگی گزاری ہے اور ایک آدمی کی طرح کام کرتے، دکھ جھیلتے اور خوش ہوتے رہے ہو۔ خوب خوب! جب میں اپنی پچھلی زندگی یاد کرتا ہوں۔ تو پاگل بن جاتا ہوں۔ اور میں اپنی کاہل زندگی کا تمہاری زندگی سے موازنہ کرنے لگتا ہوں۔ کیا تم ان لوگوں کے بارے میں سوچ سکتے ہو جن کے ساتھ میں رہتا ہوں؟ وہ ایسے لوگ ہیں جو صبح کے وقت ایک خاص قسم کا لباس پہنتے ہیں۔ اور رات کو اس سے مختلف۔ اور وہ اس ادل بدل کے سوا دنیا کی کسی دوسری چیز کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ ہم اپنے مقامی مسائل پر مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔ اور تم ——— تم سمندر کے درمیان طوفانوں سے لڑتے ہو یا کسی نئی سرزمین پر اترتے ہو۔ جہاں ایک نئی دنیا تمہارے سامنے دامن پھیلائے ہوئے ہوتی ہے"۔

"یار اس قصے کو چھوڑو" دوسرا آدمی قہقہہ لگاتے ہوئے پکارا۔ "ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔ اور آپ مجھ سے زیادہ معمر نہیں ہیں"۔

رتھ ریلینڈ خاص نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔ ہاں" اس نے سانس لیتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "میں اب ضرور دنیا کا کچھ حصہ دیکھوں گا"

وہ دوبارہ اٹلس کی طرف متوجہ ہوا اور جنوبی افریقہ کا نقشہ دیکھنے لگا۔ یہ ان چیزوں میں سے ایک ہے جنہیں میں دیکھنے کا بہت زیادہ متمنی ہوں ——— دریائے ایمیزن"

"اس سفر کے لئے پندرہ دن درکار ہیں" گڈ ایو نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پندرہ دن! ہاں پندرہ دن"

رتھ ریلینڈ یوں بولا جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ جب وہ اس دریا کا راستہ دکھا رہا تھا۔ تو اس کی انگلی لرز رہی تھی۔

"آپ یا بیا جائیں۔" گڈ ابو نے کہا "اور میرے دوست سے ملیں جو تمباکو کا تاجر ہے۔ اور بہت اچھا آدمی۔ وہ ایک گھنٹے میں اتنا کچھ بتا دے گا کہ اتنا میں پورے ہفتے میں نہیں بتا سکتا۔ میں آپ کے ساتھ جانے کا آرزومند ہوں"

رتھ لینڈ دوبارہ کھڑا ہو گیا اور اپنے مہمان کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیوں نہیں؟ تمہارے سامنے زادِ راہ کا مسئلہ ہے! مجھے بتاؤ تمہارے لئے کتنا خرچ کرنا پڑیگا؟ تم ضرور جاؤ گے اور ——"

وہ رک گیا۔ اس کی انگلی ہوا میں لہرا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک اہم فیصلہ کر رہا ہے۔ اگرچہ دوسروں کی نظر میں یہ ایک معمولی مشکل تھی۔ لیکن رتھ لینڈ کے لئے اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کی پختہ عادتوں کو کچل کر رکھ دے۔

"میں بہت جلد جاؤں گا۔" اس نے برا لکاپل پر جھکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں برازیل جا کر واپس آنے کے سوا بھی کچھ کرنا چاہئیے۔" وہ اپنے میزبان سے کہتا رہا جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ "اگر میں لندن سے ایک بار روانہ ہو گیا تو پھر ایک ہی ملک دیکھنے پر قانع نہیں رہونگا۔ ایک سال کی مدت یا اس سے زیادہ کے لئے سفر کروں گا —— شاید دو یا تین سال۔"

اس کی آواز کانپنے لگی اور آنکھوں میں چمک آگئی۔ گڈ ابو نے ہمدردانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا۔

"ہیری کیا تم میرے ساتھ سفر کر سکو گے!"

"امید تو یہی ہے۔ آپ سفر پر روانہ ہونے کے لئے کب تیار ہو جائیں گے؟"

رتھ لینڈ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ وہ پانچ منٹ کے لئے بالکل خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے گہری سانس لے کر غمناک آواز میں کہا۔

"آج منگل ہے۔ میں ہفتہ کی صبح کو گھر چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاؤنگا۔"

"ہمیں دخانی کشتیوں کا انتظام کر لینا چاہئیے۔"

"ہاں، لیکن وہاں کوئی جہاز بھی ہوگا کہ نہیں۔ میں ہفتے کی صبح کو گھر چھوڑ دوں گا۔ اور جہاں آپ چاہیں وہاں آپ سے آملوں گا۔ میرے ساتھ ایک دن اور ٹھہریں۔ میں یوں تو مصروف ہوں گا۔ لیکن آپ کو اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں۔ جمعہ کے روز آپ جا سکتے ہیں۔ اور ہفتے کے دن ہم لورپول یا ساؤتھمپٹن میں دوبارہ اکٹھے ہونگے یا کسی ایسی جگہ جو آپ مقرر کریں۔"

وہ بڑی رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی انتظام کیا گیا کہ گڈ ابو اپنے بوسیدہ کپڑے اتار کر مناسب کپڑے پہن لے جو رتھ لینڈ کے مہمان کی شان کے مطابق ہوں۔ وہ بھلا کس طرح ان پابندیوں کو برداشت کر سکتا تھا۔ تیس سال کی مہماتی زندگی نے اسے چیزوں کی سادگی کا احترام کرنا سکھا دیا تھا۔ گڈ ابو ایک صاف گو، ایماندار آدمی تھا۔ وہ اپنے فائدے کے لئے اسکیمیں بنانے سے قاصر تھا۔

وہ سونے کی کوششوں سے تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ وہ تمام رات کاغذوں کو ترتیب دیتا رہا۔ خطوط لکھتا رہا اور اپنے نجی گھریلو اور پبلک کے معاملات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ سوچتا تھا کہ اسے اپنا کام ابھی سے شروع کر دینا چاہیے۔ اس کی بیوی اور لڑکیاں ہفتے کی شام کو واپس آنے والی تھیں۔ وہ ان کے لئے ایک لکھا ہوا کاغذ چھوڑ جائے گا۔ کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ہمراہ ایک یا دو دنوں کے لئے باہر گیا ہے۔ اس کے بعد جب بیگم رتھ لینڈ کے لئے وقت گزارنا دوبھر ہو جائے گا تو وہ اس کا پورا جواب حاصل کرے گی۔ اس بارے میں اسے کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ بڑی آسانی سے کسی وکیل کو ان تمام معاملات کا انچارج بنا سکتا تھا، جن کو اس کی بیوی نپٹا نہ سکتی ہو۔ روپیہ

پیسے کے معاملات میں بیگم ریڈ لینڈ ہمیشہ خود مختار رہی تھی وہ اپنے خاوند سے زیادہ اس منصب کے لئے موزوں تھی۔ اسے بچوں کی جدائی کا خیال بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے بچے اپنی ماں سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ ایک بچہ تھا جسے اس سے محبت تھی۔ لیکن وہ کب کا موت کی آغوش میں جا چکا تھا۔ اس لئے وہ ہفتہ کی صبح کو مکمل طور پر آزاد ہونے کے انتظامات میں لگ گیا تھا۔

سورج نکلنے تک وہ تھکاوٹ سے چکنا چور ہو چکا تھا۔ اسے "جسمانی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی تھی" جیسے اسے کل صبح کے وقت ہو رہی تھی۔ وہ اسے غیر معمولی ولولہ کا نتیجہ قرار دیکر بیٹھ گیا۔ لیکن نیند کہاں؟

دن بھر وہ کام میں جتا رہا۔ موسم پھر زیادہ گرم تھا۔ اور اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔

"میں بہت جلد سمندر کو چلا جاؤنگا۔" اس نے گڈ ایو سے پہلی بار اپنی تاخیر کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے سست زندگی گزاری ہے اور بہت کم ورزش کی ہے۔"

انہوں نے دوبارہ ایک طویل شام اکٹھے گذاری۔ انہوں نے اٹلس کھول رکھا تھا۔ اور ریڈ لینڈ سفر کے لئے بڑا بیتاب ہو گیا تھا۔ جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو اس کی آنکھیں زیادہ بڑی دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے رخسار جل رہے تھے۔ ایک گھنٹے تک وہ بیداری میں اچھلتا رہا پھر اسے خوفناک خواب نظر آنے لگے۔ طوفان اور تباہی کے خواب اور یہ خواب صبح تک اسے پریشان کرتے رہے۔

جمعہ کی صبح کو گڈ ایو چلا گیا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ ایک دخانی جہاز سوموار کے دن ساؤتھمپٹن سے جو ان کے سفر کا نقطۂ آغاز تھا ارئیے ڈی جیزو کو روانہ ہوگا۔ یوں تو وہ اپنے نئے کپڑوں سے بیزار ہو رہا تھا لیکن ظاہر یہ کر رہا تھا کہ وہ خوش تھا۔ وہ ساؤتھمپٹن میں روپیہ کے خرچ کرنے کی کیفیت کے ساتھ چیزیں خریدنے گیا تھا۔ اس نے جہاز کے ایجنٹ کو سیٹ ریزرو کرنے کے لئے تار بھیجا جس کا تسلی بخش جواب موصول ہو گیا۔

اس دن معمولی سی بارش ہوئی اور ریڈ لینڈ اسکی خنکی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کہ یہ اس آب و ہوا کا اثر ہے جس پر وہ روانہ ہونے والا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی —— بالکل نہیں۔ اس کے ذہن نے اس کے جسم پر اثر ڈالا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی اگر برازیل غیر آرام دہ ثابت ہوا تو وہ اور اس کا دوست شمال یا جنوب کی طرف چلے جائیں گے۔ دنیا اس کے سامنے اٹلس کی مانند کھلی پڑی تھی جس کا اس نے اکثر بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس نے اپنی جہاں گردی کی کوئی حد متعین نہ کی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ گھر سے بری خبر کے سوا کوئی چیز اسے ایک یا دو سال سے پہلے واپس نہیں لا سکتی۔ جب وہ واپس آئیگا۔ تو اس میں خاصا تغیر واقع ہو چکا ہوگا۔ اس کی بیوی جان لے گی کہ اس کی حکومت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔"

اس نے اپنا تمام کام ختم کر لیا اور گھنٹے گزرتے گئے۔ وہاں بیگم ریڈ لینڈ کا ایک خط پڑا تھا۔ جس میں اس نے اس کی توجہ بہت سے کاموں کی طرف دلائی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ہنسنے لگا۔ اور اسے ایک طرف پھینک دیا۔ سہ پہر کو اس نے اپنے اندر سنسنی محسوس کی اس لئے وہ مطالعہ کی غرض سے کوچ پر لیٹ گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں سکون پیدا کرنے کی کوشش کی جو مطلعا اسے پریشان کر رہا تھا لیکن وہ بدستور پریشان ہوتا گیا وہی شام اور رات سے ڈر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوراً ساؤتھمپٹن چلا جائے۔

اس نے تھوڑا سا شوربا چکھا۔ وہ کافی دیر اپنے آپ سے یہ راز نہ چھپا سکا کہ وہ شدت سے طبیعت کی ناسازی محسوس کر رہا تھا۔ اور اس کا یہ خوف کہ وہ اپنی ناسازیٔ طبع کے باعث کل اپنے سفر پر روانہ نہ ہو سکے گا۔ اس کی حالت غیر کئے دے رہا تھا۔ وہ میز پر سے اٹھ کر دوبارہ مطالعہ کرنے لگا۔ اور اخبار سے کر بازو دار کرسی پر بیٹھ گیا۔ جب اس کا جسم پیچھے کو جھکا تو اس نے گہرا سانس لیا۔

صبح دس بجے کے قریب اس کا خانساماں اس سے بات کرنی چاہتا تھا۔ اس نے اس کے ریڈنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر چلا گیا۔ لیکن نزدیک جاکر اس نے دیکھا کہ مالک سو رہا پڑا ہے۔

ایک گھنٹہ بعد وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ رتھ لینڈ نے کوئی حرکت نہ کی اور اس کے نوکر نے قریب جاکر ایک عجیب معاملہ دیکھا جو اس کے سامنے تھا۔ وہ سننے کے لئے جھکا لیکن رتھ لینڈ سانس نہیں لے رہا تھا۔

اور دوسرے دن ساؤتھمپٹن میں ہنری گڈ ایوا نے مسافروں میں تلاش کرتا رہا جو مختلف ٹرینوں سے آئے تھے "یار، ڈرتا ہوں کہ مسٹر باندھ رہ گیا ہوگا۔" وہ بے چینی سے بڑبڑایا۔ "اس کی بیوی واپس آگئی ہوگی۔ اور اس نے اسے جکڑ لیا ہوگا۔"

O

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے
(آتش)

O

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزا تو یہ ہے نہ منزل نہ راستہ معلوم
(شاد عظیم آبادی)

O

یہ طولِ سفر، یہ نشیب و فراز
مسافر کہاں تک سنبھلتا رہے
(عرش ملسیانی)

O

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں
(غالب)

O

شاخ شکستہ

اے جنوں دشت میں دیوار کہاں سے لاؤں
میں تماشا سہی، بازار کہاں سے لاؤں

یادِ ایام کہ کچھ سر میں سمائی تھی ہوا
اب وہ ٹوٹا ہوا پندار کہاں سے لاؤں

کس سے پوچھوں کہ مرا حالِ پریشاں کیا ہے
تجکو اے آئنہ بردار کہاں سے لاؤں

میری اِن آنکھوں نے جیسے تجھے دیکھا ہی نہیں
ہائے وہ حسرتِ دیدار کہاں سے لاؤں

اُن نگاہوں میں ترسنے کی سی کیفیت ہے
طاقتِ پُرسشِ بیمار کہاں سے لاؤں

اب مرے کفر کو ایماں نہیں کہتا کوئی
تجکو اے چشمِ طرفدار کہاں سے لاؤں

تھا یہ گھر بابِ دُعا مثلِ اثر تیرا ورُود
اب تجھے اے قدمِ یار کہاں سے لاؤں

نشور واحدی

سو بہار آتی ہے غنچگی نہیں آتی
اک ہنسی لبوں پر ہے دوسری نہیں آتی

کچھ نہیں تو غنچوں کو مسکرا کے چھیڑیں گے
اُن حسین ہونٹوں کو خامشی نہیں آتی

حسن و عشق دونوں ہی ہیں گرفت میں اُن کی
غم کی گرم باہوں کو نازکی نہیں آتی

ایک قطرہ آنسو بھی ضبطِ غم سے باہر ہے
زندگی کے دامن میں زندگی نہیں آتی

بار بار شبنم نے آنسوؤں سے بھی دھویا
رنگِ لالہ و گل میں کچھ کمی نہیں آتی

بزم میں بکھیرے ہیں آفتاب کے ٹکڑے
دِن کی بات کرتا ہوں رات کی نہیں آتی

جانتی ہے اک دنیا ہم گناہگاروں کو
رہبری کے پردے میں رہزنی نہیں آتی

موت کا گزر کیا ہے بزمِ ہوشمنداں میں
آنکھ ہے کھلی جب تک نیند بھی نہیں آتی

میکدہ پکارے ہے چھپ کے پینے والوں کو
بے شریکِ پیمانہ مے کشی نہیں آتی

ہے نشورؔ یہ لمحہ مغتنم محبت میں
جو گھڑی گزرتی ہے پھر کبھی نہیں آتی

سیّد مراتب اختر

○

تیری نظر میں نغمۂ صد عندلیب رات
میری نظر میں تختۂ دار و صلیب رات

چمکا ہوا ہے دل کے خلا میں غموں کا چاند
باقی ابھی ہے تین پہر کے قریب رات

کل رات دل میں گزرا تھا اک حادثہ عجیب
یاد آ گئی تھی گزری ہوئی اک عجیب رات

میں، جگنوؤں کے گیت، سلگتی ہوئی ہوا
گہرا سکوت، گھور اندھیرا، مہیب رات

تم مجھ سے کتنی دور رہے تھے بیتے ہوئے دنوں
لائی ہے تم کو کھینچ کے میرے قریب رات

ہے دن کا آفتاب گدائے درِ حبیب —!
اور تاجدارِ رونقِ شہرِ حبیب رات

ہر رات سوچتا ہوں یہی بات دوستو
شاید یہی ہے صبحِ طرب کی نقیب رات

گُل شام ہی سے تھے جو مہ و مہر کے چراغ
صحراؤں میں بھٹکتی رہی ہے غریب رات

کیا کھو چکی ہے میری طرح تو بھی اپنا چاند
اے سسکیوں میں ڈوبی ہوئی بدنصیب رات

محسن احسان

○

اے دوست حجابات اٹھا کیوں نہیں دیتے
پیوستِ رگِ جاں ہو صدا کیوں نہیں دیتے

گردِ سفرِ زیست سے رُکنے لگیں سانسیں
یہ وقت ہے، دامن کی ہوا کیوں نہیں دیتے

ماتم کدۂ دل میں ہے یہ روشنی کیسی
یادوں کے چراغوں کو بجھا کیوں نہیں دیتے

اے چارہ گرو ایسے ہیں کیا سوچ رہے ہو
بیمار کو مرنے کی دعا کیوں نہیں دیتے

قرطاسِ غمِ دہر پہ اے دوست اگر ہم
اِک حرفِ غلط ہیں تو مٹا کیوں نہیں دیتے

دیوانہ کوئی گوشش بر آواز ہو شاید
صحرائے غریبی میں صدا کیوں نہیں دیتے

یہ روگ سا کیا جی کو لگا بیٹھے ہو محسنؔ
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

راشدہ سلیم سیمیں

○

نہ لب ہلے ہیں نہ آنکھوں سے اشک بہتے ہیں
قضا کے تیر بڑی سادگی سے سہتے ہیں

نظر کی بات نہ پوچھو، یہ اُن کی عادت ہے
نظر ملے بھی تو نظریں چرائے رہتے ہیں

حضورِ دوست گزارے ہیں ایسے کچھ لمحے
کہ بار بار وہی داستان کہتے ہیں

قدم قدم پہ بچائی ہے دوستوں نے نظر
ہم اپنے شہر میں بھی اجنبی سے رہتے ہیں

جہاں کبھی کسی اہلِ ستم کی بات ہوئی
مری وفا کے فسانے بھی ساتھ کہتے ہیں

ذرا سی بات سہی، پر ذرا سی بات نہیں
تمہارے ہوتے ہوئے ہم اداس رہتے ہیں

زمانہ قدرِ گہر جانتا نہیں سیمیں
کہاں ہیں وہ جنہیں گوہر شناس کہتے ہیں

مظہر امام

○

اُن کو بھی میرا انتظار ہے آج
زندگی کتنی خوش گوار ہے آج

جانے کیا رنگِ ہجرِ یار ہے آج
دلِ مضطر کو کچھ قرار ہے آج

غیر کا ذکر ناگوار ہے آج
آپ کو مجھ سے کتنا پیار ہے آج!

دامنِ عشق کا بھلا کیا ذکر
دامنِ حسن تار تار ہے آج

وقت ہے عرضِ مدعا کر لوں
آپ کو مجھ پہ اعتبار ہے آج

تجھ پہ اے جانِ آرزوئے حیات!
دولتِ آرزو نثار ہے آج

عشق کی تیز گامیاں مت پوچھ
منزلِ حسن خود غبار ہے آج

روح کے ساتھ جسم بھی ہے قریب
قسمتِ شوق سازگار ہے آج

اک خلش تھی سو اب بھی پنہاں ہے
اور جو کچھ ہے، آشکار ہے آج

چھوڑ رہا ہوں میں سرحدِ تکمیل
مقصدِ عشق کامگار ہے آج

گاؤ، مظہر امام! نغمے گاؤ
گلشنِ فکر میں بہار ہے آج

افضل احسن

○

دشتِ وفا کو دوستو سیراب کر گئے
چھینٹے مرے لہو کے جو اُڑ کر اُدھر گئے

جب بھی تری نظر کا اُٹھا ہاتھ اس طرف
دوشیزۂ حیات کے کاکل سنور گئے

پتھر تئے تو حدّتِ غم سے سُلگ اُٹھے
اس شہر میں وہ مرحلے ہم پہ گذر گئے

جو دشمنوں کے ہاتھ سے جور و ستم بچے
وہ اپنے دوستوں کے کرم ہم پہ کر گئے

اب نہ کہیں وہ برق نہ وہ صرصر و سموم
کیا ہم حدودِ صحنِ چمن سے گذر گئے

شب بھر تو تیرگی سے بڑی کشمکش رہی
سورج چڑھا تو دل کے سب ارمان مر گئے

احسن ہمیں تو شدتِ غم راس آ گئی
ہم پھول تھے جو آگ میں رہ کر نکھر گئے

پڑھنے والوں کے خطوط

پروفیسر یوسف جمال انصاری

جولائی کے شمارے میں آپ کا اداریہ نہایت اہم اور فکر انگیز ہے۔ البتہ میرے خیال میں قارئین کا ایڈیٹر کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔
میرے خیال میں امریکی مطبوعات کے تراجم مفید خدمت انجام دے رہے ہیں، اور ہمیں مغربی ادب اور علوم و فنون سے متعارف کرا رہے ہیں قریب قریب تمام کتابیں خالصتاً علمی اور غیر سیاسی ہیں۔ امریکہ والوں کو تو اس سے غرض ہے کہ مصنف امریکی ہو۔ کتاب کی افادیت پاکستانی مترجم اور پاکستانی ناشر طے کرتے ہیں۔
رہا ترجمے کا مسئلہ تو آخر غریب اردو کو دوسری زبانوں کے علمی خزانوں سے کیوں محروم رکھا جائے اول تو ہر زبان میں ترجمے کا ایک دور آتا ناگزیر ہے پھر اس زمانے میں تو ہر جواہر پارہ ساری انسانیت کی میراث ہے۔
میں تو یہ کہوں گا کہ ہر ملک کی زبانوں کے تراجم اردو میں اسی شان کے ساتھ شائع ہوں تو اور بھی اچھا ہو۔
البتہ زد اگر پڑتی ہے تو ہمارے مناقع خور ناشروں پر۔ اب کتاب خریدنے والا فرنیکلن کی کتابوں کا سا گیٹ اپ مانگتا ہے۔
اور ہاں، فرنیکلن یا کسی اور کو کیا پڑی ہے کہ ہماری کتابوں کا ترجمہ اردو سے انگریزی یا کسی اور زبان میں کرے۔ کیا یہ گلہ ملکی ذمہ داری نہیں ہے؟

شہر یار

"ادبِ لطیف" کے تازہ شمارے میں آپ نے جس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ امریکی اشاعت گھر کے قیام سے دوسرے ادارے متاثر ہوئے ہیں۔ اور ادیب اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو تراجم کی نذر کرنے لگے ہیں تو اس میں قصوروار کون ہے؟ امریکی اشاعت گھر یا پاکستانی اشاعتی ادارے اور پاکستانی ادیب؟ اسی شمارہ میں ایک مضمون "فانی" پر شامل ہے۔ جس میں لکھنے والے نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "فانی" کا مرتبہ قدیم و جدید تمام اساتذہ سے بلند و برتر ہے۔
"فانی" کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں مقالہ نگار نے نثر میں جس مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اس کی مثال تو نظم میں بھی مشکل سے ملے گی۔ مقالہ کی ابتداء انہوں نے اس مفروضے سے کی ہے کہ فانی کو سمجھنے اور سمجھانے کی جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں۔ وہ قابلِ اعتنا و التفات توجہ نہیں ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ فانی کو اردو تنقید اور نقاد سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ ان کی علمیت اور مطالعہ کے بارے میں عجیب و غریب رائے قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کا یہ ارشاد محلِ نظر ہے کہ اردو کے تمام نقادوں نے فانی کو قنوطی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقالہ کی اس تشبیب کے بعد گریز [illegible] ہوتا ہے۔ جس میں [illegible] نے ہم کو یہ

بتانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ادب میں طربیہ کے مقابلے میں المیہ کی زیادہ اہمیت ہے۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں انہوں نے کچھ عام اور فرسودہ آرا کو پیش کیا ہے (طربیہ کے مقابلے میں المیہ کی اہمیت سے آج تک کسی نے انکار نہیں کیا) اور پھر فانی کو ایک عظیم المیہ نگار ٹھہرایا ہے۔ مقالہ میں غم اور المیہ کی بحث جس انداز سے کی گئی ہے۔ اس سے پہلی نظر میں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کا مطالعہ گہرا اور معلومات وسیع ہیں۔ لیکن جب ہم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مضمون نگار غم اور المیہ کو ایک دوسرے کا مترادف سمجھتا ہے۔ تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ مقالہ نگار کو شاید اتنی سی بات بھی معلوم نہیں کہ غم ہمیشہ المیہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو۔ جس کی زندگی غموں سے خالی ہو۔ لیکن ان میں سے چند ہی ایسے ہوں گے جن کی زندگیوں کو المیہ کہا جا سکے

میر اور فانی کا مقابلہ اپنی نوعیت کی پہلی اور شاید آخری کوشش ہے۔ (اردو ادب سے واقفیت رکھنے والے اس قسم کی تنقیدوں کے خاصے عادی ہیں) آگے چل کر فاضل مقالہ نگار نے ہم کو فانی کے سلسلے میں ایک بالکل اچھوتی بات بتائی ہے۔ کہ فانی کی شاعری سرسید تحریک کا ردِ عمل ہے۔ اور اس لئے رومانی ہے۔ اس تحقیقی کاوش کی داد نہیں دی جا سکتی۔ مقالہ کے اختتام پر جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون فانی پر نہیں۔ بلکہ فانی پر کبیر احمد جائسی کی کتاب پر تبصرہ ہے تو مقالہ نگار یا تبصرہ نگار سے زیادہ آپ سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ "ادبِ لطیف" کے معیار کو دیکھتے ہوئے اس کی اشاعت کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔

غلام الثقلین نقوی کا افسانہ سردار جعفری، وزیر آغا اور مصطفیٰ زیدی کی نظمیں بہت پسند آئیں۔

خیر الدین انصاری

میں ادبِ لطیف کے ہر شمارے کا مطالعہ بڑی باقاعدگی سے کرتا ہوں اور مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی ہے احساس ہوتا ہے کہ ادبِ لطیف کا ہر شمارہ اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے لحاظ سے معیاری ہوتا ہے۔

جولائی کے پرچے میں آپ نے امریکی کتابوں کے تراجم کی اشاعت کے بارے میں جس جرأت مندی کا ثبوت دیا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ امید ہے حکومتِ وقت آپ کی بات پر سنجیدگی سے غور کرے گی۔ اور ہمارے ملک کے ادیبوں کی نمائندہ جماعت اس مسئلہ کو حکومت کے نوٹس میں لانے کے لئے اپنے تمام ذرائع استعمال کرے گی۔ آپ کا یہ کہنا کہ امریکہ اگر اپنی مطبوعات کے ذریعے ہمیں پیامِ دوستی دے رہا ہے۔ تو ہمارا پیامِ محبت کیوں نہیں قبول کرتا۔" وقت کا صحیح تقاضہ ہے ہم پاکستانیوں کو غیر ملکی ادب سے زیادہ یہاں کے ادب کی ضرورت ہے۔ جس کے مطالعہ سے ہمارے دلوں میں حب الوطنی تقویت پکڑے اور شہری شعور میں ترقی ہو۔

مکتبہ فرینکلن کی سرگرمیوں سے ہمارے تخلیقی ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سے ذہین فنکار دولت کے لالچ میں آکر تخلیقی کاموں سے کنارہ کش ہو کر امریکی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے میں مصروف ہو گئے ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ وہ امریکی ادب کو اپنی زبان میں پیش کر کے نوآموز ادیبوں کے سامنے ادبیاتِ عالیہ کے نمونے رکھ رہے ہیں۔ تاکہ وہ آفاقی ادب کا مفہوم جان لینے میں کسی قسم کی دقت سے دوچار نہ ہوں میں ان لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا ہوں کہ کسی غیر زبان کے ادب کو جس خوبی سے چاہیں اپنی زبان میں لے آئیں وہ ہمارا ادب نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ ہی اس سے وہ تقاضے پورے ہو سکتے ہیں جنہیں ہمارے ملک کی تخلیقات بڑے احسن طریق سے پوری کر سکتی ہیں۔ اس شمارے کے دونوں مقالے بہت خوب تھے جسٹس ایس اے رحمان اور انور صدیقی نے اکبر اور فانی کو نئے ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ ان مقالوں کے مطالعے سے ان شاعروں کے بارے میں ہمارے نظریات بدلتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ افسانوی حصہ میں طبع زاد افسانوں میں غلام الثقلین نقوی اور ظہیر کاشمیری کے افسانے پسند آئے۔ غلام الثقلین نقوی کی عبارت آرائی اور افسانے میں کرداروں کی موزونیت نے اس افسانے کو کافی بلند کر دیا ہے۔ ترجموں میں محمد عمر میمن کا ترجمہ خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ غزل میں محمد زماں ہاشمی کی غزل کا ہر شعر لطیف ترجمہ نگار ہے لیکن اس شعر نے تو میرے دل کو بالکل تڑپا کے رکھ دیا۔

کلیوں کو دامنِ بہار میں گو نہ سجا سکا، مگر نہ تھم — ماتم تو کر رہوں اجڑی ہوئی شاخسار کا۔



مغربی پاکستان کا تاریخی شہر

نیو سلیبس

انگلش گرائمر اینڈ کمپوزیشن

از

صوفی نذر محمد سیال (ایم ۔ اے)

و

سید نیاز احمد ترمذی (ایم ۔ اے)

یہ کتاب ماہرینِ تعلیم کی متفقہ رائے کے مطابق ثانوی جماعتوں کے طلباء کے لئے بہترین تسلیم کی گئی ہے ۔

لائق اور فاضل مصنفوں نے اس کتاب کو لکھتے وقت نئے سلیبس کے تمام قواعد و ضوابط کی پوری پوری پابندی کی ہے ۔

یہ کتاب تمام طلباء بڑے شوق سے خریدتے ہیں ۔ طلباء کو انگریزی گرائمر اور کمپوزیشن میں جتنی بھی دقتیں پیش آ سکتی ہیں وہ سب کی سب دور کر دی گئی ہیں ۔

اپنے موضوع کی بہترین کتاب !
بہترین کتابت و طباعت کے ساتھ

☆

پنجاب بک ڈپو ☆ لاہور

Regd L. NO. 3521


ادبِ لطیف

منظور شدہ برائے مدارس کراچی و مغربی پاکستان بموجب سرکلر نمبر ۵۴/۰۶ ۵۳۵۰ مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء
۲۷۷۶۷۹ مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۴ء ——— بموجب سرکلر نمبر ۵ ۲۰ مورخہ ۲۲ اپریل

بانی چودھری برکت علی مرحوم

ماہنامہ

ادبِ لطیف

لاہور

اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء

مینجنگ ایڈیٹر
افتخار علی چودھری

مرتب
میرزا ادیب

زرِ سالانہ :- دس روپے (۱۰)

فی پرچہ
۷۵ پیسے

غیر ممالک میں :- بارہ روپے (۱۲)

مکتبہ ادبِ لطیف ○ لاہور

افتخار علی چودھری نے اُردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر "ادبِ لطیف" سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

پیرایۂ آغاز

ادبِ لطیف کی ایک سابقہ اشاعت میں ہم نے، اعلان کیا تھا کہ عنقریب پرچے میں دو مستقل باب قائم کئے جا رہے ہیں اور موجودہ اشاعت سے یہ سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے!

ایک مستقل عنوان ہے 'جدید ادب' جس کے لکھنے والے شہاب جعفری ہیں۔

شہاب جعفری ایک شاعر بھی ہیں اور ناقد بھی۔ ادبِ لطیف کے پڑھنے والے اُن کی خوبصورت نظمیں بھی پڑھتے رہتے ہیں اور انتقادی تحریریں بھی پچھلے چند برسوں سے جو نئے ذہن تنقید کے میدان میں آئے ہیں ان میں شہاب جعفری کم و بیش سب سے نمایاں ہیں۔ شہاب صاحب ادبی مسائل پر غور و فکر کر کے نتائج اخذ کرنا جانتے ہیں۔ دوسروں کی کورانہ تقلید نہیں کرتے — اور اُن کی یہ خوبی ہمیں خاص طور پر متاثر کرتی ہے۔

اعجاز عسکری صاحب نے ابھی بہت کم لکھا ہے مگر جو کچھ لکھا ہے وہ سنجیدہ فکر کا نتیجہ ہے۔ ہمیں ان کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اعجاز عسکری صاحب برابر آگے بڑھتے جائیں گے۔

اعجاز عسکری صاحب ادبِ لطیف میں 'دامِ خیال' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے۔

ابو الاعجاز حفیظ صدیقی صاحب نے اب کے نظمِ جدید کے بارے میں ایک مبسوط مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ ہمیں محترم مقالہ نگار کی بعض رایوں سے اختلاف ہے — اور وہ کون سا ایسا مقالہ ہو سکتا ہے جس میں صاحبِ مقالہ کی رائے سے کلی اتفاق ہو — مگر یہ بات پورے تیقن سے کہی جا سکتی ہے کہ صدیقی صاحب نے اکثر باتیں بڑے مدلل انداز میں کہی ہیں۔ اور جن باتوں سے اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے انہیں بھی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا!

○

ادبِ لطیف

کا آئندہ شمارہ

بابائے اُردو مرحوم کی ذات و تخلیقات کیلئے وقف ہوگا!

افکار و مسائل

بابائے اُردو کی جانشینی

مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد وہ جگہ خالی ہو گئی ہے جس سے مرحوم بابائے اُردو وابستہ تھے۔

مولوی صاحب کو اُردو زبان سے جو والہانہ شیفتگی تھی، وہ انہی کے ساتھ رخصت ہو گئی ہے۔ ان جیسا مردِ میدان ملنا تو قریب قریب محال ہے مگر ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ اُن کے جانے پر جو جگہ خالی ہو گئی ہے وہ ہمیشہ خالی ہی رہے!

زندگی اور موت کا سلسلہ تو بہر صورت قائم ہی رہتا ہے۔ لوگ آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں اور جب چلے جاتے ہیں تو پھر اُن کے فرائض دوسروں کے سپرد ہو جاتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ جو شخص چلا جائے اس کا نعم البدل ملنا ایک امرِ محال ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں کہ خالی آسامی کسی اور کے وجود سے پُر ہی نہ ہو۔ جانے والوں سے بہتر لوگ بھی آ سکتے ہیں اور کم تر بھی۔ کام تو بہرحال جاری ہی رہتا ہے اور اسے جاری ہی رہنا چاہیئے!

مرحوم بابائے اُردو کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کا نعم البدل ملنا ناممکن ہے۔ بھلا کون ایسا شخص ہوگا جو اپنی زبان ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لے اور اپنی طویل زندگی کی تمام جدّوجہد اس کے لیے وقف کر دے! ایسا شخص ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا مگر اس کا مطلب یہ بھی تو نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم اس باب میں سرے سے مایوس ہو کر ہی بیٹھ جائیں یا اپنوں سے ناامید ہو کر مولوی صاحب کا نعم البدل اپنے ہمسایہ ملک میں تلاش کرنے لگیں۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو یہ فعل صریحاً ناانصافی ہے اپنے اہلِ علم کے ساتھ — اور نہایت تکلیف دہ مظاہرہ ہے اپنے احساسِ کمتری کا!

ہماری سب سے بڑی کمزوری وہ احساس ہے کمتری کا جسے غلامانہ ذہن کی شرمناک پیداوار کہنا چاہیئے، ہمیں نہ تو اپنے ادب میں کوئی خوبی نظر آتی ہے اور نہ اپنی زبان میں۔ اپنے ادب کا ذکر چھڑ جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہ ادب ترقی یافتہ ادب سے ابھی ہزاروں میل پیچھے ہے۔ زبان پر بحث ہو تو اعلان کیا جاتا ہے کہ اُردو ابھی اس قابل بھی نہیں ہوئی کہ کسی سائنس کے لیے ذریعہ تعلیم بن سکے اور جب کسی ادارے کا سربراہ فوت ہوتا ہے تو سوچنے والے سوچتے ہیں — ہمارے ہاں تو کوئی شخص اس جگہ کے قابل ہی نہیں ہے۔ ہمسایہ ملک ہی سے کسی جوہر قابل کو بلانا چاہیئے! — اس اندازِ فکر کے پس منظر میں احساسِ کمتری کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے — اور جب تک یہ کمتری کا احساس ہمارے راستے کا روڑا بنا ہوا ہے — ہماری سُست روی کبھی تیز روی میں تبدیل نہیں ہو سکتی!

انجمن ترقی اُردو کے صدرِ محترم کا انتقال ایک دردناک حادثہ ہے۔ مگر اس سے زیادہ دردناک حادثہ یہ ہے کہ ہم صدارت کی اس اسامی کو پُر کرنے کے لیے ہندوستان کے ایک بزرگ کو بلانے کی سوچ رہے ہیں۔

مانا کہ یہ بزرگ ایک جید عالم ہیں ـــــ ایک بہت بڑے ادیب ہیں ـــ اور ان کی علمی فضیلت کا ہر جگہ احترام بھی کیا جاتا ہے ـــ لیکن سوال یہ ہے کیا ہمارے ہاں ایسا ہی قحط الرجال برپا ہے کہ ہمیں قابل لوگ کہیں نظر ہی نہیں آتے اور اگر دو چار نظر آتے بھی ہیں تو وہ پہلے ہی اپنے منصبی فرائض کی گراں باری کے شکوہ سنج ہیں۔ ان پر مزید بوجھ کیونکر ڈالا جاسکتا ہے ؟

یہ سوچ سراسر غیر حقیقت پسندانہ ہے !

ہمارے ہاں قابل آدمیوں کی مطلقاً کمی نہیں ـــ بلکہ ہمیں تو شکایت اس بات کی ہے کہ ہمارے ہاں اچھے لوگوں کو کام کرنے کا مناسب موقعہ ہی نہیں دیا جاتا اور وہ چپ چاپ گمنامی کے گوشے میں بیٹھے اچھے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں اور نہ جانے کب تک انتظار کرتے رہیں گے !

علم و ادب کے ہر مرحلے پر چند شخصیتیں ہی اکثر و بیشتر سامنے آتی رہتی ہیں ـــ کیا مجال جو کوئی اور شخص بھی ان کے ہم دوش کھڑا ہو سکے ـــ یہ نتیجہ ہے اس چیز کا کہ یا تو ہم اوروں سے کام لینا جانتے ہی نہیں یا پھر ہمیں معلوم ہی نہیں کہ کن لوگوں سے کیا کام لیا جاسکتا ہے !

جب کسی جوہرِ قابل کی صلاحیت نہیں پہچانی جاتی تو یہ حادثہ ایک قسم کا قومی المیہ بن جاتا ہے اور ہمارے ہاں یہ قومی المیہ عام ہے !

خیر یہ مسئلہ تو الگ طور پر دعوت فکر دیتا ہے۔ اظہارِ خیال اس موضوع پر ہو رہا تھا کہ بابائے اردو کی جانشینی کے معاملے میں اپنوں کو نظر انداز کر کے ہندوستان کے کسی ادیب کو بلانا بالکل غیر مناسب امر ہے اور جو حضرات اس طرح سوچ رہے ہیں وہ سخت غلطی کر رہے ہیں !

جب کسی کو کام کرنے کا موقعہ ہی نہیں دیا جائے گا تو یہ کیسے معلوم ہو سکے گا کہ ہم میں کام کرنے والے آدمی موجود ہیں یا نہیں ہیں ! ـــ یہ درست کہ کوئی شخص بابائے اردو جیسی لگن کے ساتھ اردو کی خدمت نہیں کر سکتا مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ہمارے ہاں اپنی زبان سے بے پناہ محبت کرنے والے لوگ موجود ہی نہ ہوں ـــ آخر انھیں کیوں نہ کام کرنے کا موقعہ دیا جائے اور کیوں غیر ملکیوں کی طرف دیکھا جائے !!

اس مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کی ضرورت ہے !

○

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی

کچھ نظمِ جدید کے بارے میں

بعض لوگ تو ادب کو ابلاغ اور صرف ابلاغ سمجھنے پر مصر ہیں۔ اگر ان لوگوں کی رائے کو انتہا پسندانہ سمجھ کر نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ تو بھی اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں کہ ادب میں ابلاغ ہی اہم ترین عنصر ہے۔ ادب کسی خارجی اور الگ مقصدیت کا حامل ہو۔ یا اس کا فرض فقط ذوقِ جمال کی تسکین و تشفی ہو۔ اگر وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچا نہیں سکتا۔ اور فنکار کا ما فی الضمیر فنکار کے اپنے ہی ذہن میں رہ جاتا ہے۔ تو آخر اس کا مصرف ؟

ادب کو تو قاری اور فنکار مل کر تخلیق کرتے ہیں۔ صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ میں تو اپنی نفسیاتی الجھنوں پر قابو پانے کے لئے لکھتا ہوں۔ مجھے تو اپنے جذبات کی آسودگی مطلوب ہے۔ یا یہ کہ میں نے اپنی تخلیق کا مفہوم پالیا ہے۔ مجھے دوسروں سے کیا غرض۔ کیونکہ جب آپ اپنی کوئی تخلیق منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ تو دوسروں کو مداخلت کا حق بھی دیتے ہیں۔ اس لئے قاری کے ساتھ ذہنی رابطہ قائم کر کے افہام و تفہیم کی منازل سے گذرنا تخلیقِ ادب کی ایک کڑی شرط بن جاتا ہے۔

غالب کو یہی مشکل پیش آئی تھی۔ وہ اپنی تخلیقی پرواز کے دوران میں فرض کر لیتا تھا کہ اگر میرے خیالات الفاظ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ تو ابلاغ کا مسئلہ بھی لازماً ساتھ ہی ساتھ حل ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے اسے الگ سے سوچنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے قارئین کو جو آسان کہنے کی فرمائش کرتے تھے۔ جاہل سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ لیکن قاری اور فنکار کے درمیان ابلاغ کا رشتہ ہی کٹ جائے۔ تو تخلیق کی گاڑی کب تک چل سکتی ہے۔ آخر غالب کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس کے قارئین جاہل نہیں سخنورانِ کامل تھے۔ جو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر پر پیچ استعارات اور محذوفات و معقدات کی پیچیدگیوں کی وجہ سے کلامِ غالب کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ غالب کو یہ بھی احساس ہوا کہ غلطی قاری کی نہیں اس کی اپنی ہے۔ جو اپنی تخلیقی پرواز کو من وعن قاری کی تقلیدی پرواز کا مترادف سمجھتا تھا۔ سمجھنا قاری ہی کا کام سہی۔ لیکن سمجھانا تو فنکار کا کام ہے۔ فنکار وجود کہہ کر عدم مراد لے تو فن کا یہ تقاضا بھی ملحوظ رکھے کہ ادبی روایت یا عبارت کے سیاق و سباق سے اس کا جواز مل سکے۔ تلازمِ خیالات کا عمل بڑی حد تک انفرادی چیز ہے۔ ایک شخص کو "اندھیرا" کا لفظ سن کر نشاطِ جنسی کا تصور پیدا ہوتا ہے تو دوسرے شخص کا ذہن اس لفظ سے خوف کی لہر محسوس کرتا ہے۔ ایک عالم شخص کا ذہن اس لفظ سے "جہالت" کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ دودھ کا جلا چھاچھ اس لئے پھونک پھونک کر پیتا ہے کہ اس کے کسی تلخ اور انفرادی تجربے نے اسے بتایا ہے کہ سفید سیال کے ساتھ لب سوز حدت لازم و ملزوم ہے۔ ژنگ کی تحلیلی نفسیات میں اس حقیقت کو سائنسی رنگ دے کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب ادب میں ایسے کنایات اور رموز و علائم استعمال کئے جاتے ہیں۔ تو روایت کا تسلسل انتقالِ ذہنی میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ کیونکہ روایت سماجی ورثہ کی شکل میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور الفاظ کی تصور آفرینی اور ہیئت زائی کا عمل روایت کے سائے میں خفیف اختلاف کے ساتھ یکساں ہوتا ہے۔ سیاق و سباق کے قرائن اختلافِ توجیہہ کے امکان کو کم کرتے ہیں۔ اور اس طرح ابلاغ کا رشتہ قائم رہ جاتا

ہے۔ میں نے روایت کو تہذیبی اور سماجی ورثہ کہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اس ورثے میں ہر نسل حسبِ استطاعت اضافہ کرتی ہے۔ لیکن اس اضافے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ روایت کی ایمائیت اور اشاریت نئے رموز و علائم سے متصادم و متناقض نہ ہو۔ علائم کا ارتقائی اختلاف ایک دوسری چیز ہے۔ اور ادب کے ارتقا کے لئے ضروری بھی۔ "محتسب" ایک بے حد پرانا اشارہ ہے۔ جسے کلاسیکی دور کے فارسی شعرا نے ایک خاص معاشرتی ادارے کی علامت کے طور پر وضع کیا تھا۔ آج اس لفظ کو ترقی پسند شعرا کے ہاں دیکھئے۔ اشارے کا ارتقائی اختلاف تو آپ کو نظر آئے گا۔ لیکن تضاد و تناقض کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ اس اشارے میں ادب سے لگاؤ رکھنے والے ہر قاری سے ایک جیسا ردِ عمل حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہی روایت کا تسلسل ہے۔ اس طرح علائم و رموز قاری اور فنکار کے اذہان کے درمیان پل بنا کر خیالات و احساسات کو منتقل کرتے ہیں۔

اب رہا وضعِ علائم کا سوال تو یہاں بھی اشارے کا اپنے موضوع لۂ تک سریع الانتقال، قریبِ قیاس، سہل الحصول اور قریب الفہم ہونا ضروری ہے۔ اگر اشارے اور موضوع لۂ کے درمیان خلا بہت طویل ہو۔ جسے ذہن کی واحد جست عبور نہ کر سکے۔ یا اشارے اور موضوع لۂ کے درمیان کچھ ایسی اشیا واقع ہوں جن پر موضوع لۂ کا شبہ ہو سکے تو سمجھ لیجئے کہ اشارے کا ادبی مقام حاصل کرنا۔ اور ابہام و تفہیم کی منزل سے گذرنا مشکل ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ فنکار کا ضمیر کثرتِ تعبیر سے خوابِ پریشاں بن جائے گا۔ اور یہ قصور فنکار کا ہوگا۔ قاری کا نہیں۔

وضعِ علائم کے عمل میں عصری معاشرت، سیاسی زندگی اور جغرافیائی حالات بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ علائم ہوا میں جنم نہیں لیتے۔ مذکورہ بالا مثال میں "محتسب" کی علامت ایک ایسے عہد میں پیدا ہوئی۔ جب محتسب سیاسی اور سماجی زندگی میں اپنا مقام بنا چکا تھا۔ اور اس سے وابستہ تصوّرات عام ہو چکے تھے۔ اور یہ لفظ اپنے سیاق و سباق سے کٹ کر یا الفاظِ دیگر کلامِ تام سے الگ ہو کر بھی اپنے موضوع لۂ کا تصور دلا سکتا تھا۔ آج کل نظمِ جدید میں مکان اور باغ کی علامات جنسی مفہوم میں معانی کا لباس پہن چکی ہیں۔ لیکن فرائڈ اور اس کے مقلدین کی تحقیقات سے قبل یہ اشارہ قطعی طور پر بے معنی تھا۔ علائم کی تصوّر زائی میں جغرافیائی اور سیاسی حالات کے علاوہ مختلف اقوام کے مخصوص طرزِ تفکر کو بھی کافی دخل ہے۔ یہی وہ فرق ہے جو یونان، مصر اور ہندوستان کی دیو مالا میں ملتا ہے۔

آج کشمیر، کوریا اور ہیروشیما کے الفاظ جس تصوّر کی تعبیر کرتے ہیں۔ وہ آج سے کچھ مدت پہلے تک ناممکن تھا۔ سائنسی ایجادات، علمی دریافتیں، فنی ارتقا، اہم سیاسی واقعات و حادثات ایک بین الاقوامی اشاریت کو جنم دے رہے ہیں۔ لیکن ہر اشارہ بین الاقوامی نہیں ہو سکتا۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا۔ کہ روایت کے تسلسل میں تضاد و تناقض نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ روایت کا رشتہ کٹ جاتا ہے۔ اب مجھے دفعِ دخلِ مقدر کے طور پر ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے۔ عرفی، نظیری اور فیضی کے لئے کشمیر جس قسم کا انبساط انگیز تصور پیش کرتا تھا۔ آج بھی ممکن ہے۔ لیکن آج لفظ کشمیر ایک دوسری قسم کا تصور بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ تصوّر کشمیر کی موجودہ سیاسی حالت کا نتیجہ ہے۔ جو بظاہر قدیم تصور سے متصادم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ تضاد و تناقض نہیں۔ بلکہ ایک نیا اشارہ ہے۔ جو تاریخ کے ایک خاص موڑ پہ خاص سیاسی حالات کے تحت پیدا ہوا۔ اس سے پرانی روایت کے تسلسل میں فرق نہیں آیا۔ آج بھی کشمیر کے حسن پر نظم لکھی جا سکتی ہے۔ اس کی جھیلوں، مرغزاروں، وادیوں اور پھولوں کو سراہا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ کشمیر کی مظلومیت پر بھی نظم لکھ سکتے ہیں کہ یہ اس کی دوسری حیثیت ہے۔

* جدید نظم کے بانیوں نے ندرت پسندی اور جدت طرازی کے شوق میں یہ زحمت گوارا نہ کی کہ نئی اشاریت کو رفتہ رفتہ قابلِ فہم بنا لیں۔ اور اسے روایت کا جزو بنا کر اس سے نئی معنویت اخذ کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قاری اور فنکار کا ذہنی رشتہ کٹ گیا۔ قاری جدید نظم کو بے معنی بتاتا

ہے۔ اور فنکار قاری کی پستیٔ ذہن اور نارسائی کا نوحہ خواں ہے۔ فنکاروں نے اپنی تخلیقی پروازیں پیچھے مڑکر دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ کہ آیا قاری بھی پیچھے پیچھے آرہا ہے یا نہیں۔ ادھر قاری کو نہ اس سفر کی غرض و غایت کا علم تھا نہ اس کے راستوں کے متعلق کچھ اٹکل چنانچہ اس جگہ حسرت اور فراق ہی غنیمت نظر آئے کہ چلو اور کچھ نہ سہی۔ آدمی بھاگ دوڑ کر ان کا ساتھ تو دے سکتا ہے۔ وہ ذرا آگے بھی نکل جائیں۔ اور نظروں سے اوجھل بھی ہونے لگیں۔ تو بھی کوئی بات نہیں۔ مقطع پر جاکر پکڑ لیں گے۔

دراصل نظمِ جدید بالخصوص نظمِ آزاد شروع کرنے والوں نے قاری کو وہاں سے جاکر ساتھ نہیں لیا۔ جہاں وہ غزلوں، قطعوں، رباعیوں، مثنویوں اور مرثیوں کے ڈھیر پہ بیٹھا ان کا منتظر تھا۔ بلکہ بھاگ کر کوئی سو میل آگے نکل گئے۔ اور وہاں سے لگے آوازیں دینے۔ چنانچہ عام قاری کا تو ذکر ہی کیا۔ نقاد قاری اور فنکار قاری جو اس آواز پر لبیک لبیک کہتے ہوئے بھاگے بھی، کچھ نہ پا سکے۔ اس کی ذمہ داری اردو ادب میں ہمیشہ میرا جی کے سر جاتی ہے۔ اور آج نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ ناظم نظم کہہ دیتا ہے۔ اب آپ اسے معنی کا لباس پہناتے پھریں۔ گویا نظمِ جدید کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ شاعر کو ابلاغ کی ذمہ داری سے آزاد کر دیا گیا ہے اور قاری سے توقع کی جاتی ہے۔ کہ چند نامانوس اور بے ربط رموز و علائم کی مدد سے خود ہی نظم کی تخلیق کرے اور خود ہی اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ بعض اوقات تو وہ بالکل ہی سمجھ نہیں پاتا۔ اور کبھی کبھار اصل شاعر سے بھی کہیں زیادہ اور کہیں بہتر سمجھ لیتا ہے۔ جیسا کہ شاد صاحب کی نظم "اپنا مکان" کو عارف عبدالمتین اور نسیم شائق پوری جیسے اصحاب نے سمجھا ہے۔

نظمِ جدید کے خالقین کو چاہیئے۔ کہ پہلے تو اس خلا کو پورا کرنے کی کوشش کریں جو غزل سے نظمِ جدید تک کی طول جست سے پیدا ہوا ہے۔ دوسرے اس معنوی ابہام کو بھی کم کریں جو اشاریت کے بہانے نظمِ جدید کا طغرائے امتیاز بنتا جا رہا ہے۔ کیونکہ نظم ہو یا نثر۔ مقصد تو اظہار ہے۔ اخفا نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عام اظہار اور فنکارانہ اظہار میں بہت فرق ہے۔ مؤخرالذکر کے لئے بعض جزئیات کا اخفا بھی ضروری ہے۔ تاکہ کاروباری نثر کی سی اچاٹ بے کیفی فن پارے میں داخل نہ ہو جائے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نکال لینا کہ ابہام شعر کی شرطِ اوّل ہے۔ غیر حقیقت پسندانہ بات ہے۔ اخفا اور ابہام میں بہت فرق ہے۔ غالب جزئیات کے اخفا سے اختصار اور تاثر آفرینی کا کام لیتا ہے۔ لیکن یہ شعر:

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے۔
فلسِ ماہی کے رخ شمع شبستاں ہوں گے　　(مومن)

اخفا کی نہیں ابہام کی مثال ہے۔ چند جزئیات کو محذوفات بنا کر طے شدہ تسلیم کر لینے میں یہ خطرہ ہے کہ اشیاء و واقعات کی وہ ترتیب اور ان کا سلسلۂ تلازم جو شاعر کے شعور کا جزو بن چکا ہے۔ قاری کو من و عن اور بعینہٖ اس ترتیب کے ساتھ میسر نہیں ہوتا۔ اس لئے ابلاغ کی راہ میں دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ یہاں شاعر کو چاہیئے کہ اپنی خالقِ فن کی حیثیت سے الگ ہو کر اپنی ذیلی شخصیتوں بالخصوص ایک عام قاری کی شخصیت کو اجازت دے کہ وہ اس فن کا جائزہ لے کہ آیا معانی اور فضا دونوں کا ابلاغ ہو چکا ہے۔ یہ عمل کوئی مابعدالطبیعاتی قسم کا تجربہ یا واردات نہیں۔ بلکہ سیدھی سی بات ہے۔ کہ فن پارے کو دوسرے کے نتائجِ فکر سمجھ کر اس کا جائزہ لے۔ اور حتی الامکان اپنی خالقِ فن کی حیثیت کو اس میں دخیل ہونے سے روکے۔ ہر نارمل شخصیت کی کئی تہیں اور کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ ابنارمل کی دوہری شخصیت تو ذیلی شخصیات کی شدید بے آہنگی اور مریضانہ تضاد سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے جائزہ لینے کے اس عمل میں ابنارمل ہونے کی نہیں، صرف غیر جانبدار رہنے کی ضرورت ہے۔

نظمِ جدید والوں کا کہنا ہے کہ غزل کی قدیم اشاریت پرانے ساز و سامان کا تصور دلاتی ہے۔ جس سے نظمِ جدید میں بھی قدیم شاعری کی سی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ہم یکسر نئی اشاریت وضع کریں گے۔ یہ "یکسر نئی اشاریت" ایک قسم کا سراب ہے۔ کیونکہ اگر اشاریت کے ساتھ کچھ معانی

فارسی یک سے منتقل کرنا مقصود ہے تو کوئی اشاریت بھی یکسر نئی نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسی کوشش کی جائے گی تو کلام نہ صرف مبہم بلکہ مہمل ہو جائے گا۔ یکسر نئی اشاریت "شاقی" ایسا خیالی درخت ہے جس کی جڑیں ہی نہ ہوں۔ جدید ادب والوں نے پرانی نسل کے خلاف بغاوت کرتے وقت نافرمان اولاد خیال مندوں کی طرح یہ سمجھا تھا کہ ہم اباجان سے بے تعلق ہو کر ان کی وراثت سے بے نیاز ہو کر بھی زندگی بسر کر جائیں گے۔ یہ محض ان کی جذباتیت تھی جس کے نتائج اہلِ فکر کے سامنے ہیں۔ غزل کی روز افزوں مقبولیت، قافیہ اور ردیف کی طرف از سرِ نو توجہ کی تاویل و توجیہ میں نقاد حضرات نے بہت زور مارا ہے۔ لیکن نقاد لوگ جن میں سے بیشتر کا تعلق اسی نسل اور اسی دور سے ہے اس حقیقت کے اعتراف سے آنکھیں چراتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی اندھی جذباتیت اور جوان خون کی بے جا تپش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ردِ عمل کے طور پر غزل پھر ابھری۔ اور چونکہ غزل پرانی نسل کا ورثہ تھا۔ اس لئے جدید ادب والوں نے اسے بدلنا چاہا۔ تاکہ وہ ابا جان سے کہہ سکیں "جناب یہ آپ کا مال نہیں ہمارے حق حلال کی کمائی ہے۔" یہ ہے غزل کی ترقی اور روز افزوں مقبولیت کا پس منظر۔ اور غزل کی اس کامیابی سے بعض نظم گو شعرا بھی متاثر ہوئے۔ غزل کی افسردگی نظموں پر بھی اثر انداز ہونے لگی اس عہد کو تصوف بھی راس آ سکتا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ احیائے تصوف کی کوئی تحریک نہیں چلی۔ اور مغرب کی نیم صوفیانہ تحریکات کو اقبال پہلے ہی نچوڑ نکال چکے تھے۔

ناقابلِ تغیر صحیفۂ فطرت سے اخذ کردہ سمبل یا اصل انسانی فطرت کا اظہار کرنے والے عالمگیر اشارے بھی موجود ہیں۔ جیسے سورج کی حرارت دھوپ اور روشنی کا منبع ہے۔ تینوں کے لئے سمبل کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک اسکیمو کے لئے سورج کا لفظ جس طویل المیعاد حرارت، دھوپ اور روشنی کا تصور رکھتا ہے۔ اس کا تعلق قطبِ ارضی اور سورج کے باہمی رشتہ سے ہے سورج وہی ہے لیکن راچپوتانہ اور قطبین کے خطۂ ہائے ارض کی مناسبت اور تعلق سے اس لفظ کی معنویت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ فارسی اور اردو سے ہم نے خزاں کا جو تصور حاصل کیا ہے وہ کیٹس کی "خزاں" پڑھنے میں معاون نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کیٹس کی خزاں جغرافیائی اعتبار سے رشکِ بہار ہے۔ ایرانی مزاج کے اعتبار سے وہ خزاں ہے ہی نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ اشاریت کوئی سی ہو۔ اپنے معانی میں عیاں بالذات اور خود مختار نہیں ہوتی۔ اس سے وابستہ تصورات اور معانی کو متعین کرنا پڑتا ہے۔ پھر اس کی نشر و اشاعت کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ تاکہ قاری کا ذہن اشارات سے مرجع تک بسہولت منتقل ہو سکے۔ جدید شاعری والوں نے غلطی یہ کی کہ انہوں نے فرانسیسی اور انگریزی جیسی سات سمندر پار کی زبانوں سے اشاریت مستعار لے کر اردو نظم کے سر دے ماری۔ اور یہ ہرگز نہ سوچا کہ یہ اشارے انگریزی یا فرانسیسی میں متعین معانی کا تصور رکھتے ہیں۔ (اگرچہ یہ بات بھی محلِ نظر ہے) تو ضروری نہیں کہ اردو میں بھی وہ بعینہ انہیں معانی کا مرجع بن سکیں۔ اس سے پہلے شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا کے وقت بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال پیش آئی تھی۔ فارسی کی تمام تر اشاریت بے چاری ناتوان اردو کے کندھوں پر لاد دی گئی۔ لیکن اس دور میں شعرا کو چند ایسی سہولتیں حاصل تھیں۔ جو آج جدید شعرا کو میسر نہیں مسلمان فارسی سے آشنا تھے۔ معاشرہ اس رنگ سے اجنبی نہ تھا۔ روزمرہ گفتگو، خط و کتابت، تصنیف و تالیف، شعر و ادب جیسے تمام اہم شعبے فارسی کی دسترس میں تھے۔ پھر ایران اور ہندوستان کے ثقافتی روابط کے علاوہ فارسی اور اردو میں بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ فارسی اور اردو کے خمیر میں داخل تھی۔ اردو کے شاعر فارسی کے شاعر بھی تھے۔ اردو اور فارسی کے فن کاروں میں علمی تعلقات کے علاوہ ذاتی اور شخصی مراسم بھی تھے۔ اس لئے جب فارسی کی اشاریت کو اردو میں داخل کیا گیا تو اجنبیت کا احساس ہی نہ ہوا۔ قارئین کو تفہیم مطالب میں اور فن کاروں کو ابلاغِ مطالب میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ لیکن انگریزی کو ایسی رعایت حاصل نہ تھی۔ اس لئے انگریزی سے اخذ کردہ اور یورپین مزاج سے حاصل کی ہوئی اشاریت ہمارے ہاں قدم نہ جما سکی۔ اس کے علاوہ اس اشاریت میں ابہام کی تو خود انگریز آج تک شکایت کرتے ہیں۔ تا بہ دیگراں چہ رسد۔

ابلاغ میں معانی اور فضا دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ اگر فنکار صرف فضا کا ابلاغ کر پائے تو فن پارہ مجرد موسیقی یا تجریدی آرٹ کی سطح تک اتر آئے گا۔ اور اگر صرف معانی قاری تک منتقل ہوئے تو مناسب اور ہم آہنگ فضا کے بغیر وہ خلا ہی میں چکر کاٹتے رہیں گے۔ اور مطلوبہ تاثر کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ صرف وحدت کی ہم آہنگی اور مفاہیم و مطالب کے ساتھ تراکیب، وزن، بحر اور پوری زمین کی صوتی کیفیت کا تطابق اس حد تک اہمیت رکھتا ہے۔ کہ فنکارانہ اظہار میں فضا کا ابلاغ معانی کی ترسیل سے کم اہم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جدید نظم لکھنے والوں نے فضا کو خاص اہمیت دی ہے۔ یوں تو اس سے قبل بھی قدیم غزل گو شاعر اس تناسب کا احساس رکھتے تھے۔ مطالب کے ساتھ بحر کی مناسبت کا احساس میر تک کو رہا ہے۔ لیکن جدید نظم کے آغاز کے وقت تک یہ حقیقت شرائطِ فن میں شمار ہونے لگی تھی۔ اس لئے جدید شعراء نے شعوری طور پر [illegible] جو معانی کے ساتھ فضا کا ابلاغ بھی قاری تک کر سکیں۔ لیکن بیشتر یہ ہوا کہ اس کوشش میں معانی کا خون ہوتا رہا۔ قاری اور فنکار کا رشتہ پہلے ہی کٹ چکا تھا۔ اب الفاظ اور معانی کا رشتہ بھی کٹنے لگا۔ معانی الفاظ کی گرفت سے نکل کر اڑ گئے۔ اور صوتی تاثر فضا کی تعمیر کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ جب الفاظ کو معانی سے الگ ہو کر فضا کی تعمیر کرنی پڑے تو پھیکا راگ وجود میں آتا ہے۔ شعر تخلیق نہیں ہو سکتا۔

ابلاغ میں جو ابہام اور پیچیدگی پیدا ہوئی۔ اس کی ایک وجہ نظمِ آزاد کی مخالفت بھی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نظمِ معریٰ کو تو وزن اور آہنگ کے قدیم یا روایتی سانچے استعمال کرنے تھے۔ بادی النظر میں فرق صرف ردیف قافیہ کے عدم وجود کا تھا۔ اس لئے نظمِ معریٰ کی اتنی زیادہ مخالفت نہیں ہوئی۔ لیکن نظمِ آزاد میں مصرع اور وزن کے روایتی تصور کی بجائے ایک نیا تصور پیدا ہوا۔ جو آج بھی روایتی آہنگ کے مقابلے میں اردو نظم کے قاری کو اجنبی اور غیر مانوس لگتا ہے۔ آزاد نظم کے آغاز میں تو بیشتر لوگ بعد از تلاشِ بسیار بھی اس میں کسی آہنگ کی موجودگی دریافت نہیں کر سکتے تھے۔ اور اسے غیر موزوں، بے ربط، مہمل اور غیر شاعرانہ تجربہ ٹھہرایا گیا تھا۔ جو لوگ انگریزی شاعری کے جدید تجربات سے واقف نہ تھے۔ وہ اسے شعر یا نظم ماننے پر تیار نہ تھے۔ اور آج بھی بیشتر قاری نثر ہی سمجھتے ہیں۔ اور یہ محض اردو کے قارئین کی کور ذوقی نہیں۔ بلکہ راشد کی اولین آزاد نظم کو ایڈیٹر نے رسالے کے حصہ نثر میں جگہ دی تھی[1]۔ خیر تو جب آزاد نظم کو بے ربط نثر ٹھہرا دیا گیا۔ اور اس کی بے کیفی ناموزونیت اور سپاٹ پن معرضِ بحث میں آئے۔ تو جدید نظم لکھنے والوں نے اس بے کیف نثر میں شاعرانہ حسن اور فنی اہمیت پیدا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ سمبلزم کا سہارا لیا۔ جو ابہام پر منتج ہوا۔

میں لاہور اور کراچی کی بات تو نہیں جانتا۔ البتہ پندرہ ہزار افراد پر مشتمل اپنے اس چھوٹے سے قصبے[2] میں رہائش رکھنے والے قارئینِ ادب سے فرداً فرداً واقف ہوں۔ جو انگریزی تعلیم اور کسی حد تک تنقیدی بصیرت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود اس ٹیڑھی کھیر سے ہچکچاتے اور گھبراتے ہیں انہیں نظمِ آزاد وسیع پیمانے پر ایک سنجیدہ مذاق معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ ایک دوست کا کہنا ہے کہ نظمِ آزاد قارئین کا مذاقِ سخن بگاڑنے کے لئے ایک منظم اور مکروہ سازش ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ لوگ واقعتاً مذاقِ سخن سے عاری ہیں۔ اگر نہیں تو نظمِ جدید (بالخصوص نظمِ آزاد) کے مخالفین کو موردِ الزام گردانا پڑے گا۔ جن کی سنجیدہ مساعی کو بے ثمر بتانا میرا مقصد نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ قدیم آہنگ اور عروض، اور قدیم اصنافِ سخن میں استعمال ہونے والے کنایات تشبیہات استعارات اور رموز و علائم کے علاوہ اس کے موضوعات سے بھی قاری کی گہری واقفیت ہے۔ ان اصناف کے ساتھ اسے گہرا جذباتی

---

[1] آزاد نظم کے سراغ میں۔ ضمیر علی بدایونی۔ مطبوعہ ماہِ نو جون ۱۹۷۱ء

[2] صاحبِ مقالہ کا اشارہ گوجرانوالہ کی طرف ہے (مرتب)

نگاہ میں بھی سہے جتنسیلی حوالوں میں ان قدیم اصناف کو سمجھنے اور اس کا شعور عام کرنے کی بڑی سعی کوشش بھی رہتی ہے۔ ان اصنافِ شعر سے محفوظ ہونے میں ہماری جذباتی وابستگی اور آمادگی کو بھی بڑا دخل ہے۔ ان اصناف کی صدیوں پرانی ایک روایت ہے۔ جو ان کو سمجھنے اور ان سے حظ حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ ان اصناف سے ملتی جلتی اصناف ہماری مقامی اور علاقائی زبانوں میں بھی موجود ہیں۔ ایک زبان کا مذاق شعر فہمی دوسری زبانوں کی مماثل اصناف میں بھی کام دیتا ہے۔ ان اصناف کا مشرقی موسیقی سے بڑا گہرا اور لازمی تعلق ہے۔ ریڈیو اور فلم بھی پرانی اصناف اور ان کے رموز و علائم کو پھیلانے، قابلِ فہم بنانے اور اسی طرح انہیں بنانے یا بگاڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظمِ جدید کے خالقین کو بڑی کڑی آزمائش سے گزرنا ہے۔ ان کی راہ میں بہت سی مشکلات حائل ہیں۔ اور ان کے ذرائع محدود ہیں۔ یہ مشکلات ابلاغ کی ذمہ داری سے بچ نکلنے کا جواز نہیں بن سکتیں۔ قاری نظمِ آزاد کو بے آہنگ نثر سمجھتا ہے۔ یلنے موضوعات پر نئے رموز و علائم والی نظمِ معریٰ یا نظمِ آزاد کو لغو اور مہمل ٹھہراتا ہے۔ تو اسے حق پہنچتا ہے۔ اب یہ تو آپ کا فرض ہے کہ ایسی تخلیقات پیش کریں کہ وہ آپ کے ساتھ سفر کرنے کو آمادہ ہو جائے وہ تو آج تک اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ اور آپ ہیں کہ منزلوں پر منزلیں مارتے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ گویا "خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے"

میرا جی، ن، م، راشد اور سردار جعفری کی جدید منظومات میں قاری کو پھر ایک سہولت حاصل تھی۔ قاری ان کے رجحان، افتادِ طبع اور ان کی تحریکات کے آئینے میں ان کی منظومات کو سمجھنے کی ادھوری سی کوشش کر لیتا تھا۔ اور اس کی معنویت کے قریب قریب پہنچ جاتا تھا۔ وہ میرا جی کے اشارات میں جنس اور اس کے متعلقات، راشد کے علائم و رموز میں فرار، یاس اور انفعالیت اور جعفری کی تخلیقات میں انقلاب اور احساس بیداری ڈھونڈ نکالتا تھا۔ اور اس طرح نظم کوئی نہ کوئی معنوی لباس پہن لیتی تھی۔ اب یہ صورتِ حال بھی باقی نہیں۔ جدید نظم گو شعرا کو سمجھنے کے لئے کوئی تحریک یا رجحان بھی راستہ معین نہیں کرتا جس سے پیچیدگی، ابہام، بے ربطی، ناموزونیت اور معنوی خلا کا احساس شدت اختیار کر لیتا ہے۔

حالی کا مقدمہ شعر و شاعری حقیقتاً ایک عہد آفریں تخلیق تھی۔ لیکن جوشِ اصلاح اور سرسید کی ترجمانی کے زعم میں انہوں نے وہ عمل سے کام بھی لیا۔ حالی نقاد ہی نہیں فنکار بھی تھے۔ اگر ردیف قافیہ اور وزن کی قیود واقعی اتنی ہی غیر اہم تھیں۔ جس قدر حالی نے سمجھا تھا۔ تو انہیں چاہیئے تھا کہ اس سنگلاخ راستے پر وہ قدم تو چل کے دکھاتے۔ کوئی غیر موزوں نظم کہہ جاتے۔ جس میں وزن نہ ہوتا۔ بلکہ وہ اپنی معنوی اور اشارات کی خوبیوں کے بل بوتے پر زندہ رہ سکتی۔ کوئی غیر مقفیٰ نظم ہی لکھ دیتے۔ اسماعیل میرٹھی کے انتظار میں کیوں بیٹھے رہتے۔ انہوں نے شعر کو اخلاقیات کا نائب مناب بنایا۔ تو مسدسِ حالی لکھ کر عملی نمونہ بھی پیش کیا۔ غزل کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو خود جدید غزلیں کہیں۔ شعر کا سوسائٹی کے ساتھ تعلق واضح کیا۔ تو عورتوں کے حقوق پر نظمیں لکھیں۔ شعر کو اصلاحی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کو مستحسن گردانا تو محنت، صنعت، حبِ وطن وغیرہ پر شعر کہے۔ لیکن جب ردیف قافیہ اور وزن کو غیر ضروری قرار دیا تو ایسے شعر کیوں نہ کہے۔ یہ ہے حالی کا تضاد۔ حالی نے یقیناً اس کا عملی نمونہ بھی تخلیق کیا ہوگا۔ لیکن اس کی ناموزونیت، بے آہنگی اور عدم غنائیت کو دیکھ کر انہیں اپنی منظومات خود ہی مضحکہ خیز معلوم ہوئی ہوں گی اور انہوں نے ان کی اشاعت اپنے ادبی وقار کے منافی سمجھ کر انہیں ضائع کر دیا ہوگا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر حالی نظمِ آزاد کے چند ناقص نمونے چھوڑ جاتے تو نظمِ آزاد اور نظمِ جدید کے ارتقا میں نہ یہ مشکلات پیش آتیں اور نہ ابلاغ کے مسائل اتنی پیچیدہ شکل اختیار کرتے۔ کیونکہ اس صورت میں نظمِ آزاد اور نظمِ جدید کی اشاریت قدیم روایات سے مربوط رہتی۔ اور روایتی ساز و سامان کا تذکرہ کم ہو کر رفتہ رفتہ نظمِ جدید کی وہ منزل آ جاتی جہاں فنکار اور قاری کے درمیان نئے رموز و علائم اور نئی اشاریت کا رشتہ مضبوط ہو جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اعلیٰ پیمانے کا ابلاغ ایک مشکل اور وقت طلب کام بن گیا ہے۔ حوصلہ شکن امر یہ ہے کہ فنکاروں کو اس مسئلے کا احساس بھی بہت کم ہے۔

یوں تو نظمِ آزاد کے لئے عروضی اوزان کا التزام ہیئت کی شرائط میں سے نہیں۔ لیکن نظمِ آزاد لکھنے والے شاعر اب بھی کسی نہ کسی انداز میں اسے نبھائے چلے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اپنے تمام تر بلند بانگ دعاوی کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ نظم اور نثر میں اگر کوئی ایسا فرق ہے۔ جس پر ہمارا روایت آشنا ذہن آسانی سے فیصلہ دے سکے تو وہ کسی نہ کسی صورت میں وزن کا التزام ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے۔ اصنافِ ادب کی پرانی تقسیم کے مطابق آزاد نظم فی الحقیقت نثر کے زمرے میں آتی ہے۔ اور جدید نظم گو اصحاب اس سے چڑتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا نثر ان کے نزدیک نظم سے کم وقعت شئے ہے۔ اگر ہے تو کن وجوہ کی بنا پر؟ اور کیا اپنی نظم نگاری میں وہ ان امور کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ جو ان کی نظم کو نثر سے ممتاز کر سکیں۔

ذاتی طور پر میں آزاد نظم کو نظم ہی سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ مجھے کوئی نئی بصیرت عطا کرے۔ میرے لئے لمحۂ فکر مہیا کرے۔ اور اس میں کچھ ایسی چیزیں بھی موجود ہوں جو ردیف، قافیہ اور حقیقی عروضی اوزان سے پیدا ہونے والے آہنگ کا نعم البدل بن سکیں۔ نعم البدل کے لفظ پر زور دینا مقصود ہے۔ کیونکہ نظمِ آزاد کے جدید اس کے مدعی ہیں۔

انگریزی شاعری میں اصنافِ شعر میں نظمِ معریٰ اور نظمِ آزاد کے علاوہ سانیٹ بھی شامل ہے۔ جس کی طرف جدید شعرا نے کم توجہ دی ہے حالانکہ سانیٹ ہمارے مزاج، قومی افتادِ طبع، ادبی رجحانات اور روایاتِ شعری سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ اور اس میں متنوع موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس کے جسم میں نظمِ آزاد کا سا بے ڈھنگا پن بھی نہیں۔ شاعر نہ یہاں اس قدر آزاد ہے کہ قاری کے چنگل سے نکل بھاگے۔ اور نہ اتنا پابند کہ اس کی باگ ڈور قافیہ ہی کے ہاتھ میں ہو۔ اور سانیٹ میں جو تجربات ہوئے ہیں۔ وہ نظمِ آزاد کے تجربات کی نسبت یقیناً زیادہ حوصلہ افزا ہیں۔ پھر سانیٹ پر پوری توجہ کیوں نہیں دی گئی۔ اس کی بڑی وجہ شعراء کی سہل انگاری ہے۔ سانیٹ باقاعدہ قسم کا تعمیری حسن چاہتی ہے۔ یہاں نظمِ آزاد کی خود فریبیاں اور ابلہ فریبیاں کام نہیں دیتیں۔ یہاں شاعر کو کچھ پیش کرنے سے پہلے اسے سمجھنا پڑتا ہے۔ حقائق پر شعور کی گرفت مضبوط کرنی پڑتی ہے۔ اور قاری کو گریبان پر ہاتھ ڈالنے کا حق بھی دینا پڑتا ہے۔ نظمِ آزاد میں یہ بات نہیں۔ یہاں تجربے کی ایک ہلکی سی جھنجھناہٹ بھی کام دے جاتی ہے۔ شخصی تجربہ شعوری گرفت سے میلوں دور ہو۔ تب بھی اسے موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ پھر آزاد نظم کا اشارتی ابہام موجود ہے۔ جو آپ کے ناقص، ادھورے اور کچے پکے تجربات پر بھی ایک دھند سی پھیلا دیتا ہے۔ قاری اس دھند سے پار دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ناکام رہتا ہے تو سمجھنا پڑتا ہے۔ بات تو بڑی ہی معلوم ہوتی ہے۔ ع "جو سمجھ میں نہ آئے بڑا شعر ہے"

نفسیات نے آزاد تسلسل سے کام لے کر لاشعور میں جھانکنے کا گر معلوم کر لیا تھا۔ لیکن نفسیات بھی اعتراف کرتی ہے۔ کہ اوّل تو آزاد تسلسل ایک انفرادی چیز ہے۔ اور پھر "محتسب" آزاد تسلسل میں خلل انداز بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص ایک ہی لفظ کے جواب میں دو مختلف موقعوں پر اپنا ردِ عمل مختلف صورتوں میں پیش کر سکتا ہے۔ دونوں جواب اس کی اپنی نفسی کیفیات، لاشعوری گھٹی اور دبی ہوئی خواہشات کا اظہار کرتے ہیں ہو سکتا ہے ایک جواب پر محتسب کا ہاتھ کاری پڑا ہو۔ ایک پر اوچھا۔ ہو سکتا ہے حقیقت ان کے بین بین ہو۔ کیونکہ محتسب تو خواب میں بھی بیدار رہتا ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ لاشعور الفاظ کی گرفت میں آ جائے۔ تو وہ شعور میں رینگ آتا ہے۔ اس لئے آزاد تسلسل کی تکنیک یا لاشعور کی دھار پر نظم کہنا انتہائی گمراہ کن اور لایعنی سی بات ہے۔ ایسی نظم شخصی ہو اور مصنّف اپنی ذات کے حوالے سے بات کرے "میں نے سوچا۔ میں نے محسوس کیا۔ میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا" تو کسی حد تک بات بن جاتی ہے۔ بودلیئر اور راں بو وغیرہ بھی ایسی ہی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں ان کی شخصیت ہولناک، گمراہ کردہ، پر پیچ اور پھر پراسرار معلوم ہوتی ہے۔ تاہم ویرلین اور اگر آپ چاہیں تو عذرا پاؤنڈ کو بھی ان کے ساتھ

ر... ایک ایک شخصیت ہے۔ جو ہمارے جدید شعرا کو میسّر نہیں۔ اور شخصی واردات کے بغیر تو مثنوی بھی نہیں لکھی جا سکتی۔ باوجود اس کے ... تو فنا کے دست ... شاگرد نہ تھے۔ میراجی فرائڈ کا شاگرد ہے۔ وہ شعوری کیفیات کو پہلے تو لاشعور کی بھٹی میں پھینکتا ہے۔ اور وہاں سے نکال کر پھر شعور میں لاتا ہے۔ یہ گاڑی کو گھوڑے کے آگے جوتنے والی بات ہے۔ ہمارے ہاں نفسیات کو اس کی پراسرار کیفیت نے ایک جادو کی شکل دے دی ہے۔ لوگ اسے سمجھنے اور پڑھنے کی بجائے اس کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا رہنا۔ اور اسے روحانی چیز سمجھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ اسرار پسندی ہمارے ہاں صدیوں میں عام رہا ہے۔ اور آج جبکہ بیشتر اسرار مادی علم کی روشنی میں دھند سے باہر آ گئے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ چند نئی چیزیں ہی مل جائیں۔ جو ہماری اسرار پسندی کو تسکین دے سکیں۔ چنانچہ خوف، نرگسیت، ساکیت، اذیت کوشی، اشیا پرستی، آبائی الجھن، احساسِ کمتری، مسمریزم، قوتِ ارادی اور لاشعور وغیرہ ایسی ہی چیزیں ہیں۔ جو لاعلمی کی صورت میں ایک ماورائی احساس پیدا کرتی ہیں۔ نظمِ جدید لکھنے والوں نے اسے اور زیادہ دھند میں لپیٹ دیا۔ نثر کی قطعیت نظم کو ویسے بھی حاصل نہیں۔ پھر قاری ان علوم سے اتنا واقف بھی نہیں۔ جتنا فنکار۔ یہ چیزیں ابھی واقفیتِ عامہ یا ادبی روایات کا جزو بھی نہیں بن سکیں۔ پھر قاری ان کے بارے میں اشارات کو کیسے سمجھ سکے گا۔ باقی رہا اجتماعی لاشعور تو وہ روایات اور تربیت کے بغیر کوئی وجود ہی نہیں رکھتا۔ ہاں ابہام کے لئے آڑ کا کام دے سکتا ہے۔ یہ محض ابلہ فریبی ہے۔

نظمِ آزاد کی ضرورت اور اہمیت کو ذہن نشین کرانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ قدیم اصناف میں شاعر کو اپنے خیالات (خواہ ان کی صورت کچھ ہی کیوں نہ ہو) مخصوص اور بندھے ٹکے سانچوں میں ڈھالنے ہوتے تھے۔ جس سے مواد یا تجربہ گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ لیکن نظمِ آزاد میں تجربہ یا مواد اپنے سانچے کا تعین کرتا ہے۔ تجربے یا مواد کی مزاجی ضرورت سانچے کو جنم دیتی ہے۔ یہ تو تھا دعویٰ۔ اب میں اردو نظم کی بات کرتا ہوں۔ اردو میں ایسی جدید نظمیں کتنی ہیں۔ جن میں سانچے کا تعین مواد کی اندرونی ضرورت کا نتیجہ ہو۔ اور اگر قدیم اصناف میں تجربہ کا سمندر گھٹ کر جوئے کم آب رہ جاتا ہے تو اس سمندر کی تلاطم خیزیاں، کماحقہٗ اور بلاکم و کاست جدید شاعری میں سموئی جا رہی ہیں تو کسی ایسے شاعر کی مثال تلاش کریں۔ جو ولی، میر، غالب یا اقبال ہی کے درجے تک پہنچ گیا ہو۔ وہ تلاطم خیز سمندر جو فردوسی، میر، غالب اور اقبال نے قدیم سانچوں میں بند کر دیئے۔ جدید شاعر تو ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ قدیم سانچوں میں یقیناً بعض نقائص موجود ہیں۔ اور جدید سانچوں کی ضرورت بھی ایک بدیہی امر ہے۔ لیکن محض جدّت طرازی کے شوق میں قدیم سانچوں کو خیرباد کہہ کر نسبتاً پست مایہ، بے بضاعت، غیر جمالیاتی اور ناقص سانچے اختیار کر لینا دانش مندی کے خلاف ہے۔

امیجزم کے بانیوں نے اپنے منشور میں جہاں آزاد نظم کو شاعر کی انفرادیت کا سب سے بہتر ذریعہ اظہار قرار دیا تھا۔ وہاں یہ بھی دعویٰ کیا تھا۔ کہ ہماری شاعری ابہام سے پاک، صاف اور واضح ہوگی۔ اس کے بعد مختلف تحریکات بھی اس صنفِ شعر کی کمک کو پہنچتی رہیں۔ لیکن ہنوز روزِ اول کا سا معاملہ ہے۔ شاعر کی انفرادیت کا اظہار تو نظمِ آزاد میں ہونے لگا ہے۔ لیکن ابہام کے الزام سے ایلیٹ اور پاؤنڈ جیسے قد آور فنکار بھی مستثنیٰ قرار نہیں دیئے جا سکے۔ ان کے مقلدین کی تو بات ہی جانے دیجئے۔ انہیں تو شاعر کہنے والے لوگ بھی چند سال بعد خال خال ہی ملیں گے۔

میرے خیال میں ہمارے ہاں وہی آزاد نظمیں مقبول اور کامیاب رہی ہیں۔ جن میں اردو کی شعری روایت سے شاعر نے شعوری طور پر بہت دور جانے کی کوشش نہیں کی۔ مثال کے طور پر ن۔ م۔ راشد کی نظم 'دریچے کے قریب' پیش کی جا سکتی ہے۔ جس پر کلیم الدین احمد نے اعتراض کیا ہے کہ اس کا لب و لہجہ اور لفظوں کا چناؤ آغازِ نظم میں روایتی اردو شاعری سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہی تو وہ چیز ہے۔ جو اس

نظم کو قاری کے لیے قابلِ قبول بناتی ہے۔ اور قاری اسے پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور یہی چیز ہے جو اسے قابلِ فہم بھی بناتی ہے۔ الجھ کلیم صاحب کا یہ خیال درست ہے۔ کہ اس میں حشو بھی ہے۔ بہت سے مصرعے محض بھرتی کے ہیں۔ ہم کسے طرف سے کلیک و تسلسل کسی طرح متاثر نہیں ہوتے۔

آزاد نظم ایک تو وہ ہے جس میں وزن ہوتا ہے۔ ایک مخصوص بحر ہوتی ہے مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن انہی مصرعوں کو ملا کر یا دو تین چھوٹے مصرعوں کو یک جا کر کے یا بڑے مصرعے کے چار یا پانچ ارکان تقطیع میں سے ایک رکن نکال کر چھوٹے مصرعے کے دو یا تین ارکان کے ساتھ ملانے سے عروضی وزن حاصل ہو جاتا ہے۔

تصدق حسین خالد کی نظم "پیام" عروضی اوزان کے تحت آتی ہے۔ یہ وہی وزن ہے۔ جس میں حفیظ جالندھری نے شاہ نامہ اسلام لکھا ہے۔ نظم دیکھیے:-

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن = مفاعیلن × ۴ (ایک معیاری مصرع)
فضاؤں میں کوئی نادیدہ نامعلوم رستہ ہے۔ مفاعیلن × ۴
جہاں جذباتِ مضطر، روح کے سیماب پا قاصد = مفاعیلن × ۴
صعوباتِ سفر سے بے خبر ایک دور منزل کو = مفاعیلن × ۴
پروں میں الفتوں کے راز کو لے کر = مفاعیلن × ۳
ہواؤں کی طرح آزاد بے پرواہ اڑے جائیں = مفاعیلن × ۴
پیامِ شوق دے آئیں = مفاعیلن × ۲
اگر اس رات اس بے راہ رستے پر = مفاعیلن × ۳
کوئی جذبہ دلِ بے تاب سے اٹھ کر = مفاعیلن × ۳
عناں برداشتہ نکلے = مفاعیلن × ۲
اشارے گرمِ جوشِ آرزو آئیں گے ایڑ پر = مفاعیلن × ۴
انہیں پڑھنا = مفاعیلن × ۱
اگر منظورِ خاطر ہو = مفاعیلن × ۲
ہوا کا ایک جذبے کو سوارِ برق کر دینا = مفاعیلن × ۴

(پہلے چار مصرعے) ۳ + ۴ + ۲ + ۳ = ۱۲ مفاعیلن
یا ۴ + ۴ + ۴ مفاعیلن

(باقی مصرعے) ۳ + ۲ + ۴ + ۱ + ۲ = ۱۲ مفاعیلن
یا
۴ + ۴ + ۴ مفاعیلن

ایسی نظم میں موزونیت اور عروضی آہنگ کا انکار محض ضد اور قدامت پر اصرار ہے۔ اسے احترامِ رعایت کی بجائے محض رسم پرستی کہنا مناسب ہے۔ ورنہ یہ تو گویا بھگ ویسی ہی چیز ہے۔ کہ قدیم شعرا کے کلام کو تاثیر میں اضافہ کی غرض سے ذرا مختلف شکل میں لکھ دیا جائے۔ مثلاً

بہت بڑھ چڑھ کے دعوے چودھویں کا چاند کرتا ہے - تمہیں میری قسم اک شاذ نا تم بھی سنور جانا

اگر اس شعر کو حسبِ ذیل شکل میں لکھا جائے تو اس کے تاثر میں یقیناً اضافہ ہوگا۔ اور جو الفاظ تاکید طلب ہیں۔ وہ خود ہی تاکید حاصل

کریں گے۔

بست نہرہ چڑھ کے دعوئی چودھریں کا چاند کرتا ہے۔
تمہیں میری قسم
التجا

خدا تم بھی سفور جانا

ایسی منظومات میں خیال یہ رکھنا ہوگا کہ اگر تقطیع کے ارکان دو یا دو سے زائد اور مختلف ہیں تو ان کی ترتیب نہ بدلے مثلاً مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن، یا مفعول مفاعیل مفعولن کے ارکان تقطیع کو اس ترتیب کے ساتھ آنا چاہیئے۔ مصرعوں کی لمبائی آپ کے صوابدید پر منحصر ہے۔ وزن کی دوسری صورت نظمِ آزاد میں یہ ہے کہ مختلف بحروں اور مختلف اوزان میں نظم مکمل کی جائے۔ اس عمل سے مطلوبہ فائدہ تو شاعر کو حاصل ہو ہی جائے گا۔ لیکن اس کی قرأت میں قاری کے ادبی شعور کو جو جھٹکے لگتے ہیں۔ وہ سارے تاثر کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ طویل آزاد نظم کو چند بندوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر بند کے مواد کی مناسبت سے الگ بحر اور الگ وزن اختیار کر لیا جائے۔ اور بندوں کی یہ تقسیم قاری کے علم میں بھی لائی جائے۔ تاکہ وہ اس ذہنی جھٹکے کے لئے تیار رہو جائے۔ ہر مصرعے کے لئے شاعر کو الگ بحر اور الگ وزن استعمال کرنے کی اجازت دینا شاعر کو بے لگام کر دینے کے برابر ہے۔ کیونکہ مختلف اور بے ترتیب تفاعیل کے ذریعے تو اخباری اور کاروباری نثر کی بھی تقطیع کی جا سکتی ہے۔

خالد کی نظم "پیام" کی روانی موسیقی اور آہنگ ظاہر ہے۔ لیکن اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ نظم یک رکنی وزن میں لکھی گئی ہے۔ میراجی کی مشہور نظم "ابوالہول" میں بھی ہموار حرکت اور روانی کا راز اس کے یک رکنی وزن میں ہے۔ اس نظم کی ایک ہی رکن یعنی مفاعلاتن سے تقطیع کی جا سکتی ہے۔ ایسی منظومات میں حتی الامکان کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ایک رکن کٹ کر دو مصرعوں میں بٹ جائے۔ ورنہ شکستِ ناروا کا نقص پیدا ہوگا۔

تاثیر کی نظم "لندن کی ایک شام" ایسے وزن میں لکھی گئی ہے۔ جس کی تقطیع کے لئے ایک سے زائد ارکان استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن تاثیر نے التزام یہ کیا ہے کہ عروضی وزن کے مکمل مصرع کو یا تو نظمِ معریٰ کی طرح پورے کا پورا ہی لے لیا ہے۔ یا تقسیم کیا ہے۔ اور دو سطور سے زائد میں تقسیم نہیں کیا۔

تاثیر کی آزاد منظومات میں ابلاغ کی طرف پوری توجہ دی گئی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آج کئی نقاد، نظمِ جدید کے تذکرے میں ان کا نام لینا پسند نہیں کرتے۔ مصرعوں کی تقسیم کا مواد سے ہم آہنگ ہونا اور ہیئت کا موضوع کی مناسبت اور تقاضوں کے ماتحت جنم لینا ایک ایسی شرط ہے جس کا احساس تاثیر کے ہاں بیشتر جدید نظم کہنے والے شعراء سے زیادہ ملتا ہے۔ "ید بیضا" میں یہ مصرعے دیکھئے:۔

"یہ جھلکیاں
یہ ادائیں
یہ پرفشاں سائے
یہ جھلملاتے

ابھرتے

دبے ہوئے سے نقوش

سوادِ قوسِ خم و گردشِ دلنشیں و مسرور ؟

صوتی اثرات، روانی، اور تصویر زائی کی صلاحیت کو ایک طرف رکھ کر صرف یہ دیکھیئے کہ ہر مصرع کی لمبائی اس کے معانی کی مناسبت سے متعین ہوئی ہے۔ لیکن ابہام ان کے ہاں بھی ہے۔

تصدق حسین خالد کی نظم "حسنِ قبول" بھی خاصی کامیاب رہی ہے۔ اس کے عنوان اور اس کی "کہانی" دونوں میں بلا کا طنز ہے۔ اگر جدید منظومات کے عنوان اس طرح پورے تامل و تفحص کے بعد منتخب کئے جائیں تو ابہام کسی حد تک کم ہو سکتا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہی مرکزی خیال کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اور قبل از وقت کوئی راز بھی افشا نہیں کرتا۔ لیکن پوری نظم پڑھنے کے بعد صرف عنوان ہی آپ کو یاد رہ جائے تو بھی آپ ہر وقت اس کی کیفیت کی بازآفرینی پر قادر ہیں۔ پیڑ نے بارش کی دعا کی تھی۔ تاکہ پھولوں سے لد جائے۔ برق گری اور پیڑ سراپا پھول بن گیا دعا جامۂ قبولیت پہن چکی تھی۔ چنانچہ عنوان ہے "حسنِ قبول"

"رقص" اور "خودکشی" راشد کی دو مشہور نظمیں ہیں۔ یہ منظومات زندگی سے فرار کے دو مختلف رخ پیش کرتی ہیں۔ اول الذکر نظم میں زندگی سے بھاگ کر ہم رقص کے بازوؤں میں پناہ لینے کی کوشش ہے۔ تو مؤخر الذکر میں خودکشی کا عزم۔ کیا یہی وہ نئے موضوعات ہیں جو قدیم اصنافِ سخن میں سموئے نہیں جا سکتے تھے۔ اور جن کے لیے نظمِ آزاد کا سہارا لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ زندگی سے فرار کے لئے پرانے سانچے ہی زیادہ سہولتِ اظہار مہیا کر سکتے ہیں۔ یہ محض ایجاد بندہ کا شوق ہے۔ اختر الایمان کی نظم "ایک لڑکا" بحر کے اعتبار سے پابند شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کے پہلے بند میں سوائے آخری تین مصرعوں کے مثنوی کی شکل میں قوافی لائے گئے ہیں۔ دوسرا بند نظمِ معریٰ میں ہے۔ جس میں قوافی تو ہیں لیکن کسی مسلّمہ ترتیب کے پابند نہیں۔ تیسرے بند میں پانچ اشعار میں قوافی کا التزام قطعہ کی صورت میں ہے۔ باقی اشعار میں قوافی کسی التزامی شکل میں نہیں۔ بحیثیتِ مجموعی یہ ایک نظمِ معریٰ ہے۔ اس کا مرکزی خیال واضح ہے۔ اس کا موضوع نیا ہے۔ اسے بیان کرنے میں ذہنی فضا کے ابلاغ اور ماحول کی فنی تحلیل دونوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ڈرامائی دلچسپی پیدا کر کے تاثر کو ابھارا گیا ہے۔ ایک لڑکا جو اختر الایمان کا اپنا "لڑکپن" ہے جو آزاد، سیلانی اور خوددار ہے۔ شاعر جب کبھی "رزق کی تحصیل کی خاطر" خودداری، عزتِ نفس اور فن کی آبرو بیچتا ہے تو "یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو" اور آخر شاعر جھلا کے کہتا ہے۔ "جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم" مگر

یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے۔ یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

اپنی شخصیت کو لخت لخت کر کے جو تماشا شاعر نے خود دیکھا ہے۔ جسے آپ اس کا تجزیہ یا واردات کہہ سکتے ہیں، وہی شاعر نے بالکم و کاست قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ابہام اور پیچیدگی بھی نہیں۔ یہ جدید شاعری کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی فیض کی مشہور نظم "تنہائی" دیکھیئے۔ یہ بھی جدید نظم ہے۔ قوافی کا استعمال ہے۔ لیکن روایتی انداز میں نہیں۔ یہاں بھی شاعر کی دو ذیلی شخصیتوں میں آویزش نظر آتی ہے۔ ایک شخصیت تو وہی سادہ لوح محوِ انتظار عاشق کی ہے۔ جو رات بھر چشم براہ رہنے کا عزم رکھتا ہے۔ دوسری شخصیت ایک صاحبِ بصیرت، حقیقت پسند عارفِ حیات کی ہے۔ جو جنونِ عشق کی حقیقت اور راہِ محبت کے نشیب و فراز سے واقف ہے۔ مگر یہ کردار ناصحِ مشفق بن کر نہیں ایک درد مند دوست بن کر آتا ہے۔ یہ دونوں کردار نظم کے آغاز ہی میں اپنا تعارف کرا

دیتے ہیں۔

ا ۔ پھر کوئی آیا دلِ زار
ب ۔ نہیں کوئی نہیں۔

اور ذیلی شخصیتوں کی یہ آویزش آخر ایک درد آمیز سمجھوتے پر ختم ہوتی نظر آتی ہے لیکن یہ سمجھوتہ عارضی ہے۔ اس لئے ہمیں ایک لمحہ فکریہ دے جاتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کیا واقعی "اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا"

مجید امجد نے جدید شاعری کے چند اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہاں مجھے "بس سٹینڈ پر" کا حوالہ دینا ہے۔ یہ موزوں اور مقفّیٰ ہونے کے باوجود آزاد نظم ہے۔ کیونکہ پہلے ہی دو مصرع

"خدایا اب کے یہ کیسی بہار آئی
خدا سے کیا گلہ بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے آزاد نظم ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ یہ نظم موضوع اور تکنیک، دونوں اعتبار سے جدید ہے۔ بس سٹینڈ پر کھڑے کھڑے فنکار انسانی ارتقا کی پوری تاریخ کا جائزہ لیتا ہے۔ طبقاتی تضاد پر کڑھتا ہے۔ بہتر نظام زیست اور ایک نئی دنیا کی آرزو کرتا ہے۔ لیکن آخری مصرع ——— "یہ نو نمبر کی بس جانے کب آئے گی" ——— پوری نظم کو ایک مضحکہ خیز مذاق میں بدل دیتا ہے۔ گویا یہ سب سوچ، یہ سب فلسفہ اور یہ سب فکری ہیجان غلطاں بس کے صبر آزما انتظار سے پیدا ہونے والی بے کیفی اور اکتاہٹ کی کوفت اور الجھن کا نتیجہ تھا۔ اور بس۔ اعتراض بس سٹینڈ پر کھڑے ہو کر سوچنے پر نہیں۔ اس بات پر ہے کہ آخری مصرع مانع تاثیر ہے۔ ممکن ہے شاعر کا ذہن "نو نمبر کی بس" سے کسی حسین رومانی انبساط انگیں اور کیف پرور کیفیت سے دوچار ہوتا ہو۔ ممکن ہے کہ نو نمبر کی بس کو چہ یار تک جاتی ہو۔ جہاں عشرتیں شاعر کے لئے چشم براہ ہوں لیکن انہوں نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ قاری کا ذہنی تلازم بھی ایسے ہی تصورات تک رہنمائی کرے گا

مجید امجد کی آزاد نظم "آٹوگراف" حسبِ معمول ایک معمولی سے خارجی منظر کا ردِّ عمل ہے۔ پوری نظم میں شاعر کا احساس کمتری کا رنگ بھرتا ہے۔ موضوع اس کا یہ ہے کہ لڑکیاں کرکٹ کے کھلاڑیوں سے آٹوگراف حاصل کرتی ہیں لیکن شاعر کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس قسم کے موضوعات شاعر کی جنسی بھوک کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ کوئی صحت مندانہ رجحان نہیں۔ فقط میرا جی کا ورثہ ہے۔ میرا جی کی "لبِ جوئبارے" میں اس جنسی بھوک کا (غلط ہی سہی) کچھ نہ کچھ حل تو پیش کیا ہے۔ جدید شعرا کے ہاں تو یہ بات بھی نہیں۔ البتہ مجید امجد کی "توسیع شہر" بڑی پاکیزہ اور کامیاب نظم ہے۔

جناب قیوم نظر نے اپنی انشائی نظم "خزاں کی ایک شام" کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اور اس سلسلے میں بطور تبرک بہت کام کی باتیں کہی ہیں واقعی فن کار نے اس نظم میں ماحول سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ محرومی، اداسی اور مایوسی کی فضا محنت سے پیدا کی گئی ہے۔ باقی رہی اس کی ایمائیت تو اس ضمن میں شاعری کی کامیابی محلِ نظر ہے۔ کیونکہ یہاں بھیڑیں بھیڑیں ہی رہتی ہیں آدمی نہیں بن جاتیں۔

۱؎ ہمیں اس مقالے کے بعض حصّوں سے اختلاف ہے۔ مگر اس مقام پر تو شدید احساس ہے۔ مجید امجد کی دونوں نظمیں اردو کی بہترین نظموں میں شامل ہیں۔ دونوں نظمیں ایک گہرے طنز میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے محترم مقالہ نگار ان کی معنی تک نہیں پہنچ سکے (مرتب)

۲؎ حوالہ : ۔ نئی تحریریں نمبر ۱ حلقہ اربابِ ذوق ۔

منیر نیازی کی نظم "سپیرا" چھوٹی بحر میں مقفیٰ شاعری کا اچھا معیار پیش کرتی ہے۔ لیکن اگر یہ نظم "سویرا" جیسے وقیع ادبی پرچے کی بجائے بچوں کے کسی رسالے میں چھپتی تو ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ اس کی معنویت ڈھونڈنے کے لئے کسی جوتشی سے ملنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ نظم کا خلاصہ دیکھیئے:-

"میں ہوں ایک عجیب سپیرا ناگ پالنا کام ہے میرا"

میرے پاس قسم قسم کے پھنکارتے ہوئے، تیز نشیلی اور چیل جیسی آنکھوں والے، پیلے کالے کوڑیالے، نرم و ملائم سرخ اور گلابی سانپ ہیں ——— "مجھ کو تکتے رہتے ہیں یہ + مجھ کو ڈستے رہتے ہیں یہ + مجھ پر ہنستے رہتے ہیں یہ"[1]

سوال یہ ہے کہ اگر سانپ اور سپیرا کی ایمائیت کو ذرا واضح کر دیا جاتا۔ تو کیا بُرا تھا۔ کم از کم کوئی سمت تو تلاشِ معانی کے لئے متعین ہو جاتی۔ اب تو نظم تشریح طلب ہے۔ نیل ڈالنے کی تکلیف کیجئے اور جہاں جی چاہے لے جائیے۔ کوئی قدغن نہیں۔ یہ سانپ سجاد حیدر یلدرم کے وہ دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کی گرفت سے نکل بھاگنے کے لئے اس نے بچاؤ بچاؤ کا شور مچا دیا تھا۔ ممکن ہے یہ سانپ فنکار کی نفسیاتی الجھنیں ہوں۔ یہ سانپ نفس کے کچھوؤں جیسے بچے بھی ہو سکتے ہیں جنہیں وہ پالتا ہے۔ تاکہ وہ اسے ڈسیں۔ تھوڑی کھینچا تانی سے یہ سانپ فنکار کے اعزہ و اقارب، اہلِ شہر، معاشرتی ادارے اور شاہی محلہ کے ستم پیشہ محبوب بھی ہو سکتے ہیں۔ قاری اس سارے جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے سپیرا کو محض سپیرا اور سانپ کو فقط سانپ سمجھ لے تو وہ مجبور ہے۔ اس لئے ایسی نظمیں بچوں کے رسالوں میں چھپنی چاہئیں۔ ورنہ اسماعیلؔ، حالیؔ، اقبالؔ اور افسرؔ کی بچوں کے لئے لکھی ہوئی سیدھی سادی نظموں میں ایسی ایسی معنویت اور ایمائیت نکل آئے گی کہ جدید شاعر میدان چھوڑ کر بھاگ نکلیں گے۔ "اللہ آیا بندر والا آیا" اور "ایک تھا تیتر ایک بٹیر" جیسی نظموں کی مبسوط شرحیں لکھنی پڑیں گی۔ اس کے مقابلے میں منیر نیازی کی دوسری نظم "ایک باغی بیٹے کی تصویر" ایک گہرے احساس کا پتہ دیتی ہے۔ اس میں ابہام کو بھی دخل نہیں۔ یہاں ابلاغ کامل تجربے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

جدید نظم کی ایک امتیازی خصوصیت تسلسل ہے۔ جس سے موضوع کا حشو و زوائد کے بغیر اپنے اندرونی تقاضوں کی رہنمائی میں بتدریج نقطۂ عروج تک پہنچنا مراد لیا جاتا ہے۔ لیکن جدید شعرا بھی جب طویل نظمیں لکھنے بیٹھتے ہیں۔ تو آٹھ دس اشعار کے بعد اعادہ و تکرار سے کام لینے لگتے ہیں یا کسی ایک منظر یا کیفیت پر قصیدہ گو شعرا کی طرح شعر پر شعر کہتے چلے جاتے ہیں۔ جس سے پھسپھسا پن پیدا ہوتا ہے۔ اس راز کو بعض نئے شعرا نے خوب سمجھا ہے۔ جو اپنی منظومات کو راشد کی "ایران میں اجنبی" کی طرح مائل بہ طوالت ہونے ہی نہیں دیتے۔ اکہرے احساس سے کام چلا لیتے ہیں۔ لیکن یہ بھی سہل انگاری اور فن کو محدود کر لینے کی ایک صورت ہے یہ تو فنی ہوشواری کا سطحی حل ہے۔ نو آموز جدید شعرا نے تو اپنی شخصیت کا جذر نکال لیا ہے۔ وہ اسی جذر کے ذریعے سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنے فکر و احساس سے بیر بہوٹی جیسی چھوٹی چھوٹی اداس تصویریں بناتے ہیں لیکن جس طرح ان کی لخت لخت شخصیت اپنے ٹکڑوں کو جوڑ کر کسی بڑی شخصیت کی تکمیل نہیں کرتی۔ اسی طرح ان کی یہ ننھی نظمی تصویریں مل کر کسی بڑی اور زندہ و پائندہ تصویر کا خاکہ نہیں بناتیں پچھلے دنوں لاہور کے ایک پرچے میں ایک ایسی نظم بھی نظر سے گذری تھی۔ جو صرف دو مصرعوں پر مشتمل تھی۔ یہ وہی غزل کا خوردہ فروشی کا رجحان ہے۔ جو فرد ا بحتلف رنگ میں اپنا اظہار کر رہا ہے۔

---

[1] کاش صاحب مقالہ نے نظم کی معنویت کو سمجھ لیا ہوتا۔ نظم کی معنویت آخری تین مصرعوں میں ہے اور بلا کی معنویت ہے (مرتب)

خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم "سوداگر" اور مجید امجد کی نظم "زینیا" ایک ہی موضوع پر ہیں۔ "سوداگر" میں ایمائیت کم ہے۔ اور تاثر زیادہ۔ کیونکہ یہاں شدتِ احساس کو معتدل کر کے بڑی خوبی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس "زینیا" میں تو صاف نظر آتا ہے کہ شاعر بہ تکلف جدید بننے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔ اس لئے اس کی ہئیت، مرکزی خیال سے بھی تضاد کا اعلان کرتی ہے۔

الغرض جدید نظم کہنے والے شعرا کا رشتہ اپنے ماضی سے ساتھ باقی نہیں رہا مستقبل پر ان کی گرفت مضبوط نہیں۔ باقی رہا حال تو اس کی سرزمین میں ان حضرات نے پاؤں ہی نہیں ٹکائے بس مغرب سے نظمِ آزاد کا ایک آدھ نمونہ دیکھ بھاگے اور سوچا کہ اگر یہاں کوٹ پتلون اور ٹائی چل گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ نظمِ آزاد نہ چلے۔ شعری روایت اور ادبی مذاق، لباس نہیں کہ حسبِ منشا بدل لیا۔ جی چاہا تو سیدھا پہن لیا۔ اور جی چاہا تو الٹا پہن لیا۔ یہ تو قوم اور زبان کی جلد یا کھال ہے۔ اسے الٹایا نہیں جا سکتا۔ اور اگر الٹا دیا جائے تو اس میں بھس بھرا جا سکتا ہے قومی شعور، طرزِ فکر، ذہنی خط و خال، تہذیبی اور ثقافتی ورثہ اس میں نہیں سمویا جا سکتا۔ پچھلے دنوں رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ بھی ایسے ہی لوگوں کی طرف سے اٹھایا گیا تھا۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا اگر ادبی رسائل و جرائد میں ان لوگوں کا کلام (جسے پہلے بھی کوئی نہیں پڑھتا) رومن رسم الخط میں شائع ہوا کرے۔ تاکہ قاری اس حصے کو غیر ملکیوں کے لئے سمجھ کر نظر انداز کر سکے۔ اور اسے اپنی نارسائی کا اس قدر شدید احساس نہ ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ نظمِ جدید بڑی کمسن ہے اور نوزائیدہ صنفِ شعر ہے۔ اور کسی بھی صنفِ سخن سے جو تجرباتی دور سے گذر رہی ہو، اتنی بلند توقعات وابستہ کرنا ایک قسم کی زیادتی ہے۔ لیکن اصل مسئلہ بھی تو یہی ہے کہ بچوں کو بڑوں ہی کی طرح گفتگو کرنا زیب دیتا ہے۔ مجھے وہ بچہ پسند نہیں جو استعارات، تشبیہات اور رموز علائم سے گرانبار زبان استعمال کرے اور مکان کہہ کر عورت کا جسم مراد لے۔

ناول، ڈراما، افسانہ اور انشائیہ بھی اردو زبان پر انگریزی ادبیات کے اثر سے معرضِ وجود میں آئے ہیں۔ ان کی عمر بھی تو کچھ زیادہ نہیں اس کے باوجود متوسط درجہ کا قاری ان سے مستفید ہوتا ہے۔ ان سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ ان سے حقائقِ حیات کا علم سیکھتا ہے۔ انہیں پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ اپنی پسند اور ناپسند کی بری بھلی توجیہات بھی پیش کر لیتا ہے اور غیر شعوری طور پر ان کے بعض حصوں کو اپنی شخصیت کا جزو بنا کر راہِ زیست میں ان کی مدد سے اپنے بعض مسائل کا حل بھی ڈھونڈتا ہے۔ ان کی روشنی میں سوچتا ہے۔ اس کی آرا، تعصبات، عقائد و نظریات اور زندگی کے بارے میں اس کا مطمعِ نظر ان اصناف ادب سے متاثر ہوتا ہے۔ ترمیم پاتا ہے۔ استواری حاصل کرتا ہے۔ پھر نظمِ آزاد سے اس کی توقع کیوں نہ رکھی جائے۔

○

نہیں اقبالؔ نا امید اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

شہاب جعفری

جدید ادب

ہمعصر ادب پہ کچھ لکھنا جان بوجھ کر بھڑوں میں ڈالنا ہے۔ یہ تو کچھ ایسا ہی ہے کہ آ بیل مجھے مار۔ اور پھر ایسے ہمعصر ادب پہ لکھنا جس میں بے بات کی بات بھی نئی نسل اور پرانی نسل کے فسادات ہو رہے ہوں بلاشبہ گروہ ہنگامہ رہتا ہے اور فروعی بحثوں میں پڑنا ہے۔ دراصل اس موضوع کے ایک پہلو میں بھڑ کا چھتہ ہے جسے بھولے سے بھی چھیڑ دیا گیا تو نئی اور پرانی بھڑیں مع اپنی سات پشتوں کے صف آرا ہو جائیں گی جبکہ اس جنگ کے لئے موجودہ معاشرے کا میدان ناکافی ہے اس لئے نئی پرانی اور ادھیڑ کے جھگڑے ہی میں نہیں پڑتا۔ اس چھتے سے نکلے گا بھی کیا جس کے لئے خطرہ مول لیا جائے؟ . . .

موضوع کے دوسرے پہلو میں شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہے اور میری نظر اسی پہ ہے۔ اگرچہ خطرہ اتنا ہی ہے لیکن شہد تو حاصل کرنی ہی ہے۔ البتہ وہاں، تک پہنچنے میں اگر ایک ایک کی طرف توجہ کے فرائضِ نقد و نظر ادا کرنے کی کوشش کی گئی تو صورتِ حال یہ ہو گی کہ جس قدر ناموں کی فہرست مرتب کرتے جایئے اپنے کو کٹواتے بھی جایئے۔ جاں بحق تسلیم ہو گئے تو خیر، ورنہ اگر ادھ موئے رہ گئے تو کوئی داد کو پہنچنے والا نہیں۔ اتنا بھی کہنے والا نہیں کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا ——— اور محترمی میرزا ادیب صاحب بہ حکم اس کے خواہاں ہیں کہ ہم شہیدِ ادب دیکھیں گے۔ بہر حال، "مرحلہ" سخت ہے اور جان عزیز ——— موضوعِ زیرِ غور کی نوعیت ادبی سے زیادہ اخلاقی ہے۔ غرض فی الحال اس مقالے کا مقصد جدید ادب کے محرکات اور اجزائے ترکیبی کی تلاش ہے۔

دوسری نوعیت اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کے ماتھے پر پہلا ہی سوال یہ لکھا ہے کہ کیا ہمعصر ادب کے متعلق اس وقت دیانتداری، ذمہ داری، اور وثوق سے کوئی بات کہی جا سکتی ہے؟ یقیناً نہیں کہی جا سکتی۔ جسمانی اور ذہنی طور پر اپنے ہی عہد یا اپنے قریب کے عہد اور ماحول میں رہ کر اس سے فاصلہ اختیار کرنا پیر پیغمبروں کا کام ہے۔ یعنی کم از کم میں اپنے کو اس کا اہل نہیں پاتا۔ سائنس کی طرح ادب کی تنقید میں خورد بینی اور نزد بینی، کا طریق کار نہیں۔ کل بینی۔ اور دوربینی کا طریقِ کار ہے۔ سائنس جو ایک طرح کا نقد و نظر ہے اور جس کے لئے فطرت شاعری کا سا کام دیتی ہے اس کا عمل جزو میں کل کا قریب سے مشاہدہ ہے ادب کی تنقید کا عمل کل میں جزو کا فاصلے سے ادراک حاصل کرنا ہے پہاڑ کی بلندی سے وادی میں آباد شہر کا حسن دیکھنا ہے جہاں سے کثافتیں، لطافتوں کے پس منظر میں معدوم ہوتی محسوس ہوتی ہیں اور نقاد کی نظر کا امتحان لیتی ہیں۔ تنقید خود بھی ایک طرح کی سائنس ہے جس کے لئے فنون و ادب فطرت کے بجائے ہیں فن و ادب میں ہر نقطہ ہزارہا نقطوں سے اس طرح گتھا ہوتا ہے کہ اسے جتنا قریب سے دیکھئے بجائے بڑا نظر آنے کے اور چھوٹا ہوتا جائیگا یہاں تک کہ نظروں سے غائب فاصلے سے دیکھئے تو ہر نقطہ دوسرے نقطوں میں تحلیل ہوتا ہوا بھی اپنی حیثیت کے حدود میں، نمایاں، بڑا اور واضح نظر آئیگا۔ جس کے حقیقی خد و خال میں اس کے اپنے ماحول کے نقش و نگار بھی منعکس ہوں گے۔ اور اسے روشن تر بنا رہے ہوں گے ان میں چند تو ایسے بھی ہوں گے جو متحرک اور باقی سب پر چھائے ہوئے معلوم ہوں گے فاصلے کی عدم موجودگی میں اپنے ہی زمانے سے جذبات کو، علیحدہ کر لینا اور بھرپور سچائی اور اعتماد کے ساتھ عہد آفریں محاکمہ و تصفیہ کرنا شاید نقد الادب کی معراج ہے جس میں ایں بندہ اپنے کو عاجز تصور کرتا ہے۔ ایسے موقع پہ ہیچمداں کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے جبکہ اسے بیوپاری تنقید کے بازار سے ہو کر گزرنا ہے۔

مذکورہ بالا شماریات کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ ہمعصر ادب، جدید ادب یا اس طرح کے موضوعات پر کچھ لکھا نہ گیا ہو۔ سہ ماہی، سالانہ، دس سالہ، پندرہ سالہ عنوانات کے تحت مختلف طرح کے جائزے لئے جاتے رہے ہیں اور نظم و نثر کی تمام اصناف کے جائزے لئے گئے ہیں تاہم ان جائزوں میں بیشتر کی حیثیت بہی کھاتوں کی ہے جن میں ادبی کاشت اور ادبی پیداوار کے تول اور مول کا اندراج کیا گیا ہے۔ کیفیت کے خانے میں کسی کے مال کو بہت بڑھیا اور کسی کے مال کو بہت گھٹیا درج کیا گیا ہے۔ ایسے بہی کھاتوں کی افادیت صرف یہ ہے کہ مستقبل کے محققوں کے لئے بہت سے شعراء و ادباء کے سِن بود و نابود اور وقتِ ظہور، اجلال و زوالِ پُر ملال کا حساب کتاب ملانے میں بہت مفید ثابت ہوں گے۔

دوسری طرح کے جائزے اگرچہ کم تعداد میں وہ بھی ہیں جن میں مردم شماری کے خوشگوار فرائض کی بجائے انکشافِ حقیقت کی بے لوث لگن کے ساتھ جدید دور کے مختلف النوع رجحانات و مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اُس زرخیز مٹی کے اجزائے ترکیبی جاننے کے لئے محنت شاقہ کی گئی ہے جو رنگ رنگ پھولوں کو جنم دیتی جاتی ہے۔ یہ جائزے ادوار کے لحاظ سے بھی ہیں اور اصناف کے لحاظ سے بھی۔ مثلاً "اردو نظم کا مزاج"، "جدید اردو تنقید" وغیرہ جیسے اچھے مضامین۔

ہمعصر ادب یا جدید ادب کی حیثیت، جسے ہم آزادی کے بعد کا ادب کہیں گے اور جسے فی الحال ہم یہ مان کر چلتے ہیں۔ کہ ایک تجرباتی اور عبوری دور سے گزر رہا ہے اور نظم و نثر کی تقریباً ہر پرانی اور نئی صنفِ ادب کو آزمایا اور برتا جا رہا ہے، داخلیت اور انفرادیت پسندی کے شدید میلان کے باوجود اجتماعی زیادہ ہے اور یہ اجتماعیت ترقی پسند تحریک کے برعکس خارجی اور شعوری نہیں، داخلی اور لاشعوری ہے۔ اس کے پیچھے پورے عہد کا داخلی میلان اور لاشعور کام کر رہا ہے۔ اس کی سب سے پہلی نمایاں سطح اور سب سے پہلا واضح نقش یہی نظر آتا ہے کہ اس عہد کے لکھنے والوں میں باوجود شعوری مسلکِ انفرادیت کی جدوجہد اور انفرادیت پسندی کی دوڑ کے نئے سے نئے انفرادی و اجتہادی میلانات ہم قدمی، ہمسری یا تقلید اور چلن کی نذر ہو کر بہت جلد اجتماعی، رسمی اور پامال نظر آنے لگتے ہیں۔ مثال حال جو منفرد شخصیتیں تھوڑی مدت کے لئے اُبھرتی بھی ہیں تو ایک تو اپنے بھرسک وہ انفرادی راہ نکالنے کے لئے میدانِ عمل بھی بہت محدود و منتخب کرتی ہیں، دوسرے ابھی ان کا قد کچھ نکلنے بھی نہیں پاتا کہ اس راہ پر بہت سے چلنے والے ہم قد پیدا ہو جاتے ہیں ——— پیچھے چلتے رہنے کے لئے نہیں، دوسرے کی پیدا کی ہوئی راہ پر خود آگے نکل جانے کے لئے۔ اس عہد کے قابلِ ذکر اہلِ قلم کے اپنے ہی پیدا کئے ہوئے رجحانات یا لاشعوری اجتماعیت کا یا اجتماعی احساس نے خود ان منفرد شخصیتوں کو اپنی مضبوط گرفت میں لے رکھا ہے۔ چنانچہ ہم جب بھی کسی شاعر یا ادیب کی تحریروں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے اس کے یہاں ——— اس کے اپنے ذاتی انکشافات کو دوسروں کے تجربات سے مماثل پائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی اپنی بعض ایسی فنی خصوصیات بھی ہوں گی جو اسے دوسروں سے کسی نہ کسی حد تک ممتاز بنائیں گی لیکن اکثر وہ خود اپنے ہمسروں یا پیروؤں سے اس قدر مشابہ ہوگا کہ اسے اولیت یا پیغمبری کا درجہ دینے میں عار محسوس ہوگا۔ ترقی پسند ادب اور جدید ادب میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ اول الذکر اجتماعی مشاہدہ و فکر کا نتیجہ تھا، موخر الذکر اجتماعی احساس اور دروں بینی کی پیداوار ہے۔ ترقی پسند تحریک ایک سوچی اور متعین کی ہوئی منزل تک پہنچنے کی مشترکہ جدوجہد تھی، ایک طوفان تھی جس کے عروج و زوال میں ایک سی شدت تھی۔ جدید ادب جسے ہم سوائے جدید ادب کے کسی سیاسی یا تاریخی نام یا تحریک سے موسوم نہیں کر سکتے، نا معلوم و نادیدہ منزلوں کی انفرادی جستجو کا نتیجہ ہے۔ اس میں ہر شخص نے اپنے طور پر نئے جہانوں کی دریافت کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے اگرچہ انکی دریافتوں میں حدِ فاصل زیادہ واضح نہیں۔ مبہم جو، بے روک ٹوک ایکدوسرے کی سرحدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک پھیلا ہوا سمندر ہے، طوفان گزر چکا ہے اور ان گنت چھوٹی بڑی لہریں مختلف سمتوں میں رواں ہیں، خوشے رفتاریں ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی ہیں اور ہر لہر دوسری لہر پر غالب آنے کی کوشش میں سرگرداں بھی ہے۔ پورے دور کی تخلیقی قوتیں اتنی شدت سے برسرِ عمل اور متحرک ہیں کہ ان سے پیدا ہونے والے نو بہ نو رجحانات اور ہمہ جہتی،

میلانات کا درمیانی فاصلہ بہت کم رہ جاتا ہے یہاں تک کہ اُن کے آپس میں کبھی متصادم اور کبھی مماثل ہونے کا گمان بھی گذرنے لگتا ہے اور ان کی ارتقائی شکلیں دیکھنے کے لئے انہیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے پندرہ سال کی قلیل مدت میں بننے بگڑنے اور تیزی کا سے متغیر ہونے کا عمل اتنا قوی رہا ہے کہ لامرکزیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اچانک ہمارے سامنے بہت سی چیزیں بھی آگئی ہیں جن میں ما بہ الامتیاز عناصر کی نشان دہی کی خاطر ایک ضروری فاصلہ چاہتی ہے۔ یا تو خود ان میلانات کے درمیان بہت فاصلہ ہو یا ناظر و ناقد خاصی دوری پر کھڑا ہو جبھی ممکن ہے کہ کم تاب عناصر نسبتاً زیادہ روشن خد و خال کے پس منظر کا کام دے سکیں۔ اس وقت ادب میں نئی سمتوں اور نئے افقوں کی تلاش اتنی ہی شد و مد، سرگرمی اور مہم جوئی کے جذبہ کے ساتھ جاری ہے جتنا کہ کسی زمانے میں یورپ کی خطر پسند طبیعتوں کو نئی زمینوں اور نئے ملکوں کی تلاش کا جنون تھا جس نے دنیائے سیاست اور ادب کی تاریخ کا رُخ بدل کے رکھ دیا تھا جتنا کہ آج کی دنیا کو قطبِ شمالی و قطبِ جنوبی کے برف زاروں اور نادیدہ خلاؤں کی دریافت کا جوش و ولولہ ہے جو دنیائے سیاست و ادب کی تاریخ کا دھارا بدل رہا ہے۔ سائنس کا خارجی خلاؤں کا سفر اور فن و ادب کی داخلی خلاؤں کی مہمات! ——— دونوں کا میدانِ عمل، مختلف جہتوں کے باوجود حیرت خیز حد تک اتفاق و وحدت اور طبعی و نفسیاتی رشتہ رکھتا ہے۔ جس کا بیان شاید کسی موقعہ پر کیا جائے۔

غرض جدید ادب کی یہ حیثیت ایک لحاظ سے منفی ہے دوسرے لحاظ سے مثبت۔ جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وجہی، ولی، میر، ناسخ، انیس، غالب، حالی، آزاد، اقبال، پریم چند، جوش، فراق (یا کم از کم فیض) اور سردار بھی) جیسی چھوٹی بڑی عہد ساز شخصیتیں کیوں نہیں پیدا ہو رہی ہیں تو یقیناً یہ ادبی اجتماعیت ایک تھکا دینے والی یکسانیت کی حامل محسوس ہوتی ہے، وہی یکسانیت جس کا شکار ترقی پسند تحریک ہو کر رہ گئی۔ لیکن جب اس یکسانیت میں تجربہ و انکشاف کی ہمہ جہتی اور رنگا رنگی خصوصاً ماضی و حال کا سنگم نظر آنے لگتا ہے تو مستقبلِ قریب یا بعید میں قد آور اور بڑی ادبی شخصیتوں کی آمد کا یقین اور انتظار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ گویا ادب کا یہ تجرباتی دور مستقبل کے ادب کے لئے خام مواد کا کام دے گا بالکل اس طرح جس طرح دو بڑے شاعروں کے درمیان کے زمانے کا ادب مؤخر شاعر کے لئے خام مواد بنا مثلاً میر سے غالب تک اور غالب سے اقبال تک کا زمانہ۔ موجودہ دورِ ادب کو ابھی اپنے کو لمبس کا انتظار ہے۔ فی الحال اس مسئلے کو یہیں چھوڑنا مناسب ہے ——— اس کے علاوہ!

ترقی پسند ادب کے موازنے اور سیاق و سباق میں جدید رجحانات کے نشانِ قدم ڈھونڈے جائیں تو جدید ادب "بظاہر" ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ——— ایک ایسی ارتقائی شکل جو تصادم اور کشمکش سے وجود میں آئی ہے اس لئے پہلے اس "بظاہر" کو ہی دیکھ لینا چاہئے کہ اس ادب اور اس کے خالقوں کے ذہن کی تشکیل میں سب سے زیادہ قریبی زمانے اور ماحول کے جس سے ہم بہت کافی آگاہ اور مانوس ہیں، کن کن اثرات کا عمل دخل ہے۔ اس کے بعد پھر کچھ اور ماضی کی طرف بڑھیں گے۔

ترقی پسند نظریہ ادب نے ادب کو فلسفہ، سائنس، اقتصادیات، عمرانیات، اور ثقافتی، تاریخی اور سماجی علوم سے آشنا کرایا۔ انسانی عظمتوں کے گیت گانا سکھایا۔ طبقاتی سماج میں انسان کی زبوں حالی کا دل میں درد پیدا کیا۔ طویل تحریکِ آزادی کے جنوں پسند ہندوستانی ذہن نے اشتراکی عقیدۂ حیات بھی اختیار کیا۔ اس دوگنا رجائیت نے رزم و بزم میں تیغیں کھنچیں، خنجر چلے، تاج اُتارے، ساغر توڑے۔ ترقی پسند شعورِ زمان و مکاں کی راہ میں اور ہر شعبۂ حیات میں جو بھی روایت یا قدامت کے بت ملے توڑ دیئے گئے اور یہ نتیجہ تھا تہذیب و تمدن کے اشتراکی شعور پر غلبہ سیاست کا۔ ادب کا کارواں ایک منزل، ایک مقصد کو سامنے رکھ کر مشترکہ جد و جہد کے ساتھ آگے بڑھا۔ لیکن ادب میں رجائیت کی اس عذبا تی صورتِ حال نے، جس میں ایک انتہا کو پہنچ کر بہت پہلے ہی فکری توازن کا فقدان ظاہر ہو چلا تھا۔ اور تصورِ زندگی کے نظم و ضبط میں جنونِ عمل رخنے پیدا کر چلا تھا، تقریباً ۱۹۴۲ء کے بعد تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حلقوں اور ہنگامی مصلحتوں کا ساتھ دے کر اس کو دیگر علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے مطالبوں اور رعائتوں

سے بے نیاز کر دیا۔ ترقی پسندی کے مفہوم و مقصد کی نوعیت بدل دی۔ اس سیاسی شورشِ شعور نے تاریخی جبریت اور جدلیاتی مادیت کے فلسفے سے تاریخ ماضی اور ماضیات سے بجائے استفادہ کے، رشتہ توڑنے کا کام لیا۔ ایسا ہونا صرف یہی نہیں تھا اس کا رجحان نے ناگزیر طور پر کچھ قربِ آزادی کے ہنگامی حالات کے تحت اور کچھ اپنے فرقہ سفر میں تاریخ و تہذیب کا وہ شعور بھلا دیا جا دبستاں ادب کے لئے اشتراکی ترقی پسند نظریۂ حیات کی بہت بڑی دین تھی اور جس سے اس کا افق وسیع ہو رہا ہے ـــــ آخر اسی جگر شگاف سیاسی عدم خوابی نے ۱۹۷۱ء تک پہنچتے پہنچتے بحران کی کیفیت پیدا کر دی۔

آزادی ایک تمنا تھی جو پوری ہوئی۔ قومی زندگی جو سو سال سے ایک جنونی کیفیت سے گزر رہی تھی، اور جس کے اعصاب میں مسلسل جہد و عمل سے تشنج پیدا ہو چکا تھا اب سانس لینے کی، دم لینے کی اور آرام کی گھڑی آئی تھی۔ لیکن اس کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی حالت جنگ کے بعد فوجیوں کی حالت کی طرح بگڑی ہوئی تھی۔ خواب دیکھی ہوئی آنکھوں کو تمنا کی تکمیل، خواب کا سکون نہیں بخش سکتی تھی۔ حصولِ آزادی سے جہد و عمل کے عادی جذبات کی زندگی میں نفسیاتی طور پر ایک خلا کا احساس پیدا ہوا کہ اب کیا کریں۔ چنانچہ اعلیٰ مقاصد کے لئے جنونِ سرفروشی نے اب اپنی تسکین کے لئے بہیمانہ جذبات کو راہ دی۔ انقلابِ روس کی کامیابی کے بعد کا یہی ہوا تھا تحریکِ آزادی میں اپنے طور پر حصہ لینے والی چھوٹی بڑی سیاسی پارٹیوں اور فرقہ پسند جماعتوں کے بھی اختلافات اور کانگریس و لیگ سے دیرینہ اختلافات نے اب سر اٹھایا جو ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے پیشِ نظر اب تک ضمنی اور ناقابلِ توجہ نظر آتے تھے۔ قومیت، وطنیت، انسانیت کی جن اعلیٰ اقدار کو لے کر یہ تحریک اٹھی تھی اور جنگی تربیت جذبات نے اچھی طرح حاصل کر لی تھی اب اقتدار کی جنگ، فسادات کے لذت و انبساط اور معاملاتِ من و تو میں حقوقِ آزادی کی ہوس کا از طلب میں یوں بھلا دی گئیں کہ حساس ذہنوں پر ان واقعات کا ردِ عمل شدید قسم کے حزن و یاس کے علاوہ کوئی اور نہ ہو سکتا تھا۔ فسادات، تبادلۂ آبادی، ہند و پاک کے عوام کی قیامتی ہجرت، بے کاری و بے روزگاری جیسے حالات میں عہدِ غلامی کی بچی کھچی معاشرتی و اخلاقی قدریں بھی ہاتھ سے جاتی رہیں۔ باغِ عدن سے نکالے ہوئے آدم و حوا کی طرح ہند و پاک کے آدم و حوا کو بھی نئی سرزمینوں میں پہنچ کر زمان و مکاں کے ناسازگار و مخالف عناصر سے مقابلے کی مدافعت کو از سرِ نو دہرانا پڑا۔ ماحول سے مطابقت کے لئے اپنے اندر کی ازلی قوتوں کی پھر سے تلاش کرنی پڑی۔ معاشی و سیاسی ابتری کے اسی زمانے کے کشمکش ہند و پاک تنازعات، ایشیائی ممالک پر مغربی طاقتوں کا خروج، قومی و بین الاقوامی جنگوں کے خطرات نے انسان کی بہیمانہ خود غرضیوں اور خود مرکزیت کو اور بھی عریاں کر دیا۔ تھیا نظری طور پر جمہوری تصورات اور احتسابِ ذات کی طرف بڑھتی رہی، حقوقِ انسانی کے مطالبات کرتی رہی لیکن سیاست کی دو عملی، خود غرضانہ اور منافقانہ سرشت، حجاب قومی و اجتماعی مسائل کی سطح سے اتر کر فرد کے مسائل کی سطح پر آ چکی تھی، عملی طور پر انسان کو مجبوری و محرومی کے حالات میں مبتلا کر کے خود پرستی، خود نگری اور "غمِ ذات" کی طرف مائل کرتی گئی۔ انسانیت اور اخلاق، دردمندی اور ایثار، خدمتِ خلق اور نیک نفسی، عشق اور جنون، بھروسا اور آسرا کے سارے معاشرتی اور سماجی بندھن ٹوٹتے گئے اور ان کی جگہ بے اعتمادی و بے یقینی، نامحرمی و ناشناسی کی فضا نے لے لی۔

انسان اپنی ذات کے ازلی خول میں واپس جانے لگا۔ خارجی ماحول کی حیوانی و وحشی قوتوں سے خوف کھا کر اور ان کی تسخیر کا اپنے میں حوصلہ نہ پا کر اپنی ذات کی مدافعت میں لگ گیا ـــــ ان حالات میں ستم زدوں کو خدا یاد آ گیا اور ان کا دکھ سمجھنے والے اہلِ قلم کو میر کا زمانہ۔

○

اعجاز عسکری

دامِ خیال

برِصغیر ہندو پاک میں آدمی کی اوسط عمر ۲۷ سال کہی جاتی ہے اور ادیب کی عمر اس کے نصف سے بھی کم ہے۔ اردو ادیبوں کے بارے میں یہ اعداد و شمار آپ کو کسی حوالے کی کتاب میں نہیں ملیں گے۔ اس لئے کہ یہ میری دریافت ہے اور کچھ ایسے تحقیقی بھی نہیں کہ تجزیہ اور تقابل کے لئے حقائق آپ کے سامنے نہ رکھے جا سکیں۔ مجھے ٹھیک سے تو نہیں معلوم کہ عمر گھٹنے کا یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا، لیکن اتنا تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ پچھلی دو دہائیوں میں شعر و ادب کے کتنے ستارے طلوع ہوئے اور غروب ہو گئے۔ کل تک جن کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے آج وہ پاتال کی پستیوں میں پڑے اپنی عمر کے دن گزار رہے ہیں اور اب ان کا ذکر بھی گراں گزرتا ہے۔ پچھلے بہت سے دنوں سے یوں ہوتا رہا ہے کہ ہمارا شاعر آندھی، مینہ کی طرح اٹھتا ہے اور تھوڑی سی دیر میں برس جاتا ہے۔ اس کی زندگی شہابِ ثاقب کی زندگی بن گئی ہے۔ اس دردناک کہانی کا آغاز اور انجام دونوں دلچسپ بھی ہیں اور عبرت آموز بھی۔

عمروں میں یہ تخفیف افسانے اور تنقید میں بھی ہوئی ہے۔ حالیؔ تو تاریخی حیثیت سے ہی سہی، بہت دن جی لئے، لیکن زندہ نقادوں میں سے بہت سے اپنی آنکھوں سے ہی اپنا غروب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ادبی زندگی کا اختصار شاعری میں کچھ زیادہ نمایاں ہے۔ اس لئے میں اپنے دعوے کی تائید میں شہادتیں شاعری سے ہی لاؤں گا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ ۱۹۴۲ء میں جو نسل ابھری اس میں سے دو ایک ہی نام ایسے ہوں گے جو اب بھی کسی اہمیت کے مالک ہیں۔ اس نسل کا ایک بڑا حصہ امتدادِ زمانہ کی نذر ہو چکا ہے، جو باقی بچے ہیں وہ بیساکھیوں کے سہارے چل رہے ہیں۔ آج ہر لمحہ کے ساتھ قصرِ شہرت کا ایک ستون گر جاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ فقرہ کس نے کہا تھا لیکن یہ ایک فقرہ اردو شاعری کی تقدیر بن گیا ہے۔ ۴۵ء کے لگ بھگ پنجاب میں کسی سے پوچھتے تھے: "آپ کا سب سے اچھا شاعر کون ہے؟" تو صرف ایک جواب ملتا تھا "یوسف ظفر!" آج یوسف ظفر کے فاتحہ خواں بھی ناپید ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں اور اس کے بعد ایسے بہت سے شاعروں کے گن گائے گئے جن کا آج کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ میں ان لوگوں کی نہیں کہتا جو وقتی طور پر ابھرتے ہیں اور بجھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ تو ہر دور میں ہوئے ہیں۔ میرے اپنے قصبے میں کئی ایک ایسے شاعر زندہ ہیں جو اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اقبالؔ اور جوشؔ کو شہرت مل گئی ورنہ ان کا مرتبہ بھی کسی طرح کم نہیں! سوال تو ان لوگوں کا ہے۔ جنہیں شہرت نصیب ہوئی، جو صلاحیت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے، جنہیں اس دور کے "مقتبسوں" نے بانس پر بھی چڑھایا۔ آج وہ دونوں زندہ ہیں اور سعدون کا انجام ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ سردارؔ جعفری، وامقؔ جونپوری، کیفیؔ اعظمی، غلام ربانی تاباںؔ اور اس قبیل کے بہت سے شاعر اب صرف پس انداز کی ہوئی شہرت کے سہارے چل رہے ہیں۔ حالانکہ ایک زمانے میں ان کا حریف ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

سردار جعفری نے اپنی نظم "ایک خواب اور" ۵۰ء میں شائع کرائی تھی۔ پچھلے مہینے ادبِ لطیف[1] میں ان کی یہی نظم پھر شائع ہوئی ہے۔ اس بات سے جو نتیجہ آپ چاہیں اخذ کر لیجئے! خود فیض حقیقت سے زیادہ خوابِ پریشاں بنتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ کہنا مشکل نہیں کہ اب انہیں کتنے دن اور جینا ہے۔ یوں بھی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کے بعض حصوں کے مقابلے میں اب کچھ پیش کرنا ان کے لئے دوبھر ہو رہا ہے۔ ان کی ایک حالیہ نظم "ملاقاتِ مری" جو "سات رنگ" کے سالنامہ میں شامل ہے، "دستِ صبا" کے فیض کا اندوہناک تمسخر اڑاتی ہے! جوش صاحب کے انجام سے تو ہم سب اچھی طرح واقف ہیں۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ ان لوگوں کے غروب کا سبب تحریک کا وہ خوابِ رنگیں تھا جو بہت جلد ٹوٹ گیا اور اس کے ساتھ ہی اوراقِ گل بھی بکھر گئے۔ لیکن شاعری کے عقیدہ پر اتنا انحصار یوں بھی "مستحسن" نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ پھر یہ صلاحیت کے کسی فتور یا فقدان کا بھی لامحالہ احساس دلاتا ہے۔ اور آخری بات یہ کہ اس عذرِ لنگ سے میرے بنیادی دعوے کی تردید نہیں ہوتی کہ شاعری کی عمر بتدریج گھٹ رہی ہے۔

صرف ۳۰ء کی نسل ہی نہیں، ۴۰ء کی نسل کے بھی کئی ایک چراغ ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ اوروں کو تو چھوڑیئے کہ وہ صرف بعض رسائل ہی میں آپ کو نظر آئیں گے۔ صرف ان لوگوں کو لیجئے جنہوں نے بہت دیر تک شاعری کا ساتھ دیا یہاں تک کہ مجموعے شائع کئے اور اب چپ سادھے ہوئے ہیں۔ میں چپ کو برا نہیں سمجھتا، لیکن ڈرتا اس بات سے ہوں کہ یہ چپ کہیں سکتہ نہ بن جائے۔ میں یہاں چاند نگر، برگِ نے اور دوہے، غزلیں اور گیت کے شاعروں کا ذکر کروں گا جو ایک ایک مجموعے کے بعد ٹھٹھر کے رہ گئے ہیں۔ یہ تین مثالیں کسی باہمی ربط کے بغیر بیساختہ طور پر چنی گئی ہیں۔

ناصر کاظمی کی بدلی جس گھن گرج سے اٹھی تھی ویسے ہی برس کر کھل بھی گئی۔ اب ان کے پاس مایوس کن خاموشی ہے اور وہ کسی نئی ڈگر کی تلاش میں ہیں جس پر روایت کی انگلی پکڑے بے خطر بڑھتے چلے جائیں۔ "آئینے آنکھوں کے دھندلے ہو گئے" میں "کہیں تارا کہیں جگنو چمکا" سے زیادہ بلاغت اور معنویت ہے۔ یہاں وہ ایک قدم اور آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کون جانے کہ یہ راستہ بھی ان کی راہِ مستقیم ہے یا نہیں؟ ابنِ انشا جوگیانہ اندازِ بیان کے سہارے ایک مجموعہ تک چلے اور ڈوب گئے۔ "خالی انشا جی" کہہ کر بھی کوئی کب تک دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے۔

اب کچھ کہتے ہیں تو خود اپنی آوازِ بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ "الف لیلیٰ کی ایک رات" کا شاعر ایک مجموعہ کے بعد ہی اتنا فارغ ہو جائے کہ وہ چینی نظموں کے ترجمہ کی فرصت نکال لے۔ اس بدنصیبی پر ماتم مت کیجئے بلکہ اپنے بعد آنے والوں کی فکر کیجئے۔ جمیل الدین عالی نے شخصیت کے اظہار کا ذریعہ دوہوں کو بنایا۔ جلد ہی یہ سوتے بھی خشک ہو گئے۔ دوہوں میں سنجیدہ بات بھی غیر سنجیدہ معلوم ہوتی ہے، پھر ان کے مقلدوں نے دوہوں کی زمین کو اتنا گندا کر دیا ہے کہ عالی کے لئے اس طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔

میرے عہد کے ان تین شاعروں کا انجام خود اپنی جگہ اہم ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کے زوال کی پرچھائیاں نئی نسل پر بھی منڈلا رہی ہیں۔ ان سے بے خبر نہیں رہا جا سکتا۔

تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ ہمارے شاعر کی عمر ہی نہیں قد بھی گھٹ رہا ہے۔ فیض، جذبی یا مجاز کو حسرت، یگانہ اور فانی کے مقابل پیروں میں بانس باندھ کے بھی کھڑا کرنا مشکل ہے۔ بالکل اس طرح جیسے حسرت، یگانہ اور فانی، غالب یا مومن کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نئے شاعروں میں فیض اور جذبی کا مدِمقابل بھی ملنا مشکل ہے۔ مجھے نہیں معلوم فیض کا اپنے بعد آنے والی نسل کے

---

[1] یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ محترم جعفری صاحب نے یہ نظم از خود نہیں بھیجی تھی بلکہ ہماری درخواست پر بھیجی گئی تھی۔ ہند و پاک کلچرل کانفرنس کے موقع پر پاکستان ہائی کمشنر کے دفتر میں جو مشاعرہ ہوا تھا سردار جعفری صاحب نے یہ نظم وہیں پڑھی تھی۔ اور ہم نے ادبِ لطیف کے لئے ان سے مانگ لی تھی (مرتب)

بارے میں کیا خیال ہے؟) لیکن جوش کہتے ہیں کہ فیض اور جذبی کی نسل کے بعد انہیں بڑی مایوسی ہوتی ہے (غالباً انہوں نے اختر الایمان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچا) اور جذبی صاحب کو اس نسل میں کوئی اسپارک نظر نہیں آتا۔ یعنی ابنِ انشا، کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی سب آتش نواں سے محروم ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ خود فیض اور مجاز بیس اکیس سال کی عمر میں اپنی ایک ایک نظم کے لئے مشہور ہو گئے تھے۔ نئے شاعروں میں سے کسی ایک کو بھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ ظاہر ہے شہرت کا دیوتا تو اندھا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ساحر، اختر الایمان سے زیادہ مشہور و مقبول ہیں اور شکیل بدایونی ان دونوں سے کہیں زیادہ۔ پھر یہ دور مشاعروں کا دور نہیں۔ اچھے اور نئے شاعر مشاعروں میں شریک ہونا بھی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ پھر جذبی جس شہرت کا ذکر کرتے ہیں اس میں تحریک کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ جوش صاحب نے جو کچھ کہا اس کی صفائی میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مزاج و مذاق کا فرق ہے اور نیا شعری مذاق و مزاج پرانی روایات سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ پرانا مزاج نئے شعری ماحول سے نامانوس ہے۔ پھر فیض اور جذبی کی مقبولیت کا دارومدار غزل پر ہے اور غزل کلاسیکی ادب کے رچاؤ تک لے جاتی ہے۔ لیکن نئے شاعروں نے اپنے پر پرزے بنیادی طور پر نظم میں نکالے ہیں اور نظم بھی "انقلاب وانقلاب انقلاب" والی نہیں۔ بلکہ اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی اور منیر نیازی کے خوابناک دھندلکوں اور پُراسرار پرچھائیوں والی (اس لئے جوش صاحب کی مایوسی فطری بھی ہے اور لازمی بھی) پھر نئے شاعر روایت سے بہت حد تک منحرف بھی ہیں۔ روایت اور بندھے ٹکے راستے سے انحراف یا نئے تجربات کرنے کا چسکا "بزرگوں" کی نظروں میں وقار حاصل کرنے اور ناموری کمانے کا ذریعہ ذرا کم ہی بنتا ہے۔ فانی یا اصغر اقبال کے کم ہی معترف ہوتے۔ بلکہ جگر کو تو اقبال ایک آنکھ نہ بھائے اور آخر دم تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ اقبال نے اردو شاعری کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے (اگر عابد اللہ غازی کی روایت غلط نہیں تو یہ بات بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ جگر کو اپنا جانشین جذبی اور دوسروں کو چھوڑ کر [illegible] کی ہی شکل میں کیوں نظر آیا؟) غالب کو بھی ان کے بزرگوں نے سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا تھا۔ شارعِ عام سے ہٹ کے چلنے والوں کو ہمیشہ معتوب ہونا پڑا ہے۔

میں بلا کسی جھجک کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ نئی نسل کی طرف سے مایوس ہو جانا انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔ اوّل تو یہ کہ یہ نسل تشکیل کے دور سے گزر رہی ہے اور اس کے امکانات ابھی پوری طرح شروع بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اور فیض والی نسل کے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ پھر شاعروں کی یہ کھیپ بڑی متنوع اور رنگا رنگ ہے۔ اس نسل میں جذباتی ارتفاع ہوا ہے۔ حقیقت کی تلاش و جستجو زیادہ سنجیدگی سے شروع ہوئی ہے۔ وقتی اور ہنگامی ضرورتوں کو منہ نہیں لگایا گیا۔ جذبہ کے اظہار میں بلند بانگ ہونے یا گھن گرج کے بجائے لہجہ کا دھیما پن آیا ہے تجربات کی ایک نئی لہر چلی ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس کی موجودہ رفتارِ ترقی میں جوش صاحب کی مایوسی کے باوجود پُر امید رہنے کے لئے خاصا سہارا موجود ہے۔

لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ نئے شاعر کو ایک طرف فیض اور جذبی اور دوسری طرف انشا، ناصر اور عالی کے ملبے پر اپنی شاعری کی بنیاد پر کھڑی کرنی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تعمیرِ نو کے لئے چونا اور گارا کہاں سے آتا ہے۔ ورنہ کہیں فراق اردو کا آخری شاعر نہ ہو جائے اور بیس سال کے بعد اردو کے شاعر بالشتئے نظر آنے لگیں۔!

پروفیسر حنیف فوق

اے دل ٹھہر!

اجنبی راستوں میں بھٹکتے ہوئے
درد کی رہگذر میں بھٹکتے ہوئے
تو نے تاروں سے رکھی امیدِ سحر
بخت کی تیرگی سے الجھتے ہوئے

ریگ زاروں کو سیرابِ خونِ وفا
کر کے عشاق کے قافلے سو گئے
پا کے تاروں سے منزل کا اپنی نشاں
وادیٔ دشتِ ظلمات میں کھو گئے

کوکبِ چشمِ جادو کے مارے ہوئے
آرزو کا اٹھاتے رہے ہر ستم
نوکِ خارِ رقابت سے چھلنی ہوئے
جستجوئے رفاقت میں بڑھتے قدم

پھر ہوس کی سلاخوں سے داغی گئی
روئے مریم کی حسرت میں اٹھتی نظر
پھر شقاوت کی سولی پہ کھینچی گئی
سوزِ الفت کی تقدیسِ خونیں جگر

سیمیا بن گئی کیمیائے نظر
تو گرفتارِ نیرنگ، اے دل ٹھہر

تیرے غم گین نغموں کی زخمی اڑان
اس فضا میں سسکتی ہی رہ جائے گی
اُس کی زُلفوں کی خوشبو کو چھونے سے قبل
سیلِ ظلمت میں ہر سانس بہہ جائے گی

جائے گی اس کے آنچل کی حسرت میں جاں
موت لہرائے گی از کراں تا کراں
نہ حصارِ زمیں، نہ غبارِ زماں
مشعلِ ماہ و انجم دھواں ہی دھواں

وہ نظر چاندنی، وہ نظر تیرگی
داغِ مہتاب سے آگ لگنے لگی
یاد کے جنگلوں کی گھنی خامشی
خشک پتّوں کے مانند جلنے لگی

ہونٹ سلنے لگے نازِ بیداد سے
زخم کھلنے لگے بادِ فریاد سے
قصرِ شیریں تو فردوسِ شدّاد ہے
کوہ سنساں ہوا مرگِ فرہاد سے

اے دلِ ناتواں یہ ہے تیرا نصیب
تیشۂ آرزو، آگہی کی صلیب

شامِ اغیار ہو یا شبِ دورِ زر
آبروئے وفا ہے طوافِ قمر

شاذ تمکنت

قمر نامہ

ملاقات کی یہ شبِ اوّلیں
ہوا کیف ساماں، فضا احمریں
یہ ہنگامِ جلوہ یہ گلبانگِ دید
یہ میلادِ آدم، یہ نوروزِ عید

قمر اپنے شاعر کی روداد سُن
پلک سے مرے اشکِ دیدار چُن

معنّی ہوں، کرتا ہوں سُر کا سنگار
شعاعوں سے گوندھا ہے گیتوں کا ہار
یہ تشبیہ کا رَس تری دین ہے
یہ الفاظ کا جَس تری دین ہے
شناسائی تجھ سے، ترے نُور سے
رہی ہے مجھے دیر سے، دُور سے
مجھے یاد ہے اپنے بچپن کا سِن
شرارت کی راتیں، شرارت کے دن
تعارف ہوا غائبانہ ترا
سُنا اپنی ماں سے فسانہ ترا
وہ وادیِ رنگین و جادو صفات
وہ بڑھیا کا قصہ، وہ چرخے کی بات
پکارا تجھے سو دفعہ پیار سے
یہی آس اُترے تو دیوار سے
وہ معصوم سی اک محبت مری
وہ ننھی سی منت سماجت مری

غرض تا بہ ایں وقت بڑھتا گیا
زمانہ کا سیلاب چڑھتا گیا

کہوں کیسے اُفتادِ عہدِ شباب — جدائی کی تعبیر، چاہت کا خواب
وفا کا چلن نیشتر کی طرح — بیاباں کی وُسعت بھی گھر کی طرح
مری بستیاں جب خرابہ بنیں — یہ آنکھیں لہو کا دوآبہ بنیں
کسی کی ملاقات و رخصت کا غم — مری عمر بھر کی مسرّت کا غم
بہ ایں سلسلہ ہائے شام و سحر — مرے واسطے تو رہا چارہ گر
بجُز تیرے ہمدرد کوئی نہ تھا — رفیقِ رُخِ زرد کوئی نہ تھا

اسی رشتۂ درد نے کھینچ کر
مجھے لا بٹھایا ترے بام پر

مرا ذوق و شوق و تگ و تاز دیکھ — جنوں ہو چلا ہے، خرد ساز دیکھ
مسلسل خروشاں، رواں، نغمہ خواں — ازل کے مسافر کی منزل کہاں
گِل و خاک کی سرفرازی کی خیر — کمندِ ہُنر کی درازی کی خیر
زمانہ عناصر سنبھالے ہوئے — ستاروں کی گیندیں اُچھالے ہوئے
نہفتہ دریچوں کو کھولے ہوئے — خلاؤں کی نبضیں ٹٹولے ہوئے

پجاری ترا، تیری چوکھٹ پہ ہے
جنم کا یہ پیاسا چندر تٹ پہ ہے

اختر حسین جعفری

دکھ دائم ہے......

اُجڑی اُجڑی پیاسی دھرتی، اُجڑے اُجڑے پیڑ یہاں
حدِ نظر تک شہر نہ قریہ، حدِ نظر تک ریگ رواں
سُورج چاند، ستارے سارے آتش پارے سنگ فشاں
کوئی یہاں کیا آئے، یہاں تو ہے کسے کب جائے اماں

ایک اکیلا میں اس ویرانے میں صبح و شام پھروں
اپنے سائے کے پیچھے بھاگوں، اپنے آپ سے آپ ڈروں
اک پتھر سے ٹھوکر کھاؤں۔ اک پتھر پر جا بیٹھوں

سوچتا ہوں یوں روتا ہر سو اشکوں کے دریا بہتے
میرے پاؤں کے چھالے تقدیرِ برگِ حنا ہوتے
ساتھ اگر رونے میں ہوتا اور کوئی سودائی بھی
وہ ماتم برپا ہوتا چلّا اُٹھتی تنہائی بھی

ایک مرے رونے سے کب اشکوں کا دریا بہتا ہے
قطرہ قطرہ پینے والا پیاسا پیاسا رہتا ہے
دُکھ دائم ہے جب تک ہر کوئی اپنا دُکھ سہتا ہے

عرش صدیقی

کدھر جائے اولادِ آدم مسیحا

کِدھر جائے اولادِ آدم، مسیحا
کہ دم گھُٹ رہا ہے کلیسا میں اس کا
یہاں سے وہاں تک
حدِ لامکاں تک
فضاؤں میں عفریتِ مرگ آ بسے ہیں
خلا زیست کی روشنی کھو رہے ہیں
نگاہوں سے سب راستے گم ہوئے ہیں

اُلمپس ـــ رنگیلے خداؤں کا مسکن
ردائے عدم اوڑھ کر سو گیا ہے
وہ یُونان ـــ گہوارۂ عشرت کا معدن
لُٹا کر ذرِ زیست چُپ ہو گیا ہے

ہے اب حُسنِ وینس فقط اِک ستارا
اسی غنچے سے کرنوں کا دامن چھِنا ہے

اپالو کو مصلوبِ اعظم نے مارا،
زِیوس آتشِ علمِ نو میں جلا ہے

اُلمپس، کہ سرچشمۂ زندگی تھا
ہے اب اک پُرانے تمدّن کا مدفن
لہو رنگ قربان گاہوں کے نیچے
دبائے ہیں اِنساں نے ماضی کے رہزن

لُٹی پیروانِ مسیحا کے ہاتھوں
متاعِ فسونِ کلامِ پیمبر،
کلیسا و راہب پریشاں ہیں دونوں
مسیحا مگر بے خبر ہے فلک پر

عرب، مصر و ایراں ـــ مرِ والیٔ غازی
ہے سب کی نوا بے اثر، پا بجولاں

بجھی آگ گنگا میں گوتم کے دل کی
ہوئی گُم متاعِ خلوصِ سدا ماں

خروشیف کہتا ہے راکٹ اُڑا کر
"مزائل میں تقدیرِ انساں چھپی ہے
نہ شیوجی بھتے کوئی، نہ رحمانِ برتر
خداؤں کا خلّاق خود آدمی ہے"

مزائل — خدایانِ سائنس کے شاہیں
بنے ہیں فرومایہ انساں کے رب
کب اپنے ہی خالق کو لقمہ بنائیں
بس اُس ایک لمحے کے ہیں منتظر سب

کہاں ہیں
مسیحا نفس پیروانِ مسیحا
کہاں ہیں!

کہاں ہیں
محمدؐ کی تقدیس کے نام لیوا
کہاں ہیں!

کہاں ہیں
مقالاتِ گوتم کے شیدا کہاں ہیں
کہ اولادِ آدم کا دَم گُھٹ رہا ہے!
فضاؤں میں عفریتِ مرگ آبسے ہیں!!
یہاں سے وہاں تک
حدِ لامکاں تک
خلا زیست کی روشنی کھو رہے ہیں
نگاہوں سے سب راستے گُم ہوتے ہیں!!

○

عبّاس اطہر

دیواریں

ایک وہ دن تھے
جب ہم چاند کو ماموں کہتے
اور یہی ضد کرتے تھے
جدھر میں جاؤں چاند اُدھر ہی جاتا ہے
چاندنی راتوں میں جب مِلے راس رچاتے
ہم دونوں بھی موج میں آ کے
شرط لگاتے
تم پچھم کو دوڑ کے کہتے
"ا ہا ہا چاند ہے میرے سات"
پورب میں میری اُونچی آواز گونجتی
"دیکھو دیکھو جھوٹی ہے یہ بات"

۲

جب سورج نے دُور دُور تک آگ بکھیری
مین نے سر پر آئی جھیلی
اور سیہ رنگت بھی پہنی
چاند کی کھوج میں تم لیکن آواز کی حدیں
پھاند گئے
اب تم پچھم ہو ––––– میں پورب
چاند، سمندر، موسم، سورج ––––– سو دیواریں

بشیرؔ منذر

مرحومؔ کی یاد میں

کر دیا خود کو ترے غم کے حوالے ہم نے ۔۔۔ یوں تری چاہ کے ارمان نکالے ہم نے
دل تو روتا ہے مگر خشک ہیں آنکھیں اپنی ۔۔۔ پی لیئے آگ کے بھر بھر کے پیالے ہم نے
نہ مِلا تو نہ کہیں تیری خبر ہی پائی ۔۔۔ نہر تو نہر تھی، دریا بھی کھنگالے ہم نے

ہم تجھے ڈھونڈ نکالیں گے تو جس دیس میں ہے
ہم تو پہچان ہی لیں گے تجھے جس بھیس میں ہے

اک زمانے کے لبوں پر ہے کہانی تیری ۔۔۔ ایک اک دل میں بسی غم کی نشانی تیری
ہائے وہ پھول سا چہرہ وہ کشادہ سینہ ۔۔۔ بھول سکتی ہی نہیں اُٹھتی جوانی تیری
کون سی بات پہ تو روٹھ کے مُکھ موڑ گیا ۔۔۔ کون سی بات تھی جو ہم نے نہ مانی تیری

کوئی بھی آنکھ نہیں ایسی جو نمناک نہ ہو
کوئی بھی سینہ نہیں ایسا جو اب چاک نہ ہو

اپنے ماں باپ کی قسمت کا سہارا تو تھا ۔۔۔ زندگی ایک سمندر تھی، کنارا تو تھا
دو گھڑی بھی نہ ٹھہر پایا بھری دنیا میں ۔۔۔ کوئی خوشبو تھا، صبا تھا، کہ شرارا تو تھا
عید کا چاند تھا نکلا تھا، ابھی ڈوب گیا ۔۔۔ ٹوٹ کر کھو ہی گیا کوئی ستارا تو تھا

اپنے ابّا کے بڑھاپے کو سنبھالا ہوتا
موت کو اور بھی کچھ روز تو ٹالا ہوتا

لہ منیر الفضل: میرا بھانجا تھا جو ۱۳ر جولائی ۱۹۶۱ء کو نالہ بھمبر گجرات میں ڈوب کر لاپتہ ہو گیا۔ (بشیرؔ منذر)

عزیز میرٹھی

گیت

شیتل بھور کا سندر سپنا۔ گھور اندھیری رین ہوا
اُس کے بجھتے دیپک دیکھے
پیار کے جلتے پھول
سکھ کے گرتے رنگ محل اور
دُکھ کی اُٹھتی دھول
سوچ کا گہرا ساگر دیکھا
ڈگمگ ناؤ اکیلی
سُونی سیج پہ بیٹھی روئے
گیت کسی دُکھیاری کے کومل ہردے۔ کا بین ہوا
شیتل بھور کا سندر سپنا، گھور اندھیری رین ہوا
پربت پیچھے چاند کو دیکھا
روتے ندی کنارے
سُونے سُونے پنگھٹ دیکھے
سہمے سہمے تارے
نگری نگری پھرا مسافر
گھوما گاؤں گاؤں
بن گجروں کے باہیں دیکھیں
بن پائل کے پاؤں
دیکھ دیکھ کے انکھیاں روئیں
گھائل من بے چین ہوا
شیتل بھور کا سندر سپنا، گھور اندھیری رین ہوا

رضیہ فصیح احمد

سردِ جہنم

اسٹیشن طرح طرح کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ کنڈکٹر نے امجد کو بتایا کہ ائیر کنڈیشنڈ کوچ کے کمرے میں اس کی برتھ ہے۔ ائیر کنڈیشنڈ کوچ کے باہر الوداع کہنے والوں کا ایک ہجوم غفیر تھا۔ دروازے سے لگی ہوئی ایک سبز مدحسین لڑکی نیچے کھڑے ہوئے لوگوں سے بات چیت کر رہی تھی۔ EXCUSE ME کہکر وہ اندر داخل ہو گیا۔ لڑکی سمٹ کر ایک طرف ہو گئی۔ جگہ تنگ تھی وہ اس کے نزدیک سے ہو کر گذر گیا۔ ہلکی سی خوشبو کی ایک لپٹ ساتھ چلی آئی۔ کمروں کے آگے کوریڈور اور بھی تنگ تھا۔ کھڑکیوں کے شیشوں پر سبز رنگ کے دبیز پردے کھنچے ہوئے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی خنکی کا احساس ہوتا تھا۔ امجد کو کوپے میں جگہ ملی تھی جسمیں صرف دو سیٹیں ہوتی ہیں۔ امجد کی سیٹ اوپر کی تھی۔ سامان رکھوا کر وہ اپنے دوستوں سے ملنے چلا آیا۔ وہ خوبصورت سی لڑکی اب تک کھڑکی میں کھڑی باتیں کئے جا رہی تھی۔ وہ نزدیک پہنچکر کھڑا ہو گیا۔ تب اُسے احساس ہوا اور وہ SORRY کہکر ایک طرف ہٹ گئی۔ امجد اس کے قریب سے گذر گیا۔ خوشبو، نرمی، گرمی، اور روشنی کا کچھ عجیب سا احساس لئے۔ اس احساس کا تعلق کچھ اس شعلۂ جوالہ سے تھا۔ یا یوں کہ باہر واقعی گرمی تھی، روشنیاں تھیں ——— پلیٹ فارم کی روشنی، بک اسٹال کی روشنی اور چائے خانوں کی روشنیاں۔ بہر حال جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑا دوستوں سے باتیں کر رہا تھا تب بھی یہ نامعلوم احساس اُس کے دل کو گدگدا رہا تھا۔ جب گاڑی کھسکی تو وہ اندر داخل ہو گیا وہ لڑکی جو سب کو خدا حافظ کہہ رہی تھی پھر ایک طرف سرک گئی اور امجد اس کے برابر میں کھڑے ہو کر اپنے دوستوں سے ہاتھ ہلانے لگا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ کاش یہ پلیٹ فارم میلوں لمبا ہو جائے اور وہ دونوں اس طرح پہلو بہ پہلو کھڑے رہیں مگر پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور وہ لڑکی اندر جانے کے لئے مڑی۔ امجد بھی پیچھے ہو لیا۔ کوریڈور میں دو آدمیوں کے برابر چلنے کی جگہ نہ تھی اس لئے وہ لڑکی کے پیچھے چلتا رہا۔ اس کا چست لباس اور چنے ہوئے دوپٹے کے ..... دونوں کونے ہلکورے لے رہے تھے اور خنکی کے باوجود اس کے دل میں گرمی کی شعاع بیدار کر رہے تھے۔ وہ اپنے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئی اور امجد دو قدم بڑھ کر اپنے کمپارٹمنٹ میں۔ یا اتفاق بھی کیسا دل خوش کن تھا۔ اس کو امجد کے نزدیک ہی جگہ ملی تھی۔ پاس سے گذرتے ہوئے ایک جھلک ہی میں امجد نے دیکھا کہ کمرے میں کوئی اور خاتون بھی ہیں۔ یہ کمرہ بھی کوپے تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ اٹھا کر وہ باہر جھانکنے لگا۔ روشنیاں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں۔ نیلے شیشوں میں سے گزرتے ہوئے مناظر الف لیلوی سے معلوم ہو رہے تھے۔ مگر اس کا خیال بھٹک کر بار بار اپنے نزدیک کے کمپارٹمنٹ میں لوٹ آتا تھا۔ وہ ایک خوشبو کی لپٹ، گھنی بھوؤں کی چھاؤں میں گہری لانبی کالی آنکھیں اور ہونٹوں پر میٹھی سی مسکراہٹ، اتنی ہلکی جیسے ہو بھی اور نہ بھی ہو۔ بیٹھے بیٹھے گیارہ بج گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک مرحلے سے کرنل جو زندگی کے سارے رومانوں کو پندرہ سال پیچھے چھوڑ آئے تھے خراٹے لے رہے تھے۔ آخر اس نے بھی لباس تبدیل کیا اور دونوں کمپارٹمنٹ کی مشترک، آئینہ کی طرح شفاف اور چکنی دیوار پر ہاتھ پھیرتا ہوا جانے کب سو گیا۔

رات کو کسی وقت اس کی آنکھ کھلی تو کوریڈور میں کچھ ہنگامہ سا تھا۔ شاید کچھ لوگ اتر یا چڑھ رہے تھے۔ سوتی جاگتی کیفیت میں ایک میٹھا سا قہقہہ اس نے اپنے دروازے کے عین سامنے سُنا اور پھر وہ سو گیا یا شاید پہلے ہی سو رہا تھا۔ صبح لاہور سے چند اسٹیشن پہلے اٹھا۔ تیار ہوا اور ڈائننگ کار کی طرف چلا۔ دروازے پر وہی خوبصورت لڑکی اور اس کی ساتھی عورت کھڑی تھیں۔ اور نزدیک ہی ایک ناٹا سا بانکا لڑکا کھڑا تھا۔ یہ لڑکا

پہلے سے اس کا شریکِ سفر نہیں تھا۔ ضرور کہیں راستے میں چڑھا ہے۔ امجد نے سوچا۔ لیکن جس اطمینان سے وہ ان عورتوں میں کھڑا تھا یہ دیکھ کر امجد کو اس کی ڈھٹائی پر تعجب ہوا۔ ڈائننگ کار میں جاتے جاتے امجد لوٹ آیا۔ اور واہگہ اسٹیشن پہ اترنے کے بہانے وہیں کھڑا ہو گیا۔ خوبصورت سی لڑکی نے نہ جانے کیا کہا کہ دوسری خاتون مڑ کر امجد کی طرف دیکھنے لگیں۔ اور پھر وہ لانبا لڑکا بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی کے چہرے پہ بھی نامعلوم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑا سکون محسوس ہوا کہ لاہور پر صرف وہ خاتون اتریں لڑکی نہ اتری لیکن یہ دیکھ کر دکھ بھی ہوا کہ وہ لانبا سا لڑکا نہ اترا نہ جانے کیوں یہ لانبا لڑکا اسے اپنی نظر میں خار کی طرح کھٹکتا محسوس ہو رہا تھا۔ امجد جب ڈائننگ کار میں پہنچ کر ناشتہ کرنے لگا تو وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر داخل ہوا۔ اچٹتی ہوئی ایک نگاہ تمام چیزوں پہ ڈالتا وہ آ کر امجد کی میز پہ قریب والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ امجد کو یہ بات قطعی نہیں بھائی گاڑی میں دو طرفہ میزیں لگی ہوئی تھیں جن کے گرد چار چار کرسیاں بچھی تھیں۔ کئی ایک میزیں خالی تھیں پھر آخر میاں اس کے پاس آ کر کیوں بیٹھا۔

"ابھی زیادہ گرمی شروع نہیں ہوئی؟" بیٹھتے ہی نہایت بے تکلفی سے اس نے امجد کو مخاطب کر ڈالا۔ خواہ مخواہ امجد کا دل چاہا کہ اس کی مخالفت کرے۔

"گرمی تو خوب ہے۔ دوپہر کو اس کا عالم دیکھئے گا۔ ابھی میں نیچے اترا تھا تب بھی اندازہ ہوتا تھا کہ گاڑی کے اندر باہر کے ٹمپریچر میں کتنا فرق ہے۔"

"اچھا ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ واقعی باہر تو ضرور گرمی ہو گی، مجھے خیال نہیں رہا" اسے اپنی غلطی کا احساس کرتے دیکھ کر امجد کو عجیب قسم کی خوشی ہوئی۔ بیرا اس لڑکے کے آگے ناشتہ رکھنے لگا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے بدتمیزی سے بیٹھا کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا" پھر بولا: "اس نیلے شیشے میں سے یہ دوڑتے ہوئے کھیت، کیسے عجیب معلوم ہو رہے ہیں۔"

"جیسے T.V. دیکھ رہے ہوں" امجد نے اس پر رعب ڈالنے کی کوشش کی۔

"T.V." وہ ہنسا "T.V. بھی خوب چیز ہے۔ جب میں امریکہ گیا تھا تو شروع میں سارا سارا دن T.V. کے سامنے بیٹھا رہتا تھا۔"

"اچھا ۔ ۔ ۔ ۔" امجد نے اس انکشاف پر کسی تعجب یا خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ لڑکے کی نگاہیں دو ایک بار دروازے کی طرف اٹھیں۔ لیکن امجد کو اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ ناشتے پر جھک گیا: "امریکن، انگریزوں کے مقابلے میں کچھ بدتمیز سے ہوتے ہیں" امجد نے کہا۔ شاید وہ اس چوٹ کو سمجھ جائے۔

"میرا خیال ہے وہ جان بوجھ کر انگریزی ETTIQUATE کے خلاف کرتے ہیں تاکہ ان سے جدا نظر آئیں" اس نے کہا۔

"جیسے زور زور سے چلنا، دروازے دھڑ دھڑانا۔ بلا تعارف کے ہر شخص سے بات کر لینا" امجد نے بات بیچ میں اچک لی۔ چوٹ صاف اس پر جاتی تھی مگر وہ بھی ایک چکنا گھڑا تھا۔ مزے سے ٹوسٹ کے ایک نوالے کے ساتھ نگل گیا۔ اور بولا ۔ ۔ ۔ ۔ "میں نے عرض کیا نا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں مثلاً انگریز بائیں ہاتھ میں کانٹا پکڑ کر کھاتے ہیں امریکن ہمیشہ دائیں سے کھاتے ہیں" امجد نے دیکھا وہ بھی دائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔

"اور ہم بے چارے پہلے انگریزوں کے پیچھے دوڑتے رہے ابھی ان کی تقلید پوری طرح نہ کر پائے تھے کہ امریکنوں کے پیچھے لگ گئے۔

گویا ؎
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں"

امجد نے طنز کیا۔ وہ ہنس پڑا جیسے امجد نے کوئی لطیفہ کہہ دیا ہو۔ غریب کے پاس شئے لطیف کی اس حد تک کمی ہے کہ اس کو شبہ بھی نہ ہوا کہ میں نے اس چوٹ میں اس کے انداز نشست، کھانے اور اونچی اونچی بشرٹ کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ امجد نے سوچا۔

اس وقت دروازہ کھلا اور خوشبو کا ایک جھونکا پورے کمرے میں تیر گیا۔ فضا یکلخت رنگین ہو گئی۔ دونوں نے اُدھر دیکھا اور وہ لڑکی مسکرا دی۔ ہاں وہ ضرور مسکرائی تھی۔ اس میں کچھ شبہ نہ تھا۔ مگر کیوں ۔۔ امجد سوچنے لگا۔ اور اس سے بھی اہم سوال اس کے سامنے کھڑا تھا کہ اس کی مسکراہٹ کا مرکز کون تھا وہ یا لمبو یا وہ۔۔۔۔ اسے یقین تھا کہ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ اب اتنی خوبصورت ہو کر ایسی بدذوق تو نہ ہو سکتی تھی کہ ایک دھیپڑ سا لڑکے کے مقابلے میں اس وجیہ شتر مرغ کو دیکھ کر مسکراتی ۔ امجد کو اپنے باپ کے پٹھان اور ماں کے مصری خون پر بجا طور پر ناز تھا۔ بڑے بڑے ہینڈسم مرد تک ایک بار دیکھنے کے بعد پلٹ کر اسے دیکھتے تھے۔۔۔۔ مگر پھر بھی اس کے دل میں کچھ شبہ سا تھا شاید وہ اس لڑکے ہی کو دیکھ کر مسکرائی ہو یا کسی اور کو۔۔۔۔۔ اس نے باری باری سب مسافروں پر نظر ڈالی۔ چند بدوضع، بدہیئت مرد سیاست اور بزنس کو بہت زور و شور سے غلط ملط کر رہے تھے۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ابھی ابھی ڈائننگ کار میں سورج طلوع ہو گیا ہے جس سے نوجوانوں کی آنکھیں چندھیا رہی ہیں چلتی گاڑی میں مختلف آوازیں پورے زور و شور کے ساتھ ساتھ کمپارٹمنٹ میں پھیلی ہوئی تھیں جیسے پنجابی ۔ اردو اور انگریزی کی کاک ٹیل پھیل رہی ہو۔ وہ ضرور اس کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ بالآخر امجد کو یقین ہو گیا اور وہ شمع محفل و نور عین ان کے سامنے والی میز پر بیٹھ گئی۔ کریم رنگ کی دیوار اور نیلے شیشے کے پس منظر نے اس کے حسن کو پژمردگی کا رنگ دے کر اور کشش انگیز کر دیا تھا۔ پونی ٹیل میں اس کی ترچھی آنکھیں اور اونچی ہو گئی تھیں۔ وہ سبز رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھی اور چنا ہوا دوپٹہ کل کی طرح اس کے شانوں پر جھول رہا تھا۔۔۔۔ امجد ناشتہ ختم کر چکا تھا مگر اس وقت اٹھ جانا جیسے اس کے بس میں نہ تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ساتھی ناشتے کے ساتھ اخبار بھی پڑھ رہا ہے۔ گویا دور اندیشی سے کام لے کر وہ ناشتے میں زیادہ سے زیادہ دیر کر رہا ہے۔ امجد نے بیرے کو بلا کر تازہ چائے منگوائی اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ یعنی وہاں سے نہ جانے کا ایک معقول بہانہ اس نے بھی تلاش کر ہی لیا۔ وہ لڑکی میز پر پڑا ہوا ٹائم الٹ پلٹ کر رہی تھی اس کا ناشتہ ابھی نہ آیا تھا۔ امجد حتی الامکان چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا اور کنکھیوں سے لڑکی کی لانبی پلکیں آنکھوں پر گرتے اور اٹھتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ وہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہونے کے باوجود نہایت صفائی سے لڑکی کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ جب دونوں کی نظریں آپس میں ٹکراتیں تو امجد گھبرا کر نگاہیں جھکا لیتا لیکن وہ مسکراتا رہتا۔ بلا کا ڈھیٹ ہے امریکہ سے یہی کچھ تو سیکھ کر آیا ہے امجد تلخی سے سوچتا۔۔۔۔۔۔ کچھ دیر بعد لڑکی کا ناشتہ آ گیا۔ وہ پرچہ میز پر رکھ کر ناشتے میں مشغول ہو گئی۔ لمبے لڑکے نے کرسی کھسکائی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر کوئی چیز اٹھائی اور لڑکی کے پاس جا پہنچا۔ امجد نے دیکھا کہ اس نے سبز رنگ کا ایک چھوٹا سا رومال لڑکی کو دیا جس نے نہایت شیریں مسکراہٹ کے ساتھ لے کر اسے رسالے پر رکھ لیا۔ پھر نہ جانے لڑکے نے اس سے کیا کہا کہ اس نے بڑی ادا سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ لڑکے نے نہایت احتیاط سے وہ رومال ہٹا کر میز پر رکھ دیا۔ اور "ٹائم" اٹھا کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ امجد کو اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ آخر اس نے لڑکی کا گرا ہوا رومال کیوں نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ "ٹائم" بھی اسے مانگ لینا چاہئے تھا کیونکہ شتر مرغ کے پاس تو اخبار پڑھنے کے لئے موجود ہی تھا۔ خواہ مخواہ اتنی دیر سے بیٹھا جھک مار رہا ہوں۔ وہ خود کو کوسنے لگا۔ ٹھنڈی چائے حلق میں انڈیل کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی کے چنے ہوئے دوپٹے کی پتی دور تک فرش پر پڑی ہوئی ہے۔ نہایت آہستگی سے اٹھا کر اس نے اسے کرسی پر ڈال دیا۔ لڑکی نے مڑ کر دیکھا مگر مسکرا کر شکریہ کہنے کے بجائے کچھ گھبرا کر رہ گئی۔ لمبو نے بڑی ادا سے آنکھ ماری جیسے، دوسرا سر تنظر انداز کر کے اپنی فتح پر نازاں کمرے سے باہر چلا آیا۔ دو گھنٹے سونے کے بعد جب اٹھا تو اخبار کی طلب بے طرح ستانے لگی۔ بیٹھک کی کھڑکی سے یا ناشتہ کرتے ہی سو جانے سے طبیعت کسلمند ہو گئی تھی کھلی ہوا میں سانس لینے کو جی چاہ رہا تھا اس لئے ملازم کو بلانے کے بجائے وہ خود ہی ایک اسٹیشن پر اخبار لینے چلا۔ کوریڈور کے آخری حصے پر وہی لمبا لڑکا اس حسین لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر

تعجب ہوا کہ یہ دونوں اتنی جلد کیسے گھل مل گئے ۔ ضرور یہ لڑکی جلد بے تکلف ہو جانے والیوں میں سے ہے ۔ اس نے سوچا ۔ دوسری طرف سے نکل جانے کے بجائے وہ انہیں کی طرف سے ہو کر گذرا ۔ وہ دونوں دیوار سے لگ گئے اور خاموش ہو گئے ۔ لڑکی کے چہرے پر باوجود اس مسکراہٹ کے کچھ خفت اور گھبراہٹ سی ہو رہی تھی ۔ لڑکے کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی جو امجد کو ذرا بھلی نہ لگی ۔ اس نے باہر کا دروازہ کھولا ۔ لو کا ایک زبردست تھپیڑا اندر آیا ۔ اور وہ نیچے اتر گیا ۔ اخبار خرید کر جب گرمی سے بوکھلایا ہوا وہ لوٹا تو نیلی کھڑکیوں کے پاس سے گذرتے ہوئے لڑکی کے کوپے میں اسے دو سائے نظر آئے ۔ کھڑکی کے نزدیک خود لڑکی تھی مگر اس سے ذرا فاصلہ پر کون بیٹھا تھا ۔ یہ وہ نہ دیکھ سکا ۔ ممکن ہے کسی دوسرے کمپارٹمنٹ سے کوئی خاتون ملنے آگئی ہوں ۔ اس نے دل کو بہلا دیا ۔ اوپر چڑھا تو کوری ڈور خالی تھا ۔ اس وقت ایک عجیب جذبہ والہانہ بلکہ مجنونانہ طور پر اسکے اوپر غالب آگیا ۔ وہ یہ جاننے کو بے تاب ہو گیا تھا کہ آخر اس لڑکی کے ساتھ کون ہے ۔ اس نے اپنی چال تیز کی اور جلدی سے لڑکی کے کوپے کا دروازہ کھولا ۔ یہ سوچ کر کہ وہ اسکے ساتھی کو دیکھنے کے بعد معافی مانگ لے گا کہ اپنے کمپارٹمنٹ کے دھوکے میں وہ یہاں آگیا مگر ۔ ۔ ۔ اس کی اسکیم دھری کی دھری رہ گئی ۔ دروازہ اندر سے مقفل تھا ۔ ۔ ۔ ۔ دل میں چبھن سی لئے وہ اپنے کمرے میں چلا آیا ۔ بچپن ہی سے اسے بند کمروں سے الجھن ہوتی تھی جیسے ممی ڈیڈی کے پیار کا ، کچھ حصہ وہ اس سے چھپا کر رکھتے ہوں ۔

اخبار میں دل نہ لگا ، تو اسے پھینک ، کمرے کی خنک فضا کے بھرپور احساس کو اوڑھ کر سونے کی کوشش کی مگر اس خنکی میں وہ نہ جانے کون سی تپش تھی ۔ نامعلوم سی ہلکی ہلکی آنچ ایسی جس نے اسے سونے نہ دیا ۔ سونے کی کوشش میں وہ بستر پر کروٹیں بدلتا رہا ۔ وہ آخر کیا چاہتا تھا ؟ اس لڑکی سے گفتگو کرنا ۔ ہاں ۔ مگر کیوں ۔ کیا اسے اس سے محبت ہو گئی تھی ۔ نہیں ۔ صرف اس لئے کہ وہ اسے اچھی لگی تھی یا اس لئے کہ وہ ایک اجنبی سے جو اس کے بعد سوار ہوا تھا ۔ بلاوجہ بے تکلف ہوئے جا رہی تھی کیا اس میں اسے اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی ۔ ہاں ۔ ہاں اور کیا ۔ ۔ ۔ ایک مرتبہ اس کے ایک دوست نے شاید مذاق میں کہا تھا کہ تم بہت زیادہ حاسد ہو JEALOUS محسوس کرتے ہو کسی PSYCHIATRIST کو دکھاؤ ۔ ۔ ۔ مگر اس کے نزدیک تو یہ بات ہی ایسی تھی کہ انسان حسد کرے اگر اس وقت اس کی جگہ وہ دوست ہوتا تو وہ بھی ضرور یہی محسوس کرتا آج شام کو وہ ضرور اس لڑکی سے گفتگو کرے گا ۔ اس نے تہیہ کر لیا ۔ اسے اس سے کچھ اطمینان تو ضرور ہوا لیکن دوسرے سائے کی بات اب تک اس کے دل میں کھٹک رہی تھی کئی دفعہ دل چاہا ذرا اٹھ کر جائے اور دیکھے وہ لمبے صاحبزادے اپنی برتھ پر ہیں یا نہیں لیکن دوپہر کے وقت بغیر کسی جان پہچان اور معقول وجہ کے اجنبی لوگوں میں جانا اچھا معلوم نہ ہوا اور وہ اپنی برتھ پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا ۔ کرنل صاحب تو صبح سے ایسے بے ہوش سو رہے تھے جیسے شیر خوار بچہ ۔ اسے ان کی بے فکر زندگی پر رشک آنے لگا ۔

شام کی چائے کے لئے وہ وقت سے ذرا پہلے ہی اٹھا ۔ گو بالوں میں گرد کا شائبہ تک نہ تھا ۔ تاہم احتیاطاً اس نے نہا لینا مناسب سمجھا ۔ الماری سے اپنا بہترین سوٹ نکالا جو صبح ہی لٹکا دیا تھا ۔ مبادا سوٹ کیس میں استری خراب ہو جائے ۔ بہترین ٹائی لگائی اور دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر یوں تیار ہو بیٹھا کہ جیسے ہی لڑکی سامنے سے گذرے اس کے ساتھ ہو لے ۔ سامنے کوری ڈور کی کھڑکی کا پردہ اٹھا ہوا تھا ۔ اتفاقاً اس کی نظر شیشے پر پڑ گئی ۔ اسمیں برابر کے کمرے کا دروازہ صاف نظر آ رہا تھا ۔ اسی وقت دروازہ کھلا ۔ وہ ہوشیار ہو بیٹھا ۔ وہ دونوں ، وہی لانبا لڑکا اور خوبصورت لڑکی دروازے میں کھڑے تھے ۔ لڑکی کا لانبے لانبے سرخ ناخنوں والا ہاتھ لڑکے کے ہاتھ میں تھا وہ مسکرا رہی تھی ۔ لڑکا بھی مسکرا رہا تھا ، جیسے وہ لانبے ناخنوں والا ہاتھ امجد کے دل میں پیوست ہو گیا ۔ اسے یوں لگا جیسے ناخنوں پر اس کے دل کا خون لگا ہوا ہے وہ آگے بڑھے ۔ امجد جو گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا کھڑا رہ گیا ۔ اسے دیکھ کر لڑکے نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا ۔ اور اس کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگا جیسے

اس سے کوئی سروکار نہ ہو۔ امجد کا سارا خون سمٹ کر جیسے چہرے اور سر میں بھر گیا تھا اسے کیا معلوم تھا کہ یوں ہوگا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ پھر بیٹھ گیا گھنٹی بجا کر ملازم کو بلایا اور چائے کمرے ہی میں منگوالی۔ چائے پیتے ہوئے وہ پھر خود کو کوسنے لگا۔ کیوں نہ وہ بھی ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ مانا وہ اس لڑکے سے بے تکلف ہے پر یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ وہ اس سے بے تکلف نہیں ہو گی اُسے دیکھ کر تو وہ ہمیشہ مسکراتی ہے جیسے دعوتِ تعارف دے رہی ہو۔ وہ خود ہی کم ہمت ہے لڑکی کا اس میں کیا قصور۔ چائے نے اس کے اعصاب پر سکون کر دیئے اور ایک بار پھر وہ اسے تنہا دیکھنے کی دعا کرنے لگا۔

اس کی دعا قبول ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس نے دیکھا وہ کوری ڈور میں کھڑی ایک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہے۔ کبھی کبھی اکتا کر وہ دائیں بائیں دیکھتی جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو اور پھر باہر دیکھنے لگتی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ لڑکی پشاور سے کراچی تک کا سفر تنہا کر رہی ہے جس خاتون کو وہ اس کے ساتھ سمجھا تھا وہ تو لاہور ہی میں اتر گئی تھی ساتھی مردوں سے بے تکلفانہ باتیں بھی کر رہی ہے۔ تنہا اِدھر اُدھر گھوم بھی رہی جیسے اسے کسی خطرے کا احساس نہیں یا جیسے اُسے کسی خطرے کا انتظار ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف جا رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ لڑکی کو اس کی آمد کا پتہ چل جائے تاکہ وہ دور سے اس کا ردِعمل دیکھ سکے، اس کے چہرے پر وہم، خوشی آمدید قسم کی مسکراہٹ کھل اٹھے لیکن بُرا ہو اس دبیز رنگ کا کہ اس کے نئے جوتوں کا سارا دبدبہ خود میں جذب کر لیا۔ وہ نزدیک پہنچ گیا لڑکی کو خبر نہ ہوئی۔ وہ باہر جھانکتی رہی پھر وہ اس کے بالکل پیچھے کھڑا ہو گیا اُسے پتہ نہ چلا اس کی قربت۔ اس کے لباس کی مہک کمرے کی خنکی کے ساتھ پھوار بن کر اس کے دماغ میں گرنے لگی۔ جو اس پر دھند کی طرح چھانے لگی ایک ساری رات کا کرب، ایک سارے دن کی تڑپ کا حاصل وہ لمحہ جب جھک کر اس نے لڑکی کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر . . . . پھر نہ جانے کیسے وہ اس کی ٹانگوں کے گرد ہاتھوں کا حلقہ ڈال کر سسکیاں لینے لگا۔ لڑکی نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا۔ اپنا جسم جھٹک کر بے دردی سے اس کی گرفت سے آزاد کیا۔ اور تیز تیز چلتی اپنے کمرے میں غائب ہو گئی اس کے چہرے پر ایسی وحشت تھی جیسے کسی پاگل کے چنگل سے بچ کر نکلی ہو۔ . . . . یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ وہ لڑکھڑا گیا۔ . . . اور پھر غم و غصہ، جھلاہٹ، ندامت اور نہ جانے کیسی کیسی آگ کے شعلے اس کے دل میں بھڑکنے لگے۔ لمحہ بھر میں اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ جیسے یکلخت اس کی شخصیت کا ڈھیر ہو گیا ہو۔ وہ واپس اپنے کمرے میں آ گیا ٹائی نوچ کر وہ پھینکی غسلخانے میں جا کر ٹھنڈے پانی کے نیچے آدھ گھنٹے تک بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ سنا تھا آگ پانی سے بجھ جاتی ہے۔

دل تھوڑا سا ہلکا ہوا تو رات کے کپڑے پہن کر وہ بستر پر دراز ہو گیا۔ چلتے وقت اس کے ایک دوست نے کہا تھا یار تیرہ تاریخ کو سفر نہ کرو تیرہ کا ہندسہ منحوس ہوتا ہے۔ اچھا ہی ہوتا اگر وہ اس دوست کی بات مان لیتا۔ اس روز نہ چلتا تو اس سرد جہنم میں کاہے کو جلتا۔ وہ پڑا پڑا سوچتا رہا۔ کرنل کے بہت اصرار کے باوجود اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا ان کے ساتھ برج نہیں کھیلی بس منہ اوندھائے پڑا رہا۔ . . . وہ کہنے لگے "آپ کی عمر کے اتنے خاموش طبع اور شریف لوگ کم نظر سے گذرے ہیں۔" اس نے کچھ نہ کہا اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ٹپ ٹپ آنسو اس کے تکیئے پر گرنے لگے وہ روتا رہا، روتا رہا۔ اور پھر یکایک اُسے اپنے اُوپر سخت غصہ آنے لگا یعنی کہ اب وہ اتنا بھی مرد نہیں ہے کہ ایک فضول سی آوارہ لڑکی کی بے رُخی کا دکھ جھیل جائے جبکہ بچپن سے اب تک اس نے ہزاروں ہی غم جھیلے ہیں اصل ماں کو کھو کر اس نے سوتیلی ماں کی بے رُخی کے سوا اور کچھ نہ دیکھا باپ اس سے شروع سے بے نیاز تھے۔ پھر بھی ان کا سہارا تو تھا۔ وہ مرے تو لاکھوں کی جائداد کے باوجود کوئی دو میٹھے بول کہنے والا بھی نہ تھا۔ لیکن اس دکھ کو بھی وہ سہار ہی گیا تھا۔ یوں ٹوٹ کر تو وہ اس دن رویا تھا جب ابا مرے تھے۔ ماں کا اسے چھوڑ کر جانا تو کچھ خواب سا ہی یاد تھا پھر وہ سارے غم بھول کر اپنی حُسن پرست طبیعت اور بزدلی پر جھلانے لگا۔ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر جانے اسے کیا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ جیسے اس کے اندر کوئی اور شخصیت گھس کر جو چاہتی ہے کرتی ہے بعد میں وہ صرف اس کے لئے ماتم کرنے کو رہ جاتا ہے جلاتا

رہتا ہے جیسے وہ واقعی کسی دوسرے کے کئے کا خمیازہ بھگت رہا ہو . . . . . ساڑھے دس بجے مو ٹر ی آیا تب بھی وہ جاگ رہا تھا، صبح سوا تین بجے حیدرآباد آیا تب بھی وہ نہ سو یا تھا۔ کراچی آنے سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھ بیٹھا۔ وہی ملگجا سوٹ پہنا۔ سیٹ میں دھنسی ہوئی ٹائی کھینچ کر لگائی۔ شب بیداری سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے دو چار چھینٹے منہ پر مارے اور بالوں پر یونہی سا ہاتھ پھیر لیا۔ کراچی کینٹ سے پہلے وہ دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اس نے ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کہاں اُترے۔ کینٹ پر یا سٹی پر۔ تھوڑی دیر میں وہ لمبا لڑکا بھی وہاں آ گیا۔ اسے دیکھ کر امجد سٹپٹایا مگر اس نے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر خیریت پوچھی۔ اس کے پیچھے ہی وہ لڑکی داخل ہوئی۔ لڑکا امجد سے کہنے لگا "ہمارے آپ کے درمیان کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو تو اسے ساتھ ہونے سے پہلے دور کر دینا چاہئے۔"

"کیسی غلط فہمی" بمشکل امجد کی زبان سے نکلا۔

"ان سے ملئے، یہ میری بیوی ہیں" لمبے لڑکے نے اس خوبصورت لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا جو اس وقت سفید ساڑی میں ملبوس تھی اور بڑا سا جوڑا باندھے تھی۔

امجد نے چونک کر اسے دیکھا . . . . لڑکی کے چہرے پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تھی

"یہ پشاور میں تھیں۔ میں پنڈی گیا تھا۔ اس لئے ہمارا ریزرویشن ساتھ نہ ہو سکا۔ میں نے دیکھا تھا کہ آپ کو ہماری یکجائی کچھ پسند نہیں اسلئے میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ آپ کو ناراض نہ کروں۔ کھانے پر بھی میں نے بیوی کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے آپ کے پاس بیٹھنے کو ترجیح دی پھر بھی آپ کچھ خوش نظر نہیں آ رہے ہیں" لڑکے کا لہجہ خوشگوار تھا۔ مگر اس کا طنز زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح امجد کے دل میں پیوست ہو گیا۔ وہ سُن کھڑا تھا۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا لڑکی خاموشی سے دروازے کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی اور اسوقت انتہائی مایوسی اور ندامت کے ساتھ ہی جو والہانہ جذبہ امجد کے دل میں بیدار ہوا وہ یہ تھا کہ وہ لڑکی کی ٹانگوں سے لپٹ کر بے اختیار رو دے۔ اس جذبے کی شدت سے وہ گھبرا گیا اور لڑکھڑاتا ہوا تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا مبادا وہ ایک اور مرتبہ تماشہ بن جائے۔ ایک قہقہہ زہر میں بجھا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آیا اور دروازہ بند کر لینے کے بعد بھی گنبد کی آواز کی طرح دیر تک اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔

"ہلو۔ کیسی طبیعت ہے۔ کچھ بیمار سے نظر آ رہے ہو" کرنل نے کہا۔

"ہاں . . . . " وہ سر پکڑ کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کراچی کینٹ پر گاڑی رکی۔ وہ اس طرح بیٹھا رہا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ ایک دھند سی اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ یک لخت دھند چھٹی اور ذہن کے پردے پر ایک تصویر ابھری۔ ایک غیر معمولی خوبصورت عورت چپ چپ سی کھڑی تھیں اس کے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس دوسرے میں سفری بیگ تھا۔ شانے پر گرم کوٹ تھا۔ وہ کہیں جا رہی تھی . . . . . بہت دور . . . . دفعتاً ایک چھوٹا موٹا سا خوبصورت لڑکا آیا اور اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ نہ جاؤ ممی۔ نہ جاؤ۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی وہ لڑکا گر گیا . . . اور پھر وہ چلی گئی ہمیشہ کے لئے۔ اس کے بعد اس لڑکے نے پھر کبھی نہ اُسے دیکھا . . . . . گاڑی جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ اُس کی تصویر منتشر ہو گئی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ سامنے آئینے میں اُس نے اپنی شکل دیکھی۔ وہی خوبصورت، گول مٹول سا موٹا سا سوجی سوجی آنکھوں والا لڑکا کھڑا تھا۔ اب وہ بہت بڑا ہو گیا تھا لیکن اتنے عرصے بعد بھی وہ زخم ہرا تھا۔ ابھی تک اسے ماؤں سے اپنے بچوں کو چھوڑ کر چلی جانے والی لڑکیاں ہی ملی تھیں۔ کسی نے اشارے کیوں کیا تھا "میں نہیں جاؤں گی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی" . . .

اس نے اپنا سر جھٹکا اور کوری ڈور میں نکل آیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اس کے دل سے شرم و ندامت میں ڈوبے ہوئے خون کے قطرے ٹپک کر تئیس سالہ تنہائی کی بھٹی میں جل رہے تھے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ایر کنڈیشنڈ کوچ کی ٹھنڈی زرد دیواریں نہیں آگ کے شعلے ہیں اس لڑکی کے کوپے کے آگے سے گزرتے ہوئے نامعلوم طور پر دو آنسو اس کی آنکھوں سے دبیز رگ میں جذب ہو گئے اور وہ دروازے کھولتا بند کرتا کراچی کے بھرے پُرے اسٹیشن پر اُتر گیا جہاں اس کا کوئی بھی نہیں تھا۔

یونس جاوید

نروان

ماں جی یوں تو کام میں جُتی نظر آتی تھیں۔ مگر قدم قدم پر آہ بھرتے ہوئے جیسے سب کچھ مجبوراً کر رہی ہوں۔ شاید ہی کوئی کام ہوگا جو انہوں نے مکمل اور مناسب طریقے پر سر انجام دیا ہو۔ نگاہ جھکی ہوئی۔ ذہن سوچ میں گم۔ چال لڑکھڑائی ہوئی۔ لیکن کون سا کام ہوگا جس میں انہوں نے ذاتی طور پر دلچسپی نہ لی ہو۔ دیواروں کا جالا اتارنے سے لے کر زینت کی قمیص سینے تک انہوں نے جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کام کرنے کی مجبوری کا جو احساس ان میں [illegible] تھیں۔ اب اس میں انہیں راحت ملنے لگی ہے۔

زینت جب ممانی کے گھر سے لوٹی تو اس نے ماں جی کو مشین چلاتے دیکھا۔ قریب آئی تو ماں جی نے سلی ہوئی قمیص اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا "جلدی سے پہن کر مجھے دکھا۔"

قمیص پہن کر جب وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تو بوکھلا سی گئی۔ قمیص کا ایک پٹ اُٹھا ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ ماں جی کے سامنے آ گئی۔ ماں جی پہلی ہی نظر میں سارا معاملہ بھانپ گئیں۔ سوئی سے دھاگہ چھڑاتے ہوئے انہوں نے کہا "اب میری عمر کام کرنے کی تو ہے نہیں۔ مجھ نگوڑی کو تو تم لوگ قبر تک نہ چھوڑو گے۔ سانس لیتی ہوں تو کلیجہ جلتا ہے۔ تمہیں کیا —— ؟"

"پر میں نے آپ کو کب کہا تھا قمیص سینے کے لئے" زینت نے یوں کہا جیسے وہ ماں جی کی بات کاٹ رہی ہو، گو ماں جی بات پوری کر چکی تھیں۔ اس لئے اس نے بات کو آگے بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتی تھی کہ ماں جی کا اصل دکھ کیا ہے۔

پچھلی عید سے آٹھ روز قبل ان کا رشید کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ شاید رشید کو اتنے زخم نہ آئے ہوں گے جس قدر دکھ کے ماں جی نے اپنے دل پر محسوس کئے۔ وہ دنیا بھر کی کار کمپنیوں کو کنگال ہونے کی بددعا دے دے کر بیسیوں بار بے ہوش ہو چکی تھیں۔ دماغ ٹھکانے تھا نہ آنکھیں۔ برتن لے کر بیٹھتیں تو گھنٹوں مانجھتی چلی جاتیں۔ رشید کے کپڑے لے کر دھونے لگتیں تو ایک ہی کپڑے کو بار بار صابن لگاتیں۔ اور دھوتے جاتیں۔ پھر اسے استری کرتیں۔ صندوق میں رکھتیں۔ دوسری صبح نکال کر اس کے ٹوٹے ہوئے بٹن ٹانکتیں اور کھونٹی پر لٹکا کر جیسے فارغ ہو جاتیں۔ پھر جب کھونٹی سے لٹکے لٹکے اس پر گرد کی ایک تہ سی جم جاتی تو پھر اسے دھونے بیٹھ جاتیں —— رونا دھونا تو گویا ان کا معمول ہو گیا تھا۔

بیٹے کا دکھ کسے نہیں ہوتا —— وکیل صاحب کو بھی تھا۔ مگر ماں بیٹے کا رشتہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ خاص طور پر اس بیٹے کا، جو جوان ہو چکا ہو۔ گھر میں رشید سے چھوٹے دو اور لڑکے تھے۔ مگر یوں لگتا تھا جیسے رشید کی موت نے ماں بیٹے کے رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیا ہو۔ نام لیتیں تو رشید کا۔ یاد کرتیں تو اسے۔ اور بعض دفعہ جب ان کی حرکات میں شدت پیدا ہو جاتی تو ان پر وحشی ہونے کا گمان ہونے لگتا۔

جب بھی انہوں نے رشید کی کوئی بھولی بسری بات یاد کی۔ دوسرے جملے میں سلمیٰ کا نام ضرور آیا۔

سلمیٰ کا ذکر کر کے وہ کچھ جذباتی سی ہو جاتیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اور ہمیشہ کی طرح ان کی بات ادھوری رہ جاتی۔ بات ادھوری چھوڑ کر وہ پھر وحشیوں کی طرح خلاؤں میں گھورنے لگتیں۔ کس چاؤ سے انہوں نے سلمیٰ کو بہو بنانے کی آرزو کی تھی۔ اس انتخاب کو کامیاب بنانے میں کتنی راتوں کی دعائیں شامل تھیں۔ یہ سب کچھ وہی جانتی تھیں۔

سلمیٰ تھی بھی جج صاحب کی لڑکی۔ نسبت طے ہو جانے کے کچھ دن بعد انہوں نے مکان کی مرمت کروانے کے علاوہ ایک خوبصورت سا کمرہ بھی تعمیر کروایا تھا۔ یوں تو بہو گھر میں آنی ہی تھی۔ مگر ناز و نعم میں پلی ہوئی سلمیٰ کے لئے پورے راستے ہموار کئے جا رہے تھے۔

پھر اچانک انہوں نے زبردست حادثے کی خبر سنی تو انہیں قطعاً یقین نہ آیا۔ لیکن جب مسلسل کئی روز تک رشید گھر نہ آیا۔ تو رشید کی موت سے متعلق، ان کے دل سے سارے وسوسے مٹ گئے۔ وکیل صاحب مصلحتاً لاش گھر نہ لائے تھے۔

بیٹے کی موت کا یقین آیا تو غموں اور جھریوں کی ایک تہہ ان کے چہرے پر جم گئی۔ اور الٹے سیدھے کاموں میں مصروف رہنے لگیں۔ اور تو اور وہ زینت تک کو فراموش کر چکی تھیں۔ وکیل صاحب نے کبھی ایک آدھ بار زینت کے ہاتھ پیلے کر دینے کے متعلق کچھ کہا بھی تو وہ کوئی مکمل اور معقول جواب نہ پا سکے۔ اس بات سے وکیل صاحب کے مندمل زخموں پر خراش سی آ جاتی۔ بیٹی پرایا دھن ہے۔ اور اس دھن کو اچھے بیوپاری کے پاس پہنچانے کا سب سے اچھا ذریعہ یا سب سے اچھا اور واحد ذریعہ۔ آس پاس، اونچ نیچ اور چھوٹے بڑے کی چھان پھٹک تو مائیں ہی کر سکتی ہیں۔ باپ ان راہوں میں عموماً ناکام رہتے ہیں۔ کمرے کی بتی بجھا کر انہوں نے اکثر اوقات زینت کے متعلق سوچا۔ مگر بیگم کے بغیر یہ مسئلہ طے ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

ایک روز صبح ــــ غالباً اتوار کی صبح تھی۔ انہوں نے ماں جی کو کمرے میں بلایا۔ پہلے کچھ دیر وہ ان کی بیماریوں ہی کی تفصیل سنتے رہے۔ ماں جی کے مزاج کو ہموار کرنے کے لئے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر ان کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ــ "زینت کی عمر کیا ہو گی بھلا ــــ"؟

ماں جی نے اس جملے کی کڑواہٹ کو محسوس تو کر لیا۔ مگر وہ کچھ بولیں نہیں۔ وکیل صاحب نے بات میں گرمی پیدا کرنے کے لئے موقع غنیمت جان کر کہا "سلمیٰ کی منگنی کرنل بشیر کے ہاں طے کر رہے ہیں جج صاحب" یہ جملہ پہلے جملے سے کچھ زیادہ ہی تلخ تھا۔ ماں جی نے آنکھیں سمیٹ لیں۔ "سلمیٰ بیٹی ــــ؟ میری بہو ــــ" ان کے لب ہلے۔ وکیل صاحب دیر تک اس بات کے منتظر رہے کہ وہ کچھ اور بھی کہیں گی مگر وہ مزید کچھ بولے اٹھ کر اندر چلی گئیں۔

وکیل صاحب کا خیال تھا کہ سلمیٰ کی منگنی، اور زینت کی جوانی کا احساس ماں جی میں تغیر پیدا کرے گا۔ مگر جس قسم کے تغیر کی انہیں توقع تھی۔ ماں جی نے اس کے بالکل الٹ مظاہرہ کیا۔ کاموں سے انہوں نے اسی روز سے کنارا کر لیا۔ بات چیت بالکل بند۔ خلاؤں میں دیوانوں کی طرح گھورنا۔ کھانے کا خیال نہ ناشتے کی پروا ــــ

آندھی آنے سے پہلے عموماً ہوا بند ہو جاتی ہے کہ درختوں کے پتے یوں ساکت دکھائی دیتے ہیں جیسے پتھر سے تراشے گئے ہوں۔ ماں جی کا سنگین رویہ بھی اس بات کا غماز تھا کہ کوئی طوفان ان کے دل میں چھپا بیٹھا ہے۔ کوئی ایسا طوفان جسے انہوں نے اپنے بے ترتیب کاموں میں مصروف رہ کر ٹال رکھا تھا۔ کسی شدید خواہش کی شکست انسان کے لئے مفید بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس شکست کا احساس اس کی ناکامی کا عملی اعتراف ہے۔ بلاشبہ یہ اعتراف اس کے لئے نقصان دہ ہے۔ ماں جی کو سلمیٰ کی منگنی کی خبر سنا کر وکیل صاحب نے اس شکست کا احساس دلایا تھا۔ جسے وہ خود بھی زندگی کی سب سے بڑی شکست سمجھتی تھیں۔ اور جس احساس کو دبانے کی خاطر انہوں نے ذہنی توازن تک

کھو دیا تھا۔

باورچی خانے سے ملحق کمرے میں چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ کر انہوں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کوشش کی۔ مگر بے سود۔ حالات کے واقعات ایک ایک کر کے علیحدہ علیحدہ بالکل صاف متحرک تصویروں کی طرح ان کے سامنے ناچتے اور وہ کرب سے کراہ اٹھتیں۔

رات کو جب زینت انہیں کھانا دینے اسی کمرے میں گئی۔ تو دروازہ اندر سے بند تھا۔ کھٹکے کی طرح ذہن پر دکھ کر اس نے دروازے کی دراڑوں سے کان لگا دیئے۔ وہ کافی دیر اسی حالت میں کھڑی رہی۔ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے دروازے پر دستک دی کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو ماں جی رو رہی تھیں۔

انسانی دکھ زائل کرنے میں جو کام آنسو کرتے ہیں شاید سب سے قریبی دوست بھی نہیں کر سکتے۔ ماں جی نے زینت کو دیکھ کر آنسو پونچھے اور مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر زینت کو گھور کر دیکھا — اور بولیں، آ، پھر کر لیں — سنتے ہیں بے چاری کی شادی ہو رہی ہے —"

یہ دکھ بھی عجیب تھا۔ اسی دکھ کے سہارے وہ تین چار دنوں میں ان کی حالت بہتر ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ شکست کو دیکھ چکی ہیں۔ مگر تسلیم نہیں کرنا چاہتیں۔ بس ایک خیال نے ان میں جلا کی چستی اور قوتِ ارادی پیدا کر دی۔ یہی قوتِ ارادی انہیں کرنل بشیر کے گھر تک لے گئی۔ وہاں جا کر بھی انہوں نے خلاؤں میں گھورنا نہ بے مقصد باتیں کیں۔ بڑی متانت اور سلیقے سے جا کر بیٹھیں۔ سب نے مزاج پوچھا۔ ہر ایک کو انہوں نے ہنس کر مناسب جواب دیا۔

بیگم بشیر نے پر تکلف چائے کا اہتمام کیا تھا۔

چائے کے دوران اس نے مٹھائی کی پلیٹ ماں جی کی طرف سرکاتے ہوئے کہا — "جمیل کے سسرال کی طرف سے جو مٹھائی آئی تھی نا —"

"ہاں ہاں — ماں جی نے بات کاٹ کر انجان بننے کی کوشش کی — کہاں ٹھہرائی نسبت — ؟" وہ موضوع سے ہٹ گئیں۔

"امان اللہ خاں جج کی لڑکی سے — بھلا آپ سے زیادہ کون جانتا ہوگا انہیں —"

"ہاں — !" ہاں کو انہوں نے اس قدر لمبا کیا کہ مٹھائی کا ایک ریزہ ان کے منہ سے اڑ کر پلیٹ میں آ گرا۔ لقمہ نگل کر انہوں نے بڑے اعتماد سے کہا — "مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے اسے — !"

بیگم بشیر لہجے کے طنز کو محسوس نہ کر سکی۔ "منگنی پرسوں ہوئی ہے" وہ بولی — "آج مٹھائی کی تقسیم ہوگی محلے میں!"

"اوں ہوں" ماں جی نے اب کے ذرا تیز آواز نکالی۔

لقمہ بیگم بشیر کے حلق میں اٹک سا گیا وہ جلدی سے کھنکھار کر بولیں "کیا خیال ہے تمہارا —"

یہی وہ موڑ ہے جہاں شکست شکست نہیں رہتی۔ ماں جی کو کھل کر کہنے کے اس موقع کا انتظار کب سے ہوگا۔ پھر بھی وہ بڑے محتاط طریقے سے بولیں — "لڑکی خوبصورت ہے — اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے رشید کے لئے میں نے جس کاوش سے یہ رشتہ حاصل کیا تھا۔ کچھ میں ہی جانتی ہوں — لاکھوں میں ایک گھرانہ ہے — کھاتے پیتے لوگ ہیں مگر......" ماں جی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی — !

"مگر کیا — ؟" بیگم بشیر اس بھاری بھرکم خبر کو یوں کھلے صحن میں کیونکر سنتیں — ماں جی کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔ کمرے کا

دروازہ بھیڑتے ہوئے تو دل دھک دھک کر رہا تھا۔ صوفے پر قریب قریب بیٹھ کر انہوں نے ماں جی سے بڑے ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "آپ تو ہمارے خاندان کو اچھی طرح جانتی ہیں۔ میں تو پہلے ہی آپ کی طرف آنے والی تھی —— منگنی آخر کس لئے جاتی ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے پرکھنے کے لئے ——"

"ہاں ہاں —— ماں جی تیر نشانے پر لگتا دیکھ کر بولیں۔ کیوں نہیں —— مگر غیبت کرنا میرے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ اللہ میرے بچے کو بخشے مرتے مرتے باپ کے کان میں یہ بات کہہ گیا تھا غم سے نڈھال میں تو لاش بھی نہ دیکھ سکی۔ ورنہ جانے اس بے چارے کے دل میں کیا کیا تھا۔ اولاد کی رازدار تو ماں ہوتی ہے نا —— باپ سے بے چارہ کیا کچھ کہتا۔ البتہ اس بات کی تاکید اس نے مرتے مرتے بھی کر دی تھی۔ کہ یہ بات کھلے نہیں ——" ماں جی نے سسکی بھر کر آنچل کو آنکھوں پہ رکھ لیا —— "اے ہے یہ کہاں کی غیبت ہوئی بھلا —— بیگم بشیر نے بڑے تحمل سے ساری بات سن کر کہا —— "اور پھر میں بھی تو ڈری ہوں —— جو گھر گھر کہتی پھروں گی۔"

ماں جی نے آہستہ آہستہ چہرہ صاف کیا —— "ہائے اللہ میں سب کچھ کیسے کہہ دوں —— انہوں نے آہ بھری —— "بہو تو میری ہی تھی نا"

"مگر بات کیا تھی آخر —— بیگم بشیر تجسس کی آگ میں جل رہی تھیں۔ ماں جی نے کچھ دیر توقف کیا تو بیگم بشیر کروٹ بدل بدل کر ہولتی رہی۔

"بس اب کہہ بھی چکو دکھیں ——" وہ پھٹ کر بولیں۔

"لڑکی بدکردار ہے —— گلی گلی بدنام ——" بیگم بشیر پہلے تجسس کی آگ میں جل رہی تھیں تجسس ختم ہوا۔ مگر آگ وہیں کی وہیں تھی۔

"آگ اپنی خاصیت بدل سکتی ہے بھلا —— ماں جی پھر بولیں —— برائی آخر برائی ہے۔ لاکھ پردوں میں چھپاؤ —— نہ چھپے گی۔ پہلے یہ خبر سینہ بہ سینہ پھیلی۔ پھر اڑنے لگی۔ میری کوشش یہی رہی ہے۔ کہ کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو۔ لڑکی خراب ہے تو ماں باپ کا کیا قصور۔ بے چارے خواہ مخواہ بدنام ہوں گے —— تم بھی اسے اپنے تک رکھنا۔ ماں جی کچھ دیر خاموش بیٹھی اس بات کی منتظر رہیں کہ بیگم بشیر شکریہ ادا کریں گی۔ مگر وہ پتھر کے بت کی طرح ساکت بیٹھی رہیں۔

"قسم ہے تمہیں جو بات آگے بڑھاؤ تو —— ماں جی نے اٹھتے اٹھتے کہا۔ لوگ نام رکھیں گے تو مجھے غیرت آئے گی ——" ماں جی برقع اوڑھ کر یوں کمرے سے نکلیں۔ جیسے بیٹے کی واپسی کی خبر پا کر نکل رہی ہوں۔

دوسرے دن شام کو وکیل صاحب نے خود بڑی حیرت سے انہیں یہ خبر سنائی۔ کہ کرنل بشیر کے لڑکے جمیل کی منگنی سلیٰ سے ہو کر ٹوٹ گئی ہے۔ ماں جی بظاہر بڑی حیران ہوئیں —— گو گھنٹے بھر میں ان کے چہرے پہ نکھار اور شگفتگی سی آ گئی۔ وکیل صاحب مسکرا اٹھے بھی اور حیران بھی ہوئے۔ اسی شام انہوں نے اچھے کپڑے پہنے سرمہ اور خوشبو لگائی۔ اور نماز بھی پڑھی۔ زینت ماں جی کی طبیعت معمول پہ آ جانے کی وجہ سے بے حد خوش تھی۔ اسی خوشی میں اس نے گھر کے سارے کام خود سنبھال لئے تھے۔

ماں جی دن بھر پوتے کی بیویوں کے پاس بیٹھی رہتیں۔ شام کو اپنے کمرے میں آ کر نماز پڑھتیں۔ دلہن زینت انہیں شام کا کھانا دے جاتی۔ کھانا کھانے کے دوران ماں جی زیادہ تر گھریلو قسم کی باتیں کرتیں۔ کچھ ہدایات دیتیں۔ اور پھر اسی کمرے میں سو رہتیں۔

ایک روز جب زینت ان کے لئے چائے لے کر برآمدے میں آئی تو ماں جی خلاف معمول بڑے کمرے میں ٹرنک کھولے بیٹھی تھیں۔ زینت جب وہاں پہنچی تو ماں جی نے چائے کی پیالی لے کر زمین پر ہی رکھ دی۔ اور زینت کو چارپائی پہ بٹھا لیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ منہ چوما۔ اور ٹرنک کا ڈھکنا بند کرتے ہوئے کہنے لگیں —— "تو میری زیادہ ہی خدمت کرنے لگی ہے —— سوچتی ہوں جب تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ کون

میرے پیچھے یوں چاٹے سے کر پڑے گا —"

زینت یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے سامنے اس کی ماں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ شرما سی گئی۔ سر پہ آنچل درست کرتے ہوئے اس نے ماں جی سے قطعاً آنکھ نہ ملائی صرف "ہو" بھر کر رہ گئی۔ اس آہ میں غم، خوشی، جدائی اور وصال ساری کیفیات یکجا ہو گئی تھیں۔

"رشید زندہ رہتا تو پہلے اس گھر کی بہو بن کر آتی —" ماں جی پھر بولیں —

پھر مجھے کس بات کی فکر تھی۔ تمہارے بعد بہو اور بیٹی دونوں کی کمی اسی ایک کی ذات سے پوری ہو جاتی۔ مگر تقدیر کا لکھا کون مٹا سکتا ہے" ماں جی اُٹھ کر چارپائی پہ آ بیٹھیں — "رشید کے بعد تو مجھے اس سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہو گیا ہے۔ بعض اوقات جی چاہتا ہے کہ کسی بہانے اُڑ کر جاؤں اور اسے لے کر گلے لگا لوں۔ احمد جوان ہوتا تو کبھی یہ رشتہ ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس رشتے کے لئے جج صاحب کے گھر جا جا کر تین جوتے تو ٹوٹے ہوں گے میں نے۔ اب ہر کوئی بس یہ تاک لگائے بیٹھا ہے۔ ذات کا پتہ نہ خاندان کی خبر۔ اور وہ لوگ ہیں کہ لڑکی کو بوجھ سمجھ کر کندھوں سے اُتار دینا چاہتے ہیں —" ماں جی کچھ دیر تک پھر دیوانوں کی طرح چھت کو گھورنے لگیں —" ہائے — انہوں نے لمبی سی آہ بھری۔

"اسے کوئی اور بیاہ لے گیا تو میں کیا کروں گی —"

زینت نے ماں جی کی بات پر توجہ تو دی مگر جواب نہیں۔

"اونچا لمبا قد ہے اس کا۔ وہ دھیرے دھیرے بولیں —" تجھ سے بالشت بھر اونچی ہو گی — جب میں پہلی بار اسے دیکھنے گئی تھی تو کلیجہ تھام کر رہ گئی تھی .... ہم پہ بھی جوانی آئی تھی — مگر یہ تو کچھ اور ہی شئے تھی — دودھ اور سیندور کا بنا ہوا جسم جانے کس سانچے میں ڈھالا گیا تھا کہ بال بال اپنی جگہ مناسب دکھائی دیتا تھا۔ نظر بھر کر دیکھنے سے میلی ہوتی تھی۔ کانسی کے تھال سا چہرہ، دو طاق میں رکھے ہوئے دو چراغوں کی طرح بھیگی بھیگی اور روشن آنکھیں۔ چلتی تو جسم لچک لچک جاتا۔ رکتی تو جیسے گھٹا چھا گئی ہو۔

جاتے ہوئے اس نے مجھ سے صرف ایک بار آنکھیں ملائیں۔ اور پھر جھکا لیں۔ ہائے سورت ہوتے ہی لرز گئی تھی۔ جب اس نے نظریں جھکائیں تو مجھے یوں لگا جیسے دیوار پہ سے دھوپ اتر رہی ہو۔ — سن رہی ہے نا تو میری بات —" ماں جی سسک پڑیں۔ "جانے کون ہوا سے جائے گا اسے بیاہ کر —"

"آپ چائے تو پیئیں نا ماں جی —" زینت نے موضوع بدلنا چاہا۔ مگر ماں جی کو چائے کی پروا کب تھی — "تو جا —" وہ کچھ سوچتے ہوئے بیزاری سے بولیں — "میں اپنے آپ پی لوں گی —"

مشکل سے ایک مہینہ بیتا ہو گا۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی — ہوا بوجھل اور ٹھنڈی تھی۔ ماں جی جس کمرے میں بیٹھی تھیں۔ اس میں ایک پرانا سا قالین بچھا تھا۔ اور سامنے کارنس پہ کاغذ کے پھول شیشے کے گلدانوں میں سجے تھے۔

زینت باورچی خانے میں چائے تیار کر رہی تھی۔

وکیل صاحب آئے تو ان کے کپڑے بھیگ رہے تھے۔ انہوں نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ہاتھ منہ دھویا۔ اور باورچی خانے چلے گئے۔ "چائے اور ماں جی کو ڈرائنگ روم میں بھجوا دو" انہوں نے کہا اور ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

بلاوے کی اہمیت ماں جی کے نزدیک دوگنا بڑھ جاتی تھی۔ کوئی خاص بات ہوتی تبھی وکیل صاحب ماں جی کو بلا بھیجتے تھے۔ وہ دوڑ کر آئیں۔ اور سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

جب زینت چلی گئی تو وکیل صاحب نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ "سلمےٰ کی منگنی ——"

"کیا پھر طے ہو گئی ——"؟ ماں جی نے بات اچک لی۔

ہاں —— وکیل صاحب اطمینان سے بولے "مگر تم کیوں اس قدر پریشان دکھائی دیتی ہو" ماں جی نے مصنوعی سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا "نہیں تو —— ایسی تو کوئی بات نہیں —— انہوں نے بوکھلا کر گرم چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا تو کھانس کر رہ گئیں۔ پھر خفت مٹانے کے کہنے لگیں —— ایک نہ ایک دن تو اس کی شادی ہونا ہی ہے۔ کس جگہ ہوئی اب کے منگنی ——؟" یہ سوال انہوں نے ایک پل توقف کے بعد کیا۔ "اس بار پروفیسر الطاف کے ہاں ہو رہی ہے۔ راستے میں ملے تھے۔ مدعو کر رہے ہیں"۔

"اچھا —— ماں جی نے ہولے سے کہا "مبارک دے آؤں گی میں بھی" وکیل صاحب خاموش چائے پیتے رہے۔ وہ اس بات پر حیران ضرور رہتے۔ یہ خبر سناتے ہوئے خود انہیں کرب محسوس ہو رہا تھا۔ اور ماں جی جو غیروں کی شادی کی خبر سن کر کر اٹھتی تھیں۔ سلمےٰ کی منگنی کی خبر پا کر چمک رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر غم و رنج کی کوئی لکیر نہیں تھی۔ بالکل سپاٹ سا چہرہ۔ آواز میں پھیکا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے ان کے اندر دو متضاد قوتیں ایک ساتھ ایک وقت میں ابھر اور مٹ رہی ہوں۔ پھر وہ اپنی اندرونی کیفیات میں اعتدال پیدا کرتے ہوئے بولیں —— "یہ پروفیسر الطاف وہی ہیں نا جو جج صاحب کے پڑوس میں نئے نئے آئے ہیں"؟

ہاں —— وکیل صاحب نے کہا۔ "ویسے جان پہچان پرانی ہے۔ انہوں نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کر سگرٹ سلگایا۔ اور بات آگے بڑھائی۔ میرا تو خیال ہے۔ کہ جج صاحب نے اصرار کر کے انہیں اپنے پڑوس میں بلوایا ہے —— ایک روز باتوں باتوں میں ذکر کر رہے تھے۔ رشید انہیں بھی ابھی تک نہیں بھولا۔ کہتے تھے۔ "جب تک سلمےٰ کنواری بیٹھی ہے۔ رشید کی یاد شدت سے آتی رہے گی اور پھر کیا معلوم بیٹی بیاہی جانے کے بعد بھی دکھی رہے۔ بیٹیوں کے اوپر سکھ کے دن تو اڑتے بادل کا سایہ ہوتے ہیں ——" وکیل صاحب کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے "جوانی کی موت بھی عجیب شے ہے" ان کی نگاہیں سامنے لگی ہوئی رشید کی تصویر پر تھیں۔

ماں جی کے چہرے پر اچھا یا برا کوئی تاثر نہ ملتا تھا۔ بس اتنا فرق پڑا کہ دونوں بالکل خاموش اونگھنے کے انداز میں بیٹھے رہے۔ اور پھر ماں جی بغیر کچھ بولے اٹھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

شام کے بعد زینت نے انہیں اچھے کپڑوں میں برقع اوڑھ کر باہر جاتے دیکھا اور واپس آتے بھی۔ رات کے دس بجے ہوں گے۔ جب وہ ہانپتی ہوئی لوٹی تھیں۔ لیکن چہرے پر بشاشت کے آثار تھے۔ انہوں نے برقع اتار کر کپڑے بدلے اور بغیر کھائے پئے چارپائی پر لیٹ گئیں۔ زینت نے کھانے کے لئے کہا تو بولیں "پروفیسر الطاف کے ہاں مبارک دینے گئی تھی۔ کھانا کھائے بغیر ان لوگوں نے اٹھنے تک نہ دیا" اور پھر کروٹ بدل کر یوں سو گئیں۔ جیسے سارے دکھوں کو قبر میں اتار کر آئی ہوں۔

دوسری صبح جاگنے کے بعد ہی سے ان کے کان کسی نئی خبر سننے کے لئے مضطرب تھے۔ وہ ہر آہٹ پر چونکتیں۔ یہاں سے وہاں سے اور ادھر سے اُدھر انہوں نے بے قراری میں کئی چکر لگائے ہوں گے۔ زینت سے وکیل صاحب کی واپسی کے متعلق پوچھ بیٹھیں مگر وکیل صاحب وقت سے پہلے تو کیا آتے۔ وہ معمول سے بھی کچھ لیٹ ہو گئے۔ ماں جی رات گئے تک ان کا انتظار کرتی رہیں۔ بیسیوں بار تو انہوں نے کلاک دیکھا ہو گا۔ اس اضطراب میں بھی ان کے ویران چہرے پر کبھی کبھی نکھار ضرور آجاتا تھا۔ شدتِ انتظار سے ان کا ذہن لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ جب وکیل صاحب گھر میں داخل ہوئے۔ ماں جی سنبھل گئیں۔ دم سادھ لیا۔ وکیل صاحب کی آواز سننے کے لئے ان کے کان جل رہے تھے۔ وہ سارا خون چہرے پر آ سمٹا تھا۔

" طبیعت کیسی ہے اب " انہوں نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے صرف اتنا پوچھا —!

" پہلے سے کچھ ٹھیک ہے " وہ بڑی آہستگی سے بولیں۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر فائلیں ترتیب دیتے رہے۔ پھر سگرٹ سلگا کر انہوں نے کہا " زینت کی ماں —! " ماں جی کو اپنی جوانی یاد آگئی جب وکیل صاحب انہیں ان الفاظ سے مخاطب کیا کرتے تھے۔

" کہیے —— وہ جلدی سے بولیں۔

" تم سے ایک بڑی اہم بات کرنا چاہتا ہوں۔ کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے کہا۔ زینت کہاں ہے —؟ ماں جی کو محسوس ہوا جیسے چائے نگلتے ہوئے مٹی کا ڈھیلا ان کے منہ میں آگیا ہو۔ یہ جملہ معترضہ بھی عجیب تھا جس نے ماں جی کے چہرے پر پھیلی ہوئی تجسس کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ جلدی سے تھوک نگل کر وہ بولیں۔ " سو رہی ہو گی —آپ بات کریں — " پہلی بات تو یہ ہے کہ " انہوں نے کرسی قریب کھسکاتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ بیٹی زینت کے لئے بہت اچھا رشتہ طلب ہے لڑکا سی۔ ایس۔ پی کر چکا ہے یوں سمجھو بیٹھے بٹھائے خدا نے مشکل آسان کر دی! "

وہ خاموش ہو گئے تو ماں جی کے کلیجے میں ہوک سی اٹھی — بےشک وہ زینت کے معاملے کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں مگر جو کچھ سننے کے لئے وہ وکیل صاحب کا اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھیں۔ وہ سنائی دیتا انہیں نظر نہ آتا تھا۔

وکیل صاحب نے بات کے ساتھ بات چپکائی — جج صاحب کو ایسا رشتہ مل جائے تو منگنی کئے بغیر کھڑے کھڑے بیاہ دیں سلطے کو۔" سلطے کا لفظ ماں جی کے حلق میں پتھر کی طرح آ پھنسا۔ وہ بے قرار ہو گئیں۔ تھوک نگل کر اور سانس روک کر انہوں نے ساری توجہ وکیل صاحب کی طرف مبذول کر دی۔

" جج صاحب ہی کے گھر سے آ رہا ہوں ہوں سیدھا۔ کھڑے کھڑے ملنے گیا تھا اب تک اٹھنے نہ دیا انہوں نے —" وکیل صاحب آہ بھر کر بولے —" سچ ہے۔ ہر عزیز شئے قدرت کی ستم ظریفیوں کا شکار ہو جایا کرتی ہے۔ اور چہیتی اولاد کو بھی قدرت ہی کی طرف سے دکھ عطا ہوتے ہیں۔ میرا مطلب سلطے سے ہے ——" وکیل صاحب نے منٹ بھر توقف کیا ہو گا اسی دوران میں انہوں نے سگرٹ کیس سے سگرٹ نکال کر سلگایا۔ اور کش لگا کر دھواں چھت کی طرف اچھالتے رہے۔ پھر آہستہ سے گویا ہوئے —— " خدا نے اسے حسن کی دولت بھی دی ہے۔ اور تعلیم کا زیور بھی۔ جہیز دینے میں بھی شاید ہی وہ لوگ کوئی کسر چھوڑیں۔ خاندان بھی اچھا ہے۔ پھر لوگ جج صاحب اور سلطے کے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں —— مگر جانے کیوں —— رشتہ ایک جگہ ٹھہرتا نہیں۔ کرنل جمشید کے ہاں ہوا۔ تو تین دن میں ٹوٹ گیا۔ اب پروفیسر الطاف کے ہاں سے بات بنی بنائی یوں ختم ہو گئی ہے جیسے ان دو خاندانوں میں کبھی کوئی ربط تھا ہی نہیں۔

رشید کی موت پر سلمیٰ ابھی کھول کر رو گئی تھی ——— پھر جب کرنل بشیر کے ہاں سے رشتہ ٹوٹا۔ تو وہ دن میں تین بار بے ہوش ہوئی تھی اور اب کے اسے اپنے منحوس ہونے کا احساس کچھ اس قدر ہوا کہ اس نے خودکشی تک کی کوشش کی ہے۔ دل پھٹ رہا ہوگا۔ بے چاری کا۔ وہ تو وہ ——— جج صاحب بات کرتے کرتے رو دیئے تھے۔

کہنے لگے۔" سلمیٰ کے نصیب برے نہیں۔ نصیب تو میرے برے ہیں ——— ایک لڑکی جسے بیاہ نہیں سکتا۔ لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں ——— سنو تو ہتھیلی سے پسینہ نکل آئے ———————" وکیل صاحب رکے تو پہلے سانس ہی میں ماں جی کے سینے کا پنجر لڑھک گیا۔

" سچ پوچھو تو زینت کی ماں ——— بیٹی کا رشتہ ہو کر ٹوٹ جائے تو دل خون ہو ہو جاتا ہے ———" کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے وکیل صاحب نے بات آگے بڑھائی تھی۔

" بے چاری سلمیٰ ———" ماں جی نے آہ بھر کر صرف اتنا کہا۔ اور اپنے کمرے میں آنے کے لئے اٹھیں۔

وکیل صاحب نے چونک کر گردن گھمائی۔ اور بے ساختہ بولے ———" دوسری بات تو نامکمل ہی رہ گئی ہے ———" کھنکار کھانس کر یوں تو انہوں نے گلا صاف کیا مگر حقیقت میں وہ بات کو ترتیب دے رہے تھے۔

" زینت کے رشتے کے لئے وہ لوگ پندرہ کی شام کو آ رہے ہیں۔"

" کون لوگ ہیں ———" ماں جی سہم کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

" نواب امجد حسین کے بیٹے کے لئے کافی دنوں سے رشتے کی تلاش ہو رہی تھی ——— سچ پوچھو تو مجھے یہ رشتہ منظور ہے ——— اور پھر زینت کے لئے یہ رشتہ ہے بھی تو نہایت موزوں "۔ وکیل صاحب لمحہ بھر خاموش رہ کر بڑبڑائے۔ اللہ نیک نصیب کرے ———" اس وقت ماں جی خوشی، حیرت اور غم کے ملے جلے اثرات میں غرق دکھائی دیتی تھیں۔ اب تک رشید کی موت اور پھر سلمیٰ کی منگنیوں نے زینت کی جوانی کو فراموش کرا رکھا تھا۔ اب رشتہ طے ہوتے دیکھ کر انہیں اپنی غفلت کا شدید احساس ہوا ——— کہ وہ ہکلا کر کرسی سے اٹھ بیٹھیں۔ اور برآمدے سے گذرتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئیں۔

اپنے کمرے میں آ کر انہوں نے بغلی کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور سامان سے بھرے ہوئے تاریک کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ٹٹول کر انہوں نے بتی روشن کی۔ اور یہ دیکھ کر اطمینان محسوس کیا کہ کمرے کی ہر شے اپنی اپنی جگہ مناسب طریق سے رکھی ہوئی ہے۔

ہر چیز کو ایک نظر دیکھنے کے بعد انہوں نے باری باری دونوں بڑے ٹرنک کھولے۔ زینت کے جہیز کا سامان تھا۔ بڑی ہی آہستگی سے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ صندوق میں رکھی ہوئی چیزوں کی طرف اٹھا اور ان سب چیزوں سے مس ہوتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ بعض کپڑوں کو انہوں نے کھول کر دوبارہ تہہ کیا۔ اور دوسری چیزوں پر لمبی سی پھونک مار کر یہ محسوس کیا کہ ان کی گرد صاف ہو گئی ہے۔ وہ پہلے سے بہت مطمئن تھیں۔ پھر بھی انہوں نے باقی چیزوں کا دل ہی دل میں حساب لگانا شروع کر دیا ——— مخمل کا ایک صوفہ۔ دو پلنگ۔ سنگھار میز۔ ڈائننگ سیٹ۔ الماریاں۔ ایک جوڑی بڑے صندوق۔ فرنیچر کو مکمل کر کے وہ سوچنے لگیں۔ کون سی شے رہ گئی ہے اب ——— زیورات پہلے سے تیار تھے۔ کپڑے بھی بے شمار تھے۔ اب صرف برات کا انتظام رہ گیا تھا۔ فرنیچر اور دوسری ضروریات کے علاوہ برات کے لئے وکیل صاحب نے آٹھ ہزار کی رقم بنک میں زینت کے نام سے الگ جمع

کروا رکھی تھی۔ ماں جی نے سونے سے پہلے وہ چھوٹا سا اٹیچی کیس کھولا جس میں بنک کے کاغذات تھے۔ چیک بک کو ہاتھ سے صاف کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ رکھا۔ اور بکس بند کر دیا۔ دوسری صبح بارہ تاریخ تھی ـــ ماں جی پل پل گن کر گذارنے لگیں۔ سب سے پہلے انہوں نے نرسری سے دو درجن نئے پھولوں والے گملے منگوائے اور انہیں ترتیب دیا۔ پھر مکان کی جھاڑ پونچھ ہوئی۔ ڈرائینگ روم میں فرنیچر کو نئے سرے سے سیٹ کیا گیا۔ اور آنے والے مہمانوں کے لئے نیا ٹی سیٹ نکلوا کر دھلوایا۔ پرانے برتنوں کو ٹین کے پیچھے میں بند کر کے صندوق کے پیچھے چھپا دیا ـــ ان سب کاموں سے فراغت حاصل کر کے وہ کمر سیدھی کرنے کے لئے بیٹھیں۔ تو بارہ تاریخ کی دوپہر تھی ـــ کم بخت وقت تھا کہ گذرتا ہی نہ تھا۔ تیرہ اور چودہ تاریخ کے دن انہوں نے اپنی کاموں کو دہرا کر اور سوچتے ہوئے گذار دیئے۔ پندرہ کو وکیل صاحب بارہ بجے ہی کچہری سے لوٹ آئے۔ زینت کو انہوں نے فوراً نہا کر لباس تبدیل کرنے کے لئے کہا اور خود بھی لباس تبدیل کرنے اندر چلے گئے۔

زینت گھر کے اس ہنگامے انقلاب کا عنوان تو تھی ہی۔ مگر جب بھی اس نے نئے مہمانوں کے متعلق یہ سوچا کہ وہ اسے دیکھنے آ رہے ہیں۔ تو اسے اپنے آپ سے خوف محسوس ہونے لگا۔ پھر اس حد تک شرم کا احساس ہوا کہ اس کے کانوں کی لویں جلنے لگیں۔ وہ آج تک بیسیوں سہیلیوں سے ملی ہوگی۔ ان کے گھر مہمان بھی بے شمار آئے تھے۔ پاس پڑوس کی عورتوں کا جمگھٹا بھی اکثر رہتا تھا۔ مگر مہمانوں یا ملنے والوں سے نفرت کا جو احساس آج اس کے سینے میں ابھرا تھا وہ پہلے نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو جانور تصور کرنے لگی تھی۔ اس سے اس کے شعور پہ احساس کمتری کی ہلکی سی پرچھائیں بھی پڑی۔ اب تک اس نے چار بار آئینہ دیکھا ہوگا۔ اب جو آئینہ دیکھنے گئی تو اسے اپنے چہرے پہ ملاحت صباحت یا حسن کا ایک جزو بھی دکھائی نہ دیا۔ یہ عجیب احساس تھا جس نے چہرے پہ چڑیلوں مردنی پھیلا دی تھی۔

اس نے سوچا ـــ "اگر لوگ چپ چاپ لڑکی دیکھ کر پسند کر لیں تو لڑکیاں بے چاری اس عذاب سے تو بچ جایا کریں۔ جس میں کہ وہ اس وقت مبتلا ہے" اس کے ہاتھوں کے طوطے جل رہے تھے۔ سانس پھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ اور جسم بخار کی طرح تپ رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں کمرے میں جا کر دونوں منہ چارپائی پہ گر گئی اور تکیے میں منہ چھپا لیا۔

چار بجے کے قریب جب اس نے مرتبہ سا شور سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ مہمان ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے ہیں۔ اس کا دل کچھ دیر کے لئے رک سا گیا۔ اور پھر اس قدر زور سے دھڑکا کہ اسے اپنے کان بجتے اور چھت گھومتی ہوئی محسوس ہوتی۔

پندرہ منٹ مشکل سے گذرے ہوں گے۔ ماں جی ہانپتی ہوئی اندر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں مٹھائی سے بھری پلیٹ تھی۔ "زینت بیٹا۔" وہ بولیں "گھر میں مہمان آئے بیٹھے ہیں۔ اور تم لیٹ رہی ہو۔ اچھی مہمان نوازی ہے یہ ـــ اٹھو ـــ یہ مٹھائی اندر دے آؤ ذرا۔"

زینت کو معلوم تو ہو ہی گیا تھا کہ ماں جی اسے کیوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے مہمانوں کے پاس بھیج رہی ہیں۔ اسے لگا کہ اس کی زندگی کا نازک ترین لمحہ غالباً یہی ہے۔ اسی احساس نے اس کے پاؤں جکڑ لئے۔

"مجھے شرم آتی ہے۔" اس نے ماں جی سے التجا کی۔

ماں جی نے کچھ کہنے کی بجائے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو زینت نے جھٹک کر بازو چھڑا لیا۔ ایک پل کے لئے ماں جی کا رنگ اس کوچوان کے چہرے کی طرح بدل بدل گیا جس نے سواریاں مشکل سے حاصل کی ہوں۔ مگر عین وقت پہ اس کا گھوڑا بدک جائے

یہ گھڑی زینت کے لئے تو نازک تھی ہی۔ ماں جی کو بھی اس کی نزاکت کا شدید احساس ہوا۔ ایسے نازک موقعوں پر ہمیشہ پیار سے کام نکلا ہے۔ ماں جی نے بھی زینت کو چومنے لگایا۔ سر پہ ہاتھ پھیرا۔ اور چمکار کر سہارا دینے لگیں۔

بڑی مشکل سے زینت جب اندر مٹھائی سے کر گئی، تو ماں جی کھڑکی کی درازوں سے یہ ڈراما دیکھنے کے لیے سہک گئیں۔ جھکتے ہوئے ان کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھا۔ اور وہ آہ بھر کر رہ گئیں — " ہائے — کیسا زمانہ آگیا ہے — انہوں نے خود سے کلام کیا۔ "بھنگن اور دکھوں کے پلے ہوئے کو لوگ بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں —" ماں جی نے لاکھ کوشش کی کہ وہ درازوں میں سے کچھ نہ کچھ دیکھ سکیں۔ مگر گھبراہٹ اور معاملے کی گہری دلچسپی نے ان کی نظر تک کو دھندلا دیا تھا۔ مہمان رات گئے تک بیٹھے رہے۔

رخصت ہونے سے پیشتر سب عورتوں نے گہری گہری نظروں سے مکان کی دیواروں کو دیکھا۔ کمروں کی تعداد معلوم کی۔ اور گھر کے فرنیچر کا جائزہ لیتی ہوئی چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد وکیل صاحب اور ماں جی دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ انہوں نے برتن سمیٹنے کی طرف توجہ دی۔ نہ بچوں کو بچی ہوئی مٹھائی کھانے سے روکا۔ دونوں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

یوں تو رشتہ آدھا طے ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ لوگ نواب صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد تک کی مہلت لے گئے تھے۔ اس لئے ماں جی کو ان صبر آزما لمحوں کو ہنستے مسکراتے گزارنا تھا۔

دوسرے دن انہوں نے ان سلے جوڑوں کو مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ عورت کے لئے کپڑوں کا انتخاب بے حد مشکل مرحلہ ہے۔ اور پھر وہ انتخاب جو وہ ———— اپنی جوان بیٹی کے لئے کر رہی ہو —— ماں جی ایک ایک جوڑے پر دو دو پہر لگا دیتیں۔ یوں بھی وقت گزارنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کون سا ہو گا۔

حتیٰ کہ جس دن نواب صاحب کے ہاں سے ماما آئی — ماں جی اس وقت دوپٹے پہ کرن لگا رہی تھیں۔

"کیسی ہو وکیلن ——" نسوار کی ڈبیا سے ایک چٹکی نتھنوں میں اڑانے کے بعد ماما ہاتھ نچا کر بولی۔

ماں جی نے کام وہیں کا وہیں چھوڑ دیا۔ اور جواب دینے کی بجائے بوکھلا کر کھڑی ہو گئیں۔ ایک منٹ توقف کے بعد بولیں — "تم کہو۔ خیر سے آئی ہو — بیگم کیسی ہیں ——"

"کیا کہوں تم سے —— ماما نے بڑے دکھ سے کہا —— بیگم ہماری کی بھی کیا پوچھو جب کوئی اچھی خبر ہووے تو خود جاوے۔ اور جب —— وہ ایک لمحہ رک کر بولی —— "خدا کی پھٹکار پڑے ان پر جن کے گھر میں لڑکے ہیں —— سو سو نخرے کرے ہیں —"

ماں جی نے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہوا محسوس کیا۔ پھر بھی وہ رندھے ہوئے گلے سے ہمت کر کے بولیں —" بات کیا ہے — آخر —؟" ماما قریب جھک آئی —" کہتے ہیں لڑکی کا قد چھوٹا ہے۔ —— اور ہے بھی صرف میٹرک —— وہ تو ایم اے پاس چاہیں ہیں ——"

ماں جی نے اس کے بعد کچھ نہیں سنا۔ وہ تو جانے کس دنیا میں کھو گئی تھیں۔ مٹی کے بت کی طرح وہ اپنی جگہ ساکت، دیوار سے جم سی گئیں۔ ان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریشمی دوپٹہ سرک کر نیچے جا گرا۔ اور کرن کا گولا لڑھکتا ہوا غسل خانے کی دیوار سے جا لگا تھا۔ جب انہوں نے لرزتی ہوئی ٹانگ کو چارپائی سے نیچے اتار کر دیوار کا سہارا لیا —— ماما جا چکی تھی۔ صرف ان کا دل تھا جو پنکھے کی طرح

مسلسل دھڑک رہا تھا۔

انہوں نے بڑے دکھ جھیلے ہوں گے۔ مگر یہ کیسا دکھ تھا۔ جو سانس کے ساتھ خون کی گردش میں سما کر اندر ہی اندر آگ لگا رہا تھا۔ آنکھیں انگارہ ہو رہی تھیں۔ بدن ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا تھا، دماغ سنسنا رہا تھا۔ ٹانگوں میں رعشے کی طرح لرزش تھی یوں جیسے پورا جسم لڑکھڑا رہا تھا۔

جب ان کے حواس پلٹے ——— انہیں یاد آیا۔ کہ بیگم کرنل بشیر کو جب انہوں نے سلطے کی بدکرداری کی جھوٹی خبر سنائی تھی تو کچھ دیر کے لئے اس کی حالت بھی اسی طرح دگرگوں ہو گئی تھی۔ بیگم کرنل بشیر کے خیال کے ساتھ منسلک، ماں جی کو فوراً سلطے کا خیال آیا۔

یہ خیال کچھ عجیب حوصلہ افزا تھا۔ کہ انہیں اپنا غم ہلکا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس لئے ——— انہوں نے سوچا ——— زینت کا رشتہ تو ابھی طے بھی نہ ہوا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ہو گی۔ اور سلطے کو تو شادی کے قریب پہنچ پہنچ کر تقریباً دھتکار ملی ہے۔ اس کی حالت تو مجھ سے بھی گئی گذری ہو گی ——— بے چاری مریم کو بیٹی کا ایسے ہی دکھ پہنچا ہو گا۔ اس کے سینے میں ایسے ہی الاؤ دہکے ہوں گے۔ آنکھیں یونہی جلی ہوں گی۔ جگر پر تیزاب کی پھوار اسی طرح پڑی ہو گی ——— اف ——— ! وہ پہلے سے کچھ مطمئن ہو گئیں۔ اور جب انہیں یاد آیا۔ کہ سلطے اور مریم کے دکھوں کا باعث صرف ان کی ذات ہے۔ تو جانے کیوں انہیں اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ سینے کی جلن جو کسی حد تک کم ہو چکی تھی پھر بڑھنے لگی۔ اور خون کی گردش پہلے کی طرح تیز ہو گئی۔

"مگر میرے نزدیک رشتہ چھڑوانے کا مقصد کچھ اور تھا ——— ان کے اندر سے سوال ابھرا ——— !

"مقصد ——— نہیں پاگل پن تھا ———"

"پاگل پن کیسے ——— آخر وہ لگتی تو میری ہی بہو تھی نا ———"

"مگر اپنی بہو پر کوئی ظلم کرتا ہے ؟ ———"

"ظلم ——— ظلم ——— بدلہ ——— بدلہ ———" ماں جی پاگلوں کی طرح چیخ پڑیں۔ انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بہری ہو جانے کی عارضی کوشش کی مگر ان کا جنون بڑھتا گیا۔ وہ چیخیں۔ کراہیں۔ سسکیں۔ اور پھر پھوٹ بہیں۔

شام تک ان کی آنکھیں سوج کر اس حد تک سرخ ہو گئی تھیں کہ پلک جھپکتیں تو دکھ ہوتا۔ مگر سانس کی رفتار اعتدال پر آ چکی تھی۔ سینہ ہلکا تھا۔ اور وہ سارا بخار، سارا جنون آنسوؤں میں گھل مل کر باہر نکل گیا تھا۔ اب ان کی حالت پہلے سے پرسکون اور ہلکی تھی۔ مگر وہ تھیں بالکل چپ چاپ !

دوسرے دن جب وکیل صاحب کچہری جا چکے تو انہوں نے نیا برقعہ نکالا کپڑے استری کئے اور بڑی تیاری کے بعد نواب امجد حسین کے ہاں جا پہنچیں۔ سب لوگ انہیں آتا دیکھ کر بوکھلا گئے۔ کوئی بھی ماں جی سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔

ماں جی نے بڑی متانت سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "بیگم کھڑے کھڑے تم سے دو حرف کہنے آئی ہوں۔"

بیگم ہچکچاتی ہوئی اٹھیں ——— اور ماں جی کو اندر لے آئیں۔

ماں جی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "قسم لے لو ——— جو تم سے گلہ مند ہوں تو ——— رشتے ناطے کی بات ہے۔ پسند بھی ہوتے ہیں ناپسند بھی ——— سمجھ سوچ کر ہی یہ معاملات طے ہو سکتے ہیں ——— کوئی گڈے گڑیا کا بیاہ تو ہوتا نہیں کہ بارش ہوئی اور

رچا دیا ــــ بے شک زینت میٹرک تھی۔ چھوٹے نواب کے قابل نہیں تھی " ماں جی نے ٹوک لگی تو بیگم کو بولنے کا موقع مل گیا۔

" بس یہی بات تھی دیکھیں ــــ مائیں بے چاری کیا کریں۔ لڑکا چار حروف پڑھ جائے تو بی اے سے کم بات ہی نہیں کرتا "

" تم لڑکی لیے فدکی چاہتی ہونا۔ ــــ اور لڑکا چاہتا ہوگا کہ وہ بی۔ اے بھی ہو۔ ہے نا ــ " ماں جی ماماؤں کی طرح فرفر بول رہی تھیں۔

" ہاں ــ " بیگم نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

تو چلو ــــ میرے ساتھ ــ چپ چاپ لڑکی دیکھ آؤ۔ تمہیں پسند ہوئی تو سب کو پسند ہوگی۔

بیگم اور ماں جی برقع پہن کر باہر نکل آئیں۔

پچھلے روز شام کو چائے پیتے ہوئے ماں جی نے وکیل صاحب کو مبارک باد دی تو پیالی ان کے ہاتھ سے چھلک پڑی۔

انہوں نے ماں جی کی بات کو اہمیت دیتے ہوئے غرض سے کرسی آگے کھسکائی تو ماں جی نے کہا " زینت کے لیے ہم لوگ ضرورت سے زیادہ فکرمند ہیں۔ اس کی عمر کیا ہے ابھی ــــ اور پھر ہمارے بھی تو اپنی ہی بیٹی ہے نا ــــ بے چاری نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں دو ہفتے بعد نکاح ہو رہا ہے۔ "

کہاں ــــ وکیل صاحب نے شکست خوردہ آواز میں پوچھا۔

" نواب امجد حسین کے منجھلے بیٹے کے ساتھ " انہوں نے فخر سے سینہ تان کر اتنا کہا اور چائے کا آخری گھونٹ بھر کر مسکرانے لگیں۔

ہر کہ خواہد در صفِ مرداں بقائے نامِ خویش
خونِ دشمن سرخ تر از خونِ فرزندش بود

(غالب)

ہرچرن چاولہ

دوسہ

جب دوست خاں چوتھی بار جیل سے رہا ہو کر گھر جانے لگا۔ تو اُس نے سب جیل کے دوستوں سے ملنا ضروری سمجھا۔ ہر بار وہ اُن سے جلدی واپس آنے کا وعدہ کر کے ہی نکلتا تھا۔ اور حسبِ وعدہ جلدی آ بھی جاتا تھا۔ اگر اُس کے جیل کا کوئی ساتھی اُسے باہر مل جاتا۔ تو وہ اُس سے ایسے آنکھیں چراتا جیسے اس کا مجرم ہو۔ اور پھر جلدی ہی کوئی نہ کوئی ایسی واردات کر دیتا۔ جو اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر دوبارہ اُسے اپنے دوستوں کے پاس پہنچا دیتی۔ جب وہ چلنے لگا تو رب نواز خاں نے یاد دہانی کرائی۔ "اوئے دوسہ۔" یہ چھے نمبری نرہوتی منجدھاری ہوئی۔ چپ پڑا نا بھیں چھوڑ کر شہ

دوست محمد خاں نے رب نواز خاں کے شانے کو تھپتھپایا۔ اور پھر زور سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اوئے خنزیر مولسیوں جلتا ہے۔ قسم اللہ کی۔ بس ابھی گیا اور آیا۔ ماں کا راشن ختم ہو رہا ہوگا۔ ذرا لالہ رو پ چند سے دو باتیں کر آؤں۔" پھر اس نے باری باری پیر بیما۔ خلق داد خاں۔ حبیب الرحمان خاں۔ جرنیدا رام۔ رفیق محمد خاں اور لکھن سنگھ سے ہاتھ ملائے۔ اُن کے کندھوں کو دبایا اور مسکرا کر بولا۔ "حوصلہ رکھو ملیا میں آیا کہ آیا۔"

باہر نکلا تو اسے دارو غہ جی کے پاس لے گئے۔ وہ دارو غہ صاحب کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ ایک سپاہی الماری میں سے "د" کے خانے سے اُس کے کپڑوں کی پوٹلی نکال لایا۔ اور دارو غہ کی میز پر رکھ دی۔ دارو غہ نے رجسٹر میں کچھ درج کیا۔ اور پھر سر اُوپر اٹھا کر چھ فٹ لمبے بھرے بھرے جوان دوست محمد خاں کی طرف دیکھا۔ اور پوٹلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "دوسہ۔ میں اب تمہیں کیا کہوں۔ مگر ماں بچاری نے کیا قصور کیا ہے۔ اُس کا تو خیال کر۔ گھنٹوں دھوپ میں کھڑی رہا کرتی ہے ملاقات کے دن۔"

"دارو غہ جی۔ تو ناں مجھ کو خواہ مخواہ نصیحتاں کرتا ہے۔ نہ تو میرا کام کر سکتا ہے نہ میں تیری بات رکھ سکتا ہوں۔" دوسے نے ایک کونے میں الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"دوسہ۔ یہ میں نہیں کر سکتا۔ تیرے سب یار اکٹھا کیسے چھوڑ دوں؟" دارو غہ نے مجبوری ظاہر کی۔

"تو بھی مجبور ہے۔ میں بھی مجبور ہوں۔" وہ الماری کے پیچھے سے سامنے آ گیا۔ اب اُس نے اپنے کپڑے پہن لئے تھے۔ پگڑی پہ مایا کم لگی ہوئی تھی یا اتنی مدت ایک پوٹلی میں بند رہنے کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے پگڑی کندھے پر ڈالی۔ نیچے چھ گز لٹھے کا سفید چٹ چٹ کرتا تہمد باندھا جو اپنی چمک دمک کھو بیٹھا تھا۔ مگر کلف ابھی قائم تھا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ وہ دوسے کا تہمد ہے۔

گھر پہنچتے پہنچتے دوسہ جب داؤد خیل کی گلیوں سے نکلا تو لوگوں نے دیکھا۔ جیسے وہ جیل سے نہیں سسرال سے آیا ہے۔ اُس کے پاؤں میں تلے والی کھیڑی تھی۔ کمر میں سفید براق نئے نکور چابی کے لٹھے کا چھ گز کا تہمد تھا۔ مگر ایک چیز جو نظر کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ مگر پتہ سب کو تھا۔ وہ تھا بے لائسنس بھرا ہوا پستول تہمد کے اندر۔ پیٹ کے پاس۔ دائیں طرف کے نیفے میں گلے میں جو خانی دھاری کی قمیص تھی۔ جس میں چاندی کی زنجیری اور چاندی کے نئے بٹن چمک رہے تھے۔ اور سر پر گلابی رنگ کی کھلے دار پگڑی کا اور آسمان سے باتیں کرنے والے دو شملے۔

چوڑے اور مضبوط کندھوں۔ سڈول بازوؤں۔ سُرخ آنکھوں اور بچھو کے ڈنگ کی طرح اُٹھی ہوئی تیل سے چُپڑی اور چمکتی مونچھوں کے ساتھ جب دوسہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔ تو لوگوں کے سلاموں کے جواب دیتا دیتا وہ تھک گیا۔ بعضوں نے آگے آکر اُس سے ہاتھ ملانے۔ پھر اپنے ہاتھ چھاتی پر رکھ کر دِل خلوص کا اظہار کیا اور پوچھا۔ "شاہ دوسہ۔ وَل۔ چنگا۔ راضی۔ بازی۔ خوش؟؟؟"

دوسہ بھی ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ کو چھاتی پر رکھے رکھے بولا۔ "اوئے یا سیٹھ۔ تو تاں بہت تگڑا ہو گیا ہے۔ اوئے کوئی قتل وتل بھی کیا۔ کہ ایسے ہی جوان ہو گیا؟"

"چاچا اب تو آ گیا ہے تو یہ بھی ہو جائے گا"

دونوں طرف سے دوبارہ ہاتھ ملائے گئے اور سوال جواب کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا "اوئے ماں تا راضی ہے۔ بہن تاں خوش ہے۔ وَل چنگا۔ راضی خوش؟؟؟" گھر پہنچتے پہنچتے دوسہ بیسیوں سے ہاتھ ملا چکا تھا۔ جن میں دوست بھی تھے۔ محلے دار بھی۔ بازار کے دوکاندار اور غریب دہقان بھی۔ دوسہ جیل سے آنے کے بعد اُن کمیوں سے خاص طور پر گھل کر آیا۔ جیسے انہیں چیلنج کر کے واپس جانے کی راہیں ہموار رہا ہو۔

آگے اُسے کچھ اور لوگ مل گئے۔ وہ اُن سے ہاتھ ملاتا۔ اُن کے کندھے دباتا۔ حال پوچھتا رہا۔ پھر سمند خان کے ہاتھ سے بٹیر کی مُٹھی لے کر نیچے جالی سے بٹیر کو جھانکا۔ پیار سے پچ پچ کی۔ اور بٹیر کو باہر نکال لیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں۔ جب بٹیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ تو اُس کی چونچ کو منہ میں لے کر تر کیا۔ بٹیر نے آنکھیں کھول دیں۔ اور وہ اُس کے مالک کو مُٹھی لوٹاتے ہوئے بولا۔ "سمندا۔ اوئے اِس کو کبھی کبھی شراب کا قطرہ بھی دیتا ہے کہ نہیں؟ اس کی آنکھوں کی مستی کہاں گئی؟؟ پتہ کیا ہو گا؟؟؟"

جب دوسہ گھر پہنچا۔ تو اس کی ماں گائے کے لئے چارہ بنا رہی تھی۔ پاس ہی اُس کی نو سالہ بھتیجی جیراں کھڑی تھی۔ پہلے جیراں نے دوسے کو دیکھا۔ تو چلائی "اماں۔ دوسہ چاچا آ گیا۔ دوسہ چاچا آ گیا" پھر وہ لپک کر دوسے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ دوسے نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"جیراں۔ ول تو ہے نا"

ماں اُٹھی۔ اُس نے دور گلی کے دروازے سے دوسے کو آتے دیکھا۔ سفید لٹھے کا تہبند۔ دھاری دار قمیض اور گلابی پگڑی باندھے۔ وہ اپنی بوڑھی اور کمزور آنکھوں سے بس یہی کچھ دیکھ سکی۔ لپک کر وہ بیٹے کی طرف بڑھی اور بانہوں کے دائرے میں اپنے بیٹے کو لے لیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اُس کے چہرے پر پھیرا۔ پھر اس کے ہاتھ دوسے کے گالوں۔ مونچھوں اور ٹھوڑی پر سے پھسل کر اُس کے گلے میں آ گرے۔ اُس نے ذرا سے دباؤ سے دوسے کو نیچے جھکایا اور اُس کی پگڑی پر بوسہ دیتی ہوئی بولی۔ "پُتر تو آ گیا۔ میری تو دید کمزور ہو گئی۔ تجھے پہچان بھی نہ سکی"

"اماں۔ تیری خاطر ہی آنا پڑتا ہے مجھے۔ ورنہ میرا بس چلے۔ تو ایک دن بھی باہر نہ آؤں" ماں یہ سن کر اُداس ہنسی ہنس دی۔ ماں کی بجھی بجھی ہنسی دیکھ کر دوسے کا دل دہل گیا۔ اُف وہ کتنی بدل گئی ہے۔ اُس نے سوچا۔ وہ اب کافی بوڑھی ہو گئی ہے۔ مگر کچھ ہی دیر بعد وہ سب کچھ بھول گیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر اُس نے کھیڑی پاؤں کو ایڑیوں سے دھکیل ڈالی۔ پگڑی اتار کر سرہانے رکھ دی۔ سر کے بالوں کو کانوں کے پیچھے بٹھایا اور بولا "اماں روٹی کھا یا روں سے مل آؤں"

ماں روٹیوں کی چنگیر اور گھی شکر کا مٹکرا لے آئی اور دوسے کے سامنے رکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی "بیٹا۔ اب تو جو تھی بار جیل سے چھوٹ کر آیا ہے۔ تیری راہ دیکھتے دیکھتے میری تو آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اب اگر تو نے پھر جیل ہی بسانی ہے۔ تو مجھے اپنے ہاتھوں زہر دے دے"

"ارے ماں۔ مریں تیرے دشمن۔ تو تو خواہ مخواہ دِل برا کرتی ہے۔ جیل جاتا ہوں پر تیرا تو بندوبست کر کے ہی جاتا ہوں" دوسے نے نوالہ منہ

میں ڈالتے ہوئے کہا۔

ماں چپ ہو گئی۔ دوسرا جب تک روٹی کھاتا رہا۔ وہ اُسے دیکھتی رہی۔ کہیں وہ اس کی کسی بات سے ناراض ہو کر روٹی نہ چھوڑ دے۔ روٹی کھا کر دوسے نے المونیم کے کٹورے سے پانی پیا۔ اور پھر بہت سا پانی منہ میں بھر کر ایک لمبی دھار پھینکی۔ اتنی دور جتنی وہ پھینک سکتا تھا۔ اسی دوران اس کی نظر ماں پر پڑ گئی۔ جو اداسی کی صورت بنی بیٹھی تھی۔ اُس کا دل بھر آیا۔ وہ بولا۔ "ماں۔ اب کے جاؤں گا تو تیرے لئے دو گھی کے ٹین اور ایک باداموں کا کنستر بھی چھوڑ جاؤں گا"

"ارے تو تو پاگل دیوانہ ہے۔ میں بادام اور گھی سر پر ماروں گی۔ ابھی پہلا گھی بھی تیرا ویسے کا ویسا پڑا ہے۔ میں نہیں کھاتی تیرا گھی وی۔ اب ٹھیک طرح یہیں رہ۔ ورنہ مر جاؤں گی کسی دن تیرے آنے سے پہلے" یہ کہتے کہتے بڑھیا پھر روہانسی ہو گئی۔

"ماں۔۔۔۔ ماں۔۔۔۔" مگر دوسرا ماں کو اداس دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ ماں نے بدستور بھرائی ہوئی آواز میں کہا: "ہٹ پرے۔ مجھے ماں ماں مت کہہ۔ ایمان سے سچ کہتی ہوں۔ اگر میں کسی جانور کو بھی نو مہینے کسی بوری کے ٹکڑے میں سردی سے بچا کر رکھتی۔ تو وہ بھی میرا احسان نہ بھولتا۔ تجھے تو نو مہینے میں نے پیٹ میں رکھا ہے۔ اور پال پوس کر یہ ٹیا جوان کیا ہے۔ ارے جیلے کی شادی میں نے کیا کر دی۔ وہ تو رن مرید (زن مرید) ہو کر رہ گیا۔ ایک تیری ہی آس تھی وہ بھی ختم ہو کر رہ گئی"

دوسرا خاموش رہا۔ اُس نے سوچا۔ اب اگر وہ بولا۔ تو ماں دکھی ہو گی۔ پہلے پہل اسی ماں کے لئے تو اُسے جیل جانا پڑا تھا۔ جب وہ بیمار ہو کر چارپائی سے لگ گئی تھی۔ تو دوسے نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے۔ چاچا غلام یٰسین کے آگے ہاتھ پھیلائے تھے جاب خان سے ادھار مانگا تھا مکانداروں کی منتیں کی تھیں۔ بھائی سے زمین اور فصل کا حصہ مانگا تھا۔ مگر بھائی نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا جب تو نے زمین پر محنت نہیں کی۔ تو گھر بیٹھے بٹھائے فصل کا حصہ کیسے مانگتا ہے۔ دوسے کے لئے بھائی سے اپنا حصہ وصول کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر اپنی مہربان بھابی کی وجہ سے خاموش ہو گیا۔ اس نے راتوں رات لالہ لوتھو رام کے گھر سیندھ لگا کر تین سو روپے نقد اور دو سو کے زیورات اڑا لئے۔ ماں کا علاج بھی ہوتا رہا اور ساتھ ساتھ پولیس کی تفتیش بھی۔ اور جب جائے حادثہ کی زمین پر پاؤں کے نشانوں سے دوسے کے پاؤں کے نشان مل گئے۔ اور جیتے سنار کے پاس زیور بھی برآمد ہو گیا۔ تو اُسے سات ماہ قید کی سزا ہو گئی۔ پھر اس نے جیل سے واپس آتے ہی مخبر کی وہ خبر لی۔ کہ وہ چھ ماہ ہسپتال میں ٹانگوں پر پلستر لگوائے پڑا رہا۔ اور دوسرا دو سال کے لئے پھر اندر ہو گیا۔ اور پھر تو دوسے کے لئے جیل دوسرا گھر بن کر رہ گئی۔

اب کی دفعہ جب دوسرا آیا۔ تو گاؤں کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ گاؤں کے ساتھ بہنے والا دریا بھی سوکھا پڑا تھا۔ وہ جو چاندی کی طرح چمکنے والا "کنز دریاں کا دریا" کا بھی کہیں نام و نشان نہ تھا۔ اُن کی جگہ ایک لمبا مٹی کا باندھ کمپی شاہ مرداں سے شمس تک چلا گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا۔ کہ یہ نہر تھی۔ جو وہاں کھودی جا رہی تھی۔ بیچ میں لمبی سڑک بن چکی تھی۔ جس پر موٹر کاریں دوڑ رہی تھیں۔ وہ بھی شاہ مرداں تھل پراجیکٹ کا ہیڈ دیکھنے گیا، وہاں جنگل میں منگل ہو گیا تھا۔ جہاں ریت اڑا کرتی تھی جس پر گرمیوں میں دانے بھُنتے جا سکتے تھے۔ وہاں سڑکیں بن گئی تھیں اور اُن کے کنارے چھوٹے چھوٹے درخت لگے ہوئے تھے۔ نئے کوارٹروں کی قطاریں دور دور تک لال سڑکوں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ پانی کے خود بخود بہنے والے نلکے تھے۔ ریلوے لائن تھی۔ ہزاروں من وزنی مشینیں کام کر رہی تھیں۔ ہزاروں مزدور کام کر رہے تھے وادڑ خیل کا بچہ بچہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ نہر پر کام کر رہا تھا۔ جو پٹھان پہلے ذرا ذرا سی بات پر چھرے نکال کر منڈی تلے لڑائی کے لئے اتر آتے تھے اب نہر کے انجینئر کو افسر سمجھتے تھے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر گاجر مولیاں، بیر اور باجرے کے بھٹوں کی رشوت پہنچا پہنچا کر نوکری مانگتے تھے۔ دوسے کو یہ تبدیلی کچھ پسند نہیں آئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ لکار

گاکس کر، ٹسے گاکس سے۔ کیونکہ نہر نے ان سب کو اب مُلّحہ کی بنا دیا تھا۔

پہلے وہ دوسے کو اس لئے ملتے اور سلام دعا کرتے تھے کہ وہ ان کا دلیر ساتھی تھا۔ اُن کا راہبر تھا۔ جب وہ جیل چلا جاتا تو اس کے پیچھے پانچ دس وارداتیں اور ہو جاتیں اور جب وہ گاؤں میں ہوتا تو کوئی واردات ہی نہ ہوتی۔ جیسے سب منتظر ہوں کہ پہل دوسے کی طرف سے ہو۔ اب وہ دوسے کو اس لئے باقاعدگی سے سلام کرتے تھے کہ وہ جیسے کوئی بڑا افسر ہے اور ان کی روزی کا وسیلہ ختم کر سکتا ہے۔ مگر دوسے کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی وہ تو وہ شیر تھا۔ جو اُس شیر کا گوشت کھانا پسند کرتا تھا۔ جو مقابلہ کرے اور جسے وہ خود شکست دے۔ وہ سمجھ نہیں رہا تھا۔ کہ آخر اب کہاں ہاتھ ڈالے۔

ایک دن دوسہ ہیرے بھگت کی دکان کے آگے بیٹھا تھا گھٹنوں پہ پگڑی رکھے پاس ہی دو چار دوست اور جوان اور بھی بیٹھے تھے۔ صادق حسین نے کہا۔

"چاچا۔ سُنا پھر کوئی جیل کی بات وات"

دوسے نے اُن کی سوئی ہوئی غیرت کو جگاتے ہوئے کہا۔ "اوئے جاؤ کُتّو! تم سے کیا بات کروں جیل کی۔ تم تو مکھیاں ہو۔ اب تو اُٹھاں سے کبھی اُونچی جگہ ہاتھ ڈالوں گا" دوسے کی آنکھوں کے سامنے نہر کے افسروں کی کوٹھیاں لہرائیں۔ اُس نے سوچا جانے وہ کتنی تنخواہ پاتے ہوں گے، اور روز گڑ کھاتے ہوں گے۔ گڑ کا خیال کر کے خود دوسے کے منہ میں پانی بھر آیا۔

"چاچا۔ اُونچی جگہ میں بتاتا ہوں۔ ہمت ہو تو ڈال ہاتھ" پھر اُس نے دوسے کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا۔ "شباب کی بھرجائی۔ شاہنواز کی بیوی۔ ایمان سے دانہ ہے دانہ۔ پہ چاچا ہماری تو ہمت نہیں پڑتی شباب کے ڈر سے۔ بڑا جبر جنگ آدمی ہے"

"اوئے تو جبتی کی بات کر رہا ہے" دوسے نے لاپرواہی سے کہا۔

"ہاں چاچا۔ بختی ہی کی تو بات ہے۔ ایمان سے حور ہے حور۔ مگر بڈھے شاہنواز کی قید کاٹ رہی ہے"

"شباب خان۔۔۔۔۔۔"

"ہا۔ اوئے ہا۔ ہو گی تیری بری۔ میری جیل کی پرہ سے بڑھ کر کیا ہو گی" دوسے کو جیل یاد آ رہی تھی۔

"چاچا بختی کا تو سارا شہر دیوانہ ہو رہا ہے۔ پہ میرا خیال ہے تو شباب خان سے ڈر گیا"

دوسے نے غصے کی ایک دھپ صادق کی کن پٹی پہ جمائی۔ اُس کی پگڑی دور مٹی میں جا گری۔ "اوئے کافر دے پُترا۔ تو کہتا ہے میں شباب سے ڈرتا ہوں۔ پھر اس نے ہتھیلی پہ ہتھیلی بجائی اور نیچے والی ہتھیلی سے کوئی خیالی چیز پکڑ کر پھونک سے ہوا میں اڑا دی۔

"اوئے وہ تو میرے لئے ایک جلے پروں کا مچھر ہے۔ پر میں کیا کروں یہ میری لین نہیں۔ ورنہ بختی کا کیا ہے وہ کل سے ہی تیری چاچی ہوتی"

صادق نے مٹی میں لتھڑی ہوئی پگڑی اٹھائی اُسے جھاڑا۔ ایک پلو کر کان کے نیچے رکھا اور اُوپر سے پگڑی باندھ لیا۔ پگڑی باندھ کر اس نے دوسے کی طرف کچھ عجیب نظروں سے دیکھا جو اپنی مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔ دو منٹ اُسے گھورتا رہا۔ جب دوسے کی نظریں اُوپر اٹھیں تو اُس نے نظر نیچے جھکا لیں۔ اور اپنی راہ چلا گیا۔ اُس کی چال یوں سست تھی جیسے وہ گھسٹتا جا رہا ہو۔ یا جیسے وہ ابھی واپس آئے گا۔ اور کہے گا۔ "ہاں دوسے۔ تم بزدل ہو۔ تم شباب خاں سے ڈرتے ہو" اس بات کو دوسے نے بھی محسوس کیا مگر صادق جا چکا تھا۔

ایک دن دوسہ بابے خیلوں کی گلی سے گزرا اچانک اس کی نظر بخت بھری پہ پڑی جو گھر سے نکل کر گلی کی طرف آ رہی تھی دوسے نے ایک لمحہ بخت

کی طرف دیکھا۔ بخت بھری نے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر مسکرا کر گھر لوٹ گئی۔ ودھسر کو ایسے لگا جیسے کہیں بجلی کوند گئی ہو۔ ارے یہ کیا وہی بختی ہے جس کو تین سال پہلے ناک صاف کرنی بھی نہیں آتی تھی۔ واہ ری جوانی۔ تو بھی سندھ کی باڑھ ہے آتی ہے تو سب کو پتہ چلتا ہے کہ تو آئی ہے۔ ودھسر نے سوچا۔ واقعی صادق ٹھیک کہتا تھا واقعی سالا شہزادہ اس کا دیوانہ ہے۔

اب ودھسر چاندنی راتوں میں وہ پہرے کا تا بختی کی گلیوں سے گزرتا۔ دن میں بھی کوٹھے یار کے چکر لگتے۔ ادھر بخت بھری بھی کسی نہ کسی بہانے باہر آ جاتی۔ کبھی کسی بچھڑے کے پیچھے بھاگی آ رہی ہے۔ کبھی کسی بکری کے بچے کے پیچھے اس کی آنکھیں دن بھر ودھسر کو ڈھونڈتیں۔ اب چوری چھپے کبھی کبھی مل بھی لیتے تھے۔ مگر کہیں عشق اور مشک بھی چھپائے چھپتا ہے۔ جب ان کی محبت کے افسانے پھیل گئے۔ تو شاہنواز کا جینا دو بھر ہو گیا۔ وہ پٹھان تھا شباب خان کا بھائی تھا۔ غیرت مند تھا۔ مگر اس کے رشتہ داروں نے اسے روک رکھا تھا۔ وہ جھگڑا کو بات سے نہیں لڑانا چاہتے تھے وہ جانتے تھے کہ شباب خان بھی اس کا بندوبست کر سکتا ہے۔

ایک دن ودھسر نہر کے ہیڈ سے واڈو خیلی واپس آ رہا تھا۔ اس نے نہر کے ایک ٹھیکیدار کو ریل کے پل سے اکیلے نکلتے ہوئے گھیر کر اس کی پیٹھ پر آدھی کھائی ہوئی گاجر رکھ کر دباتے ہوئے کہا تھا "نکال کیا ہے تیرے پاس ورنہ پھوڑ رہا ہے روز گڑ کھا کھا کر"

اور اب ٹھیکیدار سے چھینے ہوئے تین سو روپے کے نوٹوں کو شلے کے اندر رکھے پیٹ پر وہ محسوس کرتا زیرِ لب مسکراتا گھر کی طرف آ رہا تھا۔ ایک انگلی میں ایک سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی یہ بھی ٹھیکیدار کی یادگار تھی اس نے جیب سے ایک تازہ گاجر نکال کر ہوا میں اچھالی اور پھر جھپٹ کر کچاک کچاک دانتوں سے کاٹ کر کھانے لگا۔ جب وہ جالوں کے جھنڈ کے پاس سے گزرا تو دھپ سے ایک آدمی نکل کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور للکار کر بولا۔

" او ئے ودھسر تکڑا ہو جا۔"

آنِ واحد میں ودھسر نے پگڑی کس لی۔ اور کھونڈا کھینچ لیا۔ پھر اس نے اس آدمی کے برچھے کی لاٹھی پر ایسا کھونڈا جمایا۔ کہ برچھا دور جا گرا۔ قریب تھا۔ کہ وہ اس کی ٹانگ توڑ دیتا۔ کہ آس پاس سے پھر چھے اور چار لاٹھیاں اور لہرائیں۔ کھونڈے کو تلوار کی طرح سونت کر وہ للکارا۔ "جوانو۔ میں تکڑا ہی تکڑا ہوں — تم چھ ہو نا اور میرے پستول میں بھی چھ گولیاں ہیں۔ سب کو ایک ایک بانٹ دوں گا۔ مگر میرا کھونڈا کئی دنوں سے پیاسا ہے پھر اس نے کھونڈے کی موٹھ ——— دستی گھمائی دونوں برچھے دُور جا گرے۔ ان کی آنیاں پھر کر ٹیڑھی ہو گئیں۔ دو جوانوں کے سر پھوٹ گئے۔ ایک وہیں لیٹ گیا۔ اس زخمی کو چھوڑ باقی پانچوں بھاگ گئے۔ ودھسر نے ایک لاٹھی اٹھا کر گالی دیتے ہوئے بھاگتے جوانوں کے پیچھے ہوا میں اچھال دی۔ پھر گرے ہوئے جوان کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اس کے سر کو اوپر اٹھایا۔ وہ خون تھوک رہا تھا۔ ودھسر بولا "میں جانتا ہوں۔ تم شابے کے آدمی ہو۔ اس سے کہنا۔ تیری چوڑی چھاتی سے میری آدھا انچ گولی کا مقابلہ ہے۔"

جب ودھسر گھر پہنچا۔ تو اس کی ماں چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی۔ بھائی۔ بھابھی۔ دو تین عورتیں اور حباب خان پاس بیٹھے تھے۔ اس کی بائیں ٹانگ پر روئی اور پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ ایک سیڑھی پر کھڑی دیوار پر اُپلے تھاپ رہی تھی۔ کہ سیڑھی اس کے بوجھ تلے پھسل گئی اور وہ دھم سے، بائیں ٹانگ کے بوجھ پر زمین پر آ گری۔ ودھسر بھاگا بھاگا حکیم جودھا رام کو بلا لایا۔ مگر اس کا کالا تیل۔ روئی۔ اور گرم کپڑے کی پٹی نے بھی کوئی خاص افاقہ نہیں کیا۔ بڑھیا روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ ودھسر چاہتا تھا۔ کہ ماں جلدی جلدی ٹھیک ہو جائے۔ کیونکہ ودھسر کے بازو بے چین رہنے لگے تھے۔ ان میں کھجلی سی ہونے لگی تھی۔ جیل جانے کا شوق اس کھجلاہٹ پر تازیانے کا کام کر رہا تھا۔ اس نے کافی دنوں سے کوئی واردات نہیں کی تھی اس کے روپے ختم ہو رہے تھے تفتیش کے سلسلے میں ابھی تک کوئی اسے پوچھنے بھی نہیں آیا تھا ودھسر کو ایسے لگتا جیسے اس کے بازوؤں کی رگیں ننھے ننھے کیچوے بن گئی

ہیں۔ جو آہستہ آہستہ تمام بازوؤں پر اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر حرکت کرنے لگے ہیں۔ اُسے اس حرکت سے ایک زبردست خارش سی اُٹھتی اور وہ بے چین ہو اُٹھتا۔ اور بے قراری سے ماں کی صحت کا انتظار کرنے لگتا۔ مگر بڑھیا کی حالت بگڑتی جا رہی تھی آخر ایک دن اس نے ماں سے کہہ ہی دیا۔ "اماں اب تو ٹھیک بھی ہو جا۔"

"ودسے! میں سب جانتی ہوں۔ تو کیوں میری فکر کر رہا ہے۔ مگر اب میں ٹھیک نہیں ہو سکتی۔"

وہ درد بھری آواز میں بولی۔ "بیٹا! اب اِس دنیا میں میرے لئے رہ ہی کیا گیا ہے ایک تیری خاطر جیتی تھی۔ سو تو تو میری پروا بھی نہیں کرتا۔"

"ماں! تجھے فکر کس بات کا ہے۔ آخر کس چیز کی کمی ہے؟" ودسے نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا۔ میں نے تجھے بہت سمجھایا۔ تو اپنی عادتوں سے باز نہیں آتا۔ میں مر جاؤں۔ پھر جی بھر کر جیل کی سیر کرنا۔"

"ارے ماں! دیکھ آج ہی ہسپتال کے ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ اس کی دوا سے تجھے بالکل آرام آجائیگا۔"

"نہیں بیٹا اب تم کہیں مت جانا۔ مجھے پہلے اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتار لے۔"

"ودسے کی بھابی نے ودسے کو ایک طرف لے جا کر کہا: ودسے۔ بڑھیا کی روح تو تجھ میں اٹکی ہے اگر تو چلا گیا اسے چھوڑ کر تو کل ہی مر جائے گی۔"

حباب خان اور دوسرے لوگوں نے اس بات کی تائید کی۔ ودسے نے اب کچھ دن خاموش رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اب وہ ہر وقت بڑھیا کے علاج میں لگا رہتا۔ ڈاکٹر نے بڑھیا کی ٹانگ پر پلستر لگا کر تین مہینے مکمل آرام کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ گھر پر بستر پر لیٹی لیٹی ودسے کو دیکھتی رہتی۔ اب جب ہر وقت وہ ماں کی آنکھوں کے سامنے رہنے لگا۔ تو وہ تندرست ہونے لگی۔ چار ماہ بعد وہ دوبارہ اٹھ کر کام کرنے لگی۔ تب تک ودسے نے اپنی جان پر بہت جبر کر لیا تھا۔ جیل سے اُس کے دوستوں کے بلاوے آرہے تھے مگر بڑھیا نے صاف کہہ دیا تھا کہ اب اگر اس نے جیل کا رُخ کیا تو وہ شاہینے کے کنویں میں کود کر جان دے دے گی۔

ودسے کی بے چینی دیکھ کر اس کی بھابی نے اُسے سمجھایا۔ "ارے وہ بیچاری اب اور کیا جئے گی۔ یہی دو چار سال کی بات ہے۔ پھر جو جی میں آئے کرتے پھرنا۔"

ودسے کو دو چار آرام سے بیٹھنا مشکل نظر آرہا تھا۔ مگر وہ تو چاہتا تھا۔ کہ اس کی ماں ہزار برس جئے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری اُس کی ماں ہی تھی پھر یہ مدت وہ کس طرح گزارے۔ یہ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا۔ جب اُسے کوئی اور راہِ فرار نظر نہ آئی۔ تو اُس نے بٹیر، مرغے اور دُنبے لڑانے شروع کر دیئے اس کام سے بھی اُسے کچھ نہ کچھ آمدنی ہو ہی جاتی تھی۔ اور کچھ رقم باتار کے دوکاندار اُسے پہنچا جاتے تھے۔ گزارا چل ہی رہا تھا۔

ماں کی بیماری اور تیمارداری کی وجہ سے ودسے کافی مدت کو چہ یار میں بھی نہیں گیا تھا۔ اُدھر سے اُسے ماسی بکاں کی معرفت بلاوے پر بلاوے آرہے تھے۔ پھر جب وہ ایک دن بختی سے ملا۔ تو اُس نے بختی سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ وہ اس کی جوانی پر جان دیتی ہے جب یہ جوانی نہ رہی تو پھر کس سے پیار کرے گی؟

بختی بولی: "ودسے۔ میں نے شاہنواز کو اپنی زندگی کا ساتھی آج تک مانا ہی نہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ بوڑھا ہے بلکہ اس لئے کہ محبت دل کا سودا ہے۔ خدانخواستہ تم لولے لنگڑے بھی ہو جاؤ تو بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی تمہیں چھوڑ کر۔ مجھے ایک گھر کی ضرورت ہے جہاں میں ہوں تم ہو۔ اور ہمارے بچوں کی مادی ہو۔"

"بچوں کی مادی"۔ ودسے کی دُکھتی رگ پر بختی نے انگلی رکھی تھی۔ وہ بولا۔ "اچھا بختی۔ کل تیار رہنا۔ انشاء اللہ۔ میں تمہیں ضرور لے جاؤں گا۔"

واقعی دوسرے دن بختی اپنے تمام زیورں کے ساتھ ودسے کے گھر میں تھی۔ شاہنواز کو اُس کے رشتہ داروں نے رسیوں سے باندھ دیا تھا۔

اور شباب خان کہیں باہر گیا ہوا تھا۔

عالم خیلوں میں اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی تھی اور ودے کو اس کا علم تھا۔ مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔ آخر یکدم کیسے پارسا بن جاتا۔

رمضانے کے کنوئیں کے پاس کیکروں کے جھنڈ تلے کچھ نوجوان بٹیر لڑا رہے تھے ودے نے اپنا بٹیر نکال کر کئی دفعہ مقابلے کے لئے للکارا تھا۔ مگر کوئی نوجوان ودے کے بٹیر سے اپنا بٹیر لڑانے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ ودے کئی دفعہ غصے میں آکر خود بھی لڑائی پر اُتر آتا تھا۔ اُسے تو سب بٹیروں کی لڑائی کا منصف ہی بنا دیتے تھے آج بٹیروں کی لڑائی دیکھ دیکھ کر نجانے ودے کو بھی کیوں تحریک ہو رہی تھی۔ آخر اس نے بٹیر کو میدان میں چھوڑ دیا۔ بٹیر نے دائرے میں اِدھر اُدھر چکر لگایا۔ آنکھیں بند کیں کھولیں اور پھدک کر مدِمقابل کا انتظار کرنے لگا۔ آخر مجمع سے ایک بٹیر اس کے سامنے آگیا۔ ودے نے مڑ کر بٹیر پھینکنے والے کو دیکھا۔ یہ شباب خان تھا۔ ودہ بولا "شاباش جوان، میرا بٹیر کئی دنوں سے نہیں لڑا۔ مگر دس بیل جیت کر فخر ہو گی۔ یاد ہے۔"

"نہیں ودے۔ اس میں کیا مزہ آئے گا۔ جیب کا سب کچھ۔ بولو ہے منظور؟" شباب نے ہاتھ بڑھایا۔ ودے نے زور سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ جیسے اس کے منہ پر تھپڑ مار رہا ہو۔ اور بولا۔ "منظور ہے!"

"فیصلہ میری تمہاری قوتِ بازو پر ہو گا" شباب خان نے للکارا۔ ودے نے تہمد کو پکا باندھ لیا۔ پگڑی کو مضبوطی سے کانوں اور سر پر لپیٹ لیا۔ اور گرجا۔ "شابے۔ یہ جانور تو پھر لڑتے رہیں گے۔ آ پہلے تیرا ارمان تو نکال لوں" پھر اُس نے نیفے میں سے بھرا ہوا پستول نکالا۔ اور رمضانے کی طرف اچھال دیا "رمضانے۔ اسے پاس رکھ۔ آج قوتِ بازو کی آزمائش ہے!"

وہ شباب خان کی طرف لپکا۔ دو شیر لڑنے لگے۔ دو پہاڑ ٹکرانے لگے۔ وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ایک سے دوسرے کونے میں لے جاتے۔ اُن کے بٹیر بھی لڑ رہے تھے۔ جب وہ لڑتے لڑتے بٹیروں پر آجاتے تو بٹیر ایک دوسرے سے الگ ہو کر ایک کونے میں بھاگ جاتے۔ مگر پھر ایک دوسرے کو گھیر کر لڑنا شروع کر دیتے۔ ان کو چھڑانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی ان کو چھڑانے کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔ ودے نے شباب خان کا مکے مار مار کر منہ سجا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں ملکھا ملکھا کر لال بھبوکا ہو گئی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ نڈھال ہو کر گر پڑتا کہ چھ جوان داخل ہوئے۔ انہوں نے فوراً ودے کو جکڑ لیا۔ رمضان کو پستول سمیت وہ پہلے ہی قابو کر چکے تھے۔ ودے کے پہلے جھٹکے سے دو جوان دور جا گرے جیسے کوئی بیری کو جھاڑے اور پکے ہوئے بیر دور دور جا گریں۔ مگر باقی چار جوانوں نے آخر ودے کو قابو کر ہی لیا۔ دوسرے لمحہ کوئی چمکدار چیز ہوا میں لہرائی اور ودہ خون میں، لت پت زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ شباب خان اٹھا اور اسے ٹھوکر مار کر بولا "دیکھتا ہوں۔ اب بختی کیسے تیرے گھر میں رہتی ہے!"

چھ ماہ تک جب جیل کا کوئی بھی ساتھی اُسے پوچھنے نہیں آیا تو اُسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ نہتا ہے۔

ایک دن اچانک اُسے میانوالی سٹیشن پر مکھن سنگھ مل گیا۔ اس نے دیکھا ودے نے سر پر جامنی رنگ کی تھلے دار پگڑی باندھ رکھی تھی۔ مگر اس کے دونوں بازو کٹے ہوئے تھے جن میں مختلف چیزوں سے بھرے دو تھیلے لٹک رہے ہیں۔

مکھن سنگھ نے حیرانی سے پوچھا۔ "ودے یہ کیا!" ودہ بولا—

"یار میرے بازو کاٹ دئے گئے ہیں" مکھن سنگھ کی آنکھوں میں حیرانی کی جھلک اب بھی موجود تھی۔ "پیارے یہی تو ہوتا ہے نا! مکھن سنگھ تم بھی تو کیسے پاندی ہو گئے!"

مکھن سنگھ نے سر جھکاتے ہوئے کہا "ودہ، میں جیل سے آگیا ہوں!"

"تو کیا ہوا۔ پھر جاؤ گے ہی نا۔ میرا سلام کہنا سب کو۔ اچھا چل تو ذرا میرے ساتھ ذرا وہاں تک۔ وہاں میری دکان ہے" اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یار میری ماں دکان پر بیٹھتی ہے اور میں ان ٹنڈوں میں تھیلے لٹکا کر سودا سلف لے آتا ہوں۔ اور تیری بھابی......" پھر وہ چپ چاپ پاس سے گزرتے ہوئے ایک جوان کے ہاتھوں میں بٹیر کو گھورنے لگا۔

شہرت بخاری

○

سکوں شب کو نہ کچھ آرام دن میں
کہاں رہنا پڑا ہے اور کن میں

کبھی نہ ڈوبتے تارے بھی دیکھو
جھلکتی ہے مری تصویر ان میں

ڈسا کرتے ہیں پل پل سانپ بن کر
وہی سائے کہ گزری عمر جن میں

اندھیرے کا یہ عالم ہے کہ شہرت
دیئے روشن کئے لوگوں نے دن میں

○

شیر افضل جعفری

○

شیر افضل غموں کی ڈاروں میں
جیسے دُلہا سجے کنواروں میں

روح کی ٹہنیاں پنپتی ہیں
درد کی آتشیں پھواروں میں

دل نے جھولی بھری ہے پھولوں سے
آگ سے چھوٹتے اناروں میں

پھونکتے ہیں فقیر نور و سرور
بانسری کی دکھی پکاروں میں

جھلملاتا ہے روپ جیون کا
ندیوں کی حسین دھاروں میں

ریشمیں پینگ کی سُہاون ہے
وقت کے مرمریں اُلاروں میں

○

ارشد کاکوی

○

جس طرح بھری محفل میں رہے کوئی تنہا
ہم گذارتے ہیں یوں اپنی زندگی تنہا

وہ بھلا کسی کو کیوں کلفتوں میں دے آواز
جو گذار دیتا ہو ساعتِ خوشی تنہا

چاند سو گئے ہیں سب پھونک کر چراغ اپنے
ہم اٹھاتے ہیں تیرا نازِ روشنی تنہا

وقت ہی بتائے گا کون کس سے ملتا ہے
تم جگہ جگہ محفل، ہم گلی گلی تنہا

روشنی کے ساتھ آئی آگ بھی، پتنگے بھی
زندگی میں جب آئی، آئی تیرگی تنہا

ہو گئی وبالِ جاں دہر کی توجہ بھی
ایک نہیں ہم سے شامل اُن کی بے رخی تنہا

تم مری سنو ارشد اور نہ میری مانو تم
کس طرح نبھائیں ہم تم سے دوستی تنہا

○

اختر لکھنوی

○

کسی کی آنکھ میں جلتا ہوا دیا نہ ملا
تمہارے شہر میں کوئی بھی بے خطا نہ ملا

بسے ہوئے سرِ مژگاں ہیں روشنی کے شہر
ہم ایسے تیرہ نصیبوں کو تجھ سے کیا نہ ملا

ملے نقوشِ قدم سیکڑوں ترے در تک
پھر اس کے بعد ہمیں کوئی نقشِ پا نہ ملا

نگر نگر ہوئے روشن انہی سے تیرے چراغ
ترے حضور جنہیں حرفِ مدعا نہ ملا

زمانہ خاک بسر جس کے فیض سے ہو جائے
ہمیں تو اور کوئی تم سا خوش ادا نہ ملا

شبِ فراق ہے سو جاؤ دو گھڑی اختر
یہ ایک لمحۂ فرصت ملا ملا نہ ملا

○

بشر نواز

○

آنسو پی لیں، دامن سی لیں، راز نہ اپنے عام کریں
ہم تو رسوا ہو ہی چکے ہیں ان کو کیوں بدنام کریں

غم کی تپتی دھوپ میں کب تک تنہا تنہا یوں گھومیں
چل کر سایۂ زلف میں بیٹھیں، پل دو پل آرام کریں

اور تو کوئی فکر نہیں ہے شام سے ہے بس سوچ یہی
بند درِ میخانہ ہوا، اب کیسے طوافِ جام کریں

ہم بھی مآلِ غنچہ و شبنم خوب سمجھ بیٹھے ہیں مگر
ان چند لکتی گھڑیوں کو کیوں نذرِ غمِ انجام کریں

عکسِ جبین و شعلۂ لب سے بام و در خود لَو دیں گے
چڑھتے سورج کے آگے کیا پردہ چلمن کام کریں

اپنے لہو سے بھرتے ہیں جو اوروں کی تصویر میں رنگ
اہلِ زمانہ نام ہمارا اُن ہی میں ارقام کریں

○

سیّد مراتب اختر

○

کسی نے دل میں دیا درد کا جلایا ہے
کھنڈر کے پاس جہاں شیشموں کا سایہ ہے

فصیلِ شہر سے باہر نکل کے دیکھ ذرا
طویل راہ کو طے کر کے کون آیا ہے

یہ کس بدن کی مہک ذہن میں در آئی ہے
یہ کس کا دھیان بہاریں سمیٹ لایا ہے

سلگ رہی تھی زمانوں سے سرزمینِ خیال
کوئی جلو میں لئے صد بہار آیا ہے

ترے وطن کی امیدوں میں بارہا ہم نے
ہوا میں بہتی رُتوں کا فریب کھایا ہے

غموں میں ڈوبے ہوئے اک اداس سائے کو
گلی کے موڑ پہ ہم نے مدام پایا ہے

یہ کیسی راہ گذر ہے کہ پیر جلتے ہیں
اگرچہ سر پہ گھنے بادلوں کا سایہ ہے

سلمیٰ صابری

○

نہ صبا کی دوستی ہے، نہ فضا کی ہمدمی ہے
جہاں پھول کھل رہے تھے وہاں دھول اب جمی ہے

ہوئے ہم قریب لیکن ہیں نصیب اپنے اپنے
ترے لب پہ مسکراہٹ، مری آنکھ میں نمی ہے

تجھے پا لیا ہے میں نے مگر اب بھی سوچتی ہوں
مری زندگی میں شاید کسی چیز کی کمی ہے

وہ سرورِ اول اول، یہ غرورِ آخر آخر
وہ کرم بھی تھا ضروری، یہ ستم بھی لازمی ہے

مری چشمِ تر پہ سلمیٰ نہ رکھو تم اپنا دامن
یہ گھٹا برسنے والی کہیں اس طرح تھمی ہے

○

پڑھنے والوں کے خطوط

مظفر حسن ملک

پروفیسر ارشد صاحب نے آپ کے حالیہ شمارے میں میرے مضمون کے متعلق آپ کے تبصرہ پر رائے ظاہر فرمائی ہے چونکہ اس رائے کا براہِ راست تعلق آپ کے تبصرے سے ہے لہٰذا اس کے جواب کا فرض بھی آپ ہی پر عائد ہوتا ہے لیکن خدا جانے آپ کیوں طرح دے گئے ہیں۔ میں شکرگذار ہوں گا اگر آپ مندرجہ ذیل سطور کو اپنی تریبی اشاعت میں جگہ عنایت فرمائیں۔

آپ نے فرمایا تھا کہ "کسی نئے بالخصوص بدنام شاعر پر غائر نظر ڈالنا کافی مشکل کام ہے اور ملک صاحب کی یہ کوشش مستحسن ہے کہ انہوں نے عام روش سے الگ ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔"

اس پر پروفیسر کاکوی صاحب ارشاد فرماتے ہیں :۔

"ہمارے تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے نواب بٹوانے کا ایک ذریعہ ادب کو بھی بنایا ہے۔ ورایشیائی تہذیب نیز مشرقی رکھ رکھاؤ نے اُردو شاعری کو بدنام کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر ذوق اور تاریخ صحیح معنوں میں شاعر ہیں تو بتائیے اُردو میں شاعروں کی تعداد کیا ہے؟"

پروفیسر صاحب کی اس رائے سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے اصل مضمون پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ صرف آپ کے تبصرے پر ہی اکتفا کیا اور اسی سے نتائج اخذ فرمائے۔ اُردو نقد کی اس بدقسمتی کے خلاف شکایت کرتے ہوئے میں نے ناسخ والا مضمون لکھا تھا کہ جب کسی تذکرہ نگار نے کسی شاعر کو 'ناشاعر' کا خطاب دے دیا تو پھر کسی بندۂ خدا نے اس مظلوم کے دیوان کو ہاتھ لگانا مناسب نہ سمجھا۔ "آبِ حیات" کی صدائے بازگشت میں جو کتابیں تذکرہ اور تنقید کے سلسلے میں لکھی گئی ہیں ان میں یہ کیفیت بہت نمایاں ہے۔ نواب بٹوانے کا ذریعہ تو یہ ہے کہ بزرگوں کی رائے کے احترام میں "لب بند و چشم بند و گوش بند" ہو جائے نہ کہ اس کے خلاف جہاد کرے۔ طالب علم کا فرض یہ ہے کہ اصل کتاب کا مطالعہ بنظرِ غائر کرے اور خود نتائج اخذ کرے۔ ڈھلے ڈھلائے خیالات اور بنے بنائے نظریات کی متابعت امتحان پاس کرنے میں تو شاید ممد ہو سکے ذوقِ سلیم کی تسلی اس سے نہیں ہوتی۔ نیز ہماری تنقیدی روایات ابھی اس قدر پختہ نہیں کہ ان کے خلاف کچھ کہا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو ادب کے بہت سے گوشے ابھی تحقیق و تجسس کے محتاج ہیں "رکھ رکھاؤ" صرف ایشیائی تہذیب ہی نہیں مغربی تہذیب کی بھی جان ہے۔ انگریز کم آمیزی اور رکھ رکھاؤ کے لئے مشہور ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کوئی تہذیب، شاعری یا تنقید "رکھ رکھاؤ" کی وجہ سے کیوں معتوب یا مردود قرار دی جا سکتی ہے۔ اول تو یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ مشرقی شاعری بدنام ہے۔ حافظ، فردوسی اور خیام مغرب میں بھی اسی طرح مقبول ہیں جس طرح مشرق میں۔ مشرقی شاعری کے جو نقائص علمائے مغرب نے گنوائے ہیں ان سے ہمارا کوئی غزل گو شاعر مستثنیٰ نہیں۔ امرد کا

غیر فطری ذکر سب شعرا کے یہاں ہے۔ نہ غالب اس سے بچا ہے نہ میر۔ غزل میں خیال کا تسلسل سوائے چند غزلوں کے کسی شاعر کے دیوان میں کلی طور پر موجود نہیں۔ محض اس وجہ کی بنا پر ذوق اور ناسخ کو متروک نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

اس کے بعد محاورہ بندی اور آرائشِ کلام کا ذکر آتا ہے۔ اگر یہ اشیاء عروسِ معنی کے پاؤں کا بوجھل زیور نہیں تو ان کا بیان خوبی کے ضمن میں ہونا چاہیئے نہ کہ نقائص میں۔ تشبیہ اور استعارہ مافی الضمیر کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں اور یہی شاعری کی جان۔ صرف آرائش کے جرم میں کوئی کلام مردود نہیں کیا جا سکتا۔

پروفیسر کاکوی صاحب نے فرمایا ہے کہ "اگر ذوق اور ناسخ صحیح معنوں میں شاعر ہیں تو بتایئے کہ اُردو میں شاعروں کی تعداد کیا ہے؟" اصل میں یہ سوال یوں ہونا چاہیئے تھا کہ "اگر ذوق اور ناسخ صحیح معنوں میں شاعر نہیں تو پھر اُردو میں شاعروں کی تعداد کیا ہے؟ فی الواقع ان دونوں اساتذہ اور ان کے سلسلوں کے شعراء کو اُردو شعر کے سرمائے سے خارج کر کے ہمارے پاس کیا بچتا ہے؟ اس کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اور پھر جس جرم کی بنا پر انہیں جلا وطن کیا جائے گا اس کے مجرم دیگر شعراء کو بھی خارج البلد کرنا ضروری ہوگا۔

ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کا عکاس ہوتا ہے۔ ناسخ اور ذوق دونوں اپنے عہد میں بڑے اُستاد مانے جاتے رہے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں اپنے عہد کے ذوق اور سامعین کا خیال رکھتے تھے۔ وہ اپنے ماحول کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ اقبال اور فیض نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ ہمارے ماحول کی پیداوار ہیں۔ کسی شاعر کے کلام کو اس کے نظامِ شمسی کے تحت جانچنا چاہیئے۔

ہر ادب کا ارتقا بتدریج ہوتا ہے۔ ناسخ اور ذوق نے بھی اُردو ادب کے ارتقا میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ہماری زبان کے دامن کو وسیع کیا جس کے نتیجے میں ہم مختلف خیالات کی ترویج و اشاعت کے قابل ہوئے بلکہ ان کے ہاں ایسا پاکیزہ کلام بھی موجود ہے جس کا جواب آج بھی ممکن نہیں۔ ذوق کے اس شعر پر تو غالب بھی سر دُھنا کرتے تھے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

پروفیسر صاحب نے آخر میں یہ فرمایا ہے "ذوق اور ناسخ کے بارے میں اب کوئی کتنی ہی موشگافی کرے یہ مُردے اب زندہ نہیں ہونے کے"۔ پہلے تو یہ تسلیم کرنا ہی مشکل ہے کہ یہ دونوں اُستاد ادبی موت مر چکے ہیں۔ ان دونوں کا نام ابھی تک ہمارے تذکروں میں اساتذہ کی حیثیت سے آتا ہے اور دونوں کو اپنے اپنے سلسلے کا بانی کہا جاتا ہے بلکہ ناسخ کو تو ایک بہت بڑے دبستان کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جو اُردو شعری سرمائے کے پچاس فی صد حصے کا خالق ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس دبستان کا علیحدہ وجود نہ ہو، مگر یہ ممکن نہیں کہ ناسخ کے ان شعراء پر اثرات نہ ہوں جو اس دبستان میں شامل کئے جاتے ہیں۔ ابھی تک ان اساتذہ کی غزلیات ریڈیو اور عام گانے والوں سے بکثرت سُنی جاتی ہیں۔ ان کے کلام کا انتخاب درسی کتب تک میں شامل ہے۔ یہ مر کیسے گئے؟ ان کے اشعار تو ابھی تک ضرب الامثال ہیں۔ شاعر کی موت اُس وقت واقع ہوتی ہے جب اس کا کلام مر جائے جب تک کلام زندہ رہے شاعر زندہ رہتا ہے۔

اپنی ادبی روایات کو زندہ رکھنا معیوب امر نہیں بلکہ باعثِ فخر فعل ہے۔ نا معلوم پروفیسر صاحب کو یہ امر کیوں ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ ناسخ کے عمدہ کلام کا انتخاب میرے مضمون میں آگیا تھا۔ ذوق کے بعض مشہور اور مقبول اشعار کا انتخاب پیش ہے۔

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

آیا ہے دمِ آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

اس رخِ تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا

وقتِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

مہ جبیں یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

بجا کہے جسے عالم اسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیِ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گراں باریِ اولاد غضب ہے

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہوں گے اس بساط میں ہم سے بھی بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے، ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ، جو ہونا ہے، وہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

یہ اشعار وہ ہیں جو زبان زدِ عام ہیں اور ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی شاعر کی زندگی کا سب سے بڑا ثبوت اس کے کلام کی مقبولیت ہے۔ میں پھر نصیر صاحب کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ان اساتذہ کے کلیات کا از سرِ نو بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں اور اپنے لئے خود رائے قائم کریں یہ ضروری نہیں کہ مروجہ آراء غیر جانبدار اور درست ہوں۔

اختر لکھنوی

امریکی کتابوں کی اشاعت سے متعلق آپ نے جس نکتہ کو گرفت کیا ہے وہ بلاشبہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ ان کتابوں کی اشاعت سے جہاں ناشرین متاثر ہوتے ہیں وہیں ترجمہ کرنے والے ادیب اور پڑھنے والے عام قارئین بھی غلط روش کا شکار ہو گئے ہیں۔ امریکی کتابوں کی اشاعت پاکستان میں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہو رہی ہے۔ اس غیر ملکی اسکیم نے ہمارے ادب کی رفتار کو غیر معمولی طور پر سُست روکر دیا ہے۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ کتابیں ایک طرح سے غیر قانونی ہیں۔ ان کتابوں کی اشاعت صدرِ پاکستان کے اس آرڈی نینس کو متاثر کرتی ہے جس میں غیر ملکی ذرائع سے حاصل کئے ہوئے سرمایہ سے کسی قسم کی اشاعت کو منع کیا گیا ہے۔ توقع ہے حکومت اس طرف جلد توجہ دے گی۔ اس آواز میں آپ اپنے کو تنہا نہ سمجھئے "فنکار"[1] بھی آپ کا ہم نوا ہے۔

سلیم طاہر

جولائی اور اگست کے شماروں میں "اردو ادب میں امریکی مطبوعات کے تراجم" کے سلسلے میں آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ نہایت اہم اور سنجیدہ غور و فکر کے حامل ہیں۔۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہمارے ہاں تخلیقی ادب زد بہ انحطاط رہا ہے۔ اور ہمارے بیشتر لکھنے والے اپنی اقتصادی مجبوریوں کے پیشِ نظر حالات کا شکار رہے ہیں۔ مگر ہمارے ادب نے کبھی بھی کسی "پنجسالہ منصوبے" کی شکل اختیار نہیں کی کہ اسے "امریکی امداد" سے تکمیل کے مراحل تک پہنچانے کی ضرورت پیش آئی ہو۔ ادب میں "امریکی امداد" کا یہ منصوبہ خاصا فکر انگیز ہے۔ باقی رہا اردو میں غیر ملکی مطبوعات کے تراجم کا مسئلہ تو بقول پروفیسر یوسف جمال انصاری "اس زمانے میں تو ہر جواہر پارہ ساری انسانیت کی میراث ہے۔ آخر غریب اردو کو دوسری زبانوں کے علمی خزانوں سے کیوں محروم رکھا جائے" یہ ضروری تو قرار نہیں پاتا کہ دوسروں کی ادبی میراث اور علمی خزانوں سے اپنا "تہی دامن" بھرنے کے بعد اس پر "اردو کی ادبیاتِ عالیہ" کا لیبل لگا کر نو آموز ادیبوں کے لئے "میراثی ادب" کی تخلیق کا راستہ کھول دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے ملکی ادبی تقاضوں سے بے نیاز ہو کر امریکی ڈالری ادب کی تشکیل میں ہمہ تن مصروف ہونے کے بعد اپنے لئے سرمایہ اور ملک کے لئے غیر ملکی "سرمایۂ ادب" مہیا کرتے رہیں۔

غیر ملکی ادب، غیر ملکی ادب ہی ہوتا ہے۔ ملکی زبان میں ترجمہ ہو کر وہ اپنا غیر ملکی ماحول نہیں بدل پاتا۔ نہ تو وہ ہمارا اپنا ادب کہلا سکتا ہے اور نہ ہی وہ ہمارے ادبی تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ ہمیں اپنے قومی شعور کی پختگی کے لئے پاکستانی ادب کی ضرورت ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارے بزرگ اہلِ قلم اگر اپنی ذہنی کاوشوں کو پاکستانی ادب کی تخلیق پر صرف کریں تو شاید وہ اپنی ذات کے لئے بہت زیادہ سرمایہ اکٹھا نہ کر سکیں۔ مگر اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے یہ اہلِ علم ادب کا کتنا بڑا سرمایہ چھوڑ جائیں گے۔ کہ اس حقیقت سے انحراف شاید ان کا اپنا ذہن بھی قبول نہ کرے۔ اور بقول آپ کے:۔

"اگر کوئی غیر ملکی ادارہ اپنے مخصوص ملکی نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنے وسائل بروئے کار لاتا ہے تو ہمیں بھی لازماً سوچنا چاہیئے کہ آخر ہماری بھی کچھ ملکی مصلحتیں ہیں۔ ہم پر بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اور

[1] ماہنامہ فنکار ڈھاکہ کا

ہمارے ساتھ بھی کچھ فرائض وابستہ ہیں۔ ہم اقتصادی مصلحتوں کی خاطر، انہیں مجروح ہونے دیں گے تو ہمارا یہ رویّہ ایک باغیرت اور باوقار قوم کا رویّہ نہیں ہوگا۔ اور ایک فرض شناس قوم کا شعور اسے کبھی مستحسن قرار نہیں دیگا۔"

کاش ہمارے لکھنے والے اور ناشر حضرات غیر ملکی مطبوعات کے تراجم سے فرصت کے چند لمحات نکال کر اپنے ادب کی تہی دامنی پر ایک نگاہِ غلط انداز ہی ڈال لیں تو شاید انہیں اپنی اس شعوری لغزش کا احساس ہو سکے۔

یونس جاوید کا "رات کی اونچی فصیل" جہاں موضوع اور فن کے لحاظ سے ایک مکمل افسانہ ہے وہاں افسانے کا انجام نیکی اور انسانی خدمت کی ارفع قدروں کی اس شدت سے نفی کرتا ہے کہ انسانی ذہن اگر اس بھرپور تاثر کو قبول کر لے تو اس بھری پُری دنیا میں سسکتی بلکتی انسانیت ہزاروں لاکھوں مسیحا نفسوں سے یکسر محروم ہو جائے۔ ہمارے جیسے ابھرتے معاشرے میں ایسا منفی رجحان کسی صورت مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حصۂ نظم حسبِ معمول ہے۔ البتہ راجہ حمدی علی خاں اس دفعہ پھر خاصے سمٹے ہوئے ہیں۔"
شاذ تمکنت اور رشیدہ سلیم سیمیں حصہ غزل میں خاصے نمایاں ہیں۔

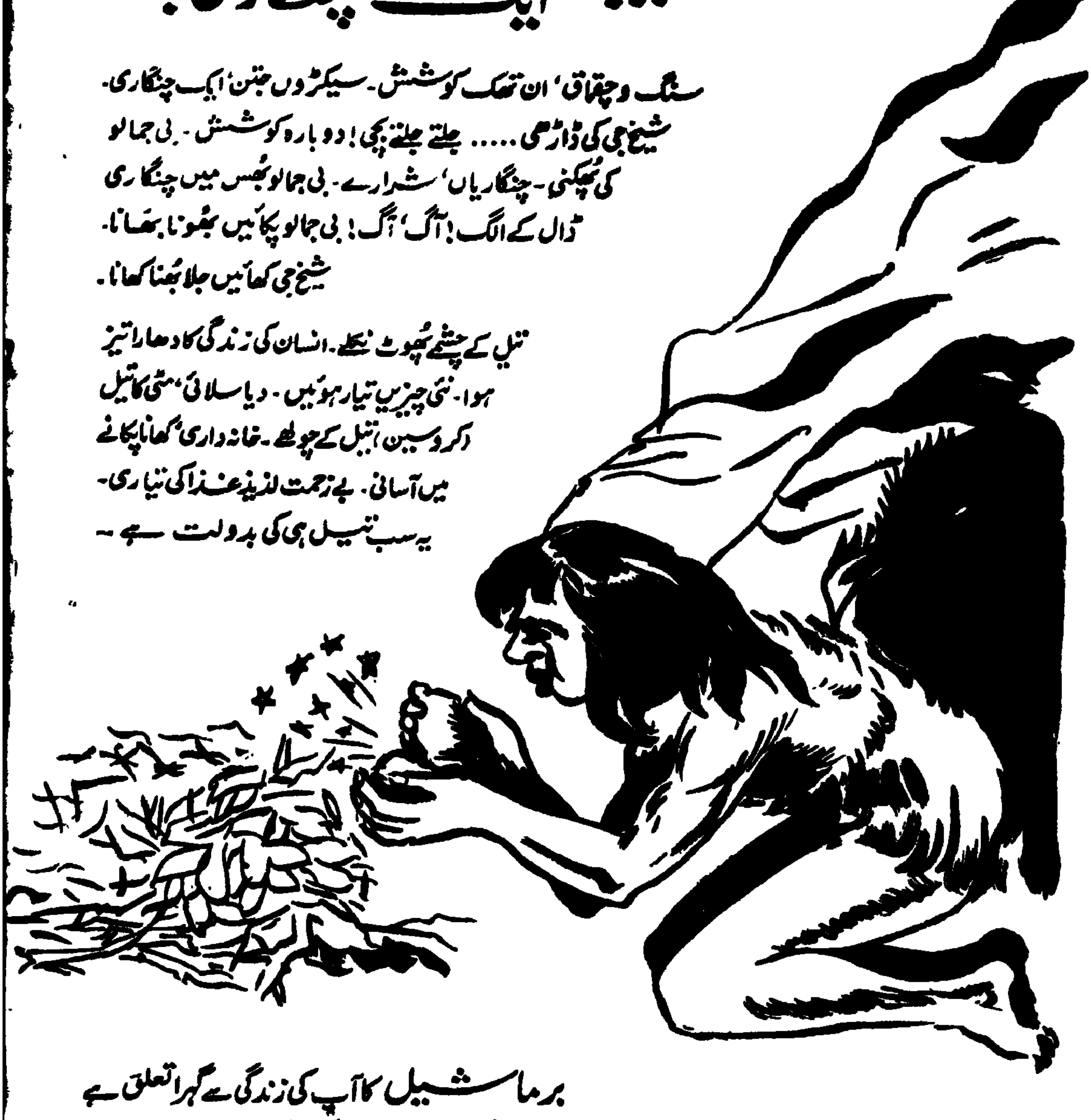
سمیع اللہ قریشی

تازہ شمارے میں جلیل حشمی کی نظم "ابنِ مریم" میں نہ صرف داخلی کیفیتوں کی خوبصورت اور انتہائی ہے بلکہ خارجی تجربوں سے ان کا خوشگوار اتصال بھی قابلِ صد تعریف ہے۔ ہمارے ہاں دقّت یہ ہے کہ شاعر خود اپنے جذبوں سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوتا۔ ابلاغ کی منزل تو خیر بہت آگے ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ اسے ابہام قرار دے کر شعر کی خوبصورتی تصور کر لیا جاتا ہے۔ جلیل حشمی اپنی اس نظم میں اپنے سابقہ جملہ شعری تجربات سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ اس نظم میں بلا شبہ بڑی کلاسیکیت ہے۔ اس سال کی زندہ اور جاندار نظموں میں سے بلاشبہ "ابنِ مریم" بھی ہو سکتی ہے۔

○


اس میں
جیت ہی جیت
ہے
پوسٹ آفس نے اب ایک نئی پالیسی رائج کی ہے،
جس کے لئے طبی معائنہ کی شرط نہیں،
اس نئی پالیسی کے تحت آپ
پانچ ہزار روپے تک کا بیمہ
کرا سکتے ہیں۔
زندگی کا بیمہ کوئی جوا نہیں بلکہ اس میں آپ کیلئے یقینی فائدے ہیں
آپ جو رقم بیمہ کی قسطوں میں دیتے ہیں وہ سب کی سب مع منافع آپکو
یقینی طور پر واپس مل جاتی ہے آپ کے اہل و عیال کے مستقبل کا تحفظ ایک
علیحدہ فائدہ ہے جو آپ حاصل کر سکتے ہیں۔
تفصیلات کیلئے کسی ڈاک خانے سے رجوع کیجئے
پوسٹل
لائف
انشورنس
قسطیں کم۔ منافع زیادہ
DFP 790

سیکڑوں جتن،
... ایک چنگاری!



سنگ وچقماق، ان تھک کوشش۔ سیکڑوں جتن، ایک چنگاری۔
شیخ جی کی ڈاڑھی ..... جلتے جلتے بچی! دوبارہ کوشش۔ بی جمالو
کی پھکنی۔ چنگاریاں، شرارے۔ بی جمالو بھس میں چنگاری
ڈال کے الگ! آگ، آگ! بی جمالو پکائیں بھونا بھنانا۔
شیخ جی کھائیں جلا بھنا کھانا۔

تیل کے چشمے پھوٹ نکلے۔ انسان کی زندگی کا دھارا تیز
ہوا۔ نئی چیزیں تیار ہوئیں۔ دیاسلائی، مٹی کا تیل
(کروسین)، تیل کے چولھے۔ خانہ داری، کھانا پکانے
میں آسانی۔ بے زحمت لذیذ غذا کی تیاری۔
یہ سب تیل ہی کی بدولت ہے۔

برماشیل کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے

برما شیل آئل سٹوریج اینڈ ڈسٹری بیوٹنگ کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ
(انگلستان میں قائم شدہ)
کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود